حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جلد — ۹

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۳۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو پاکیزگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب ؒ

بانی و مدیر دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب ؒ

اساسی عبادات

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ،بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

بنیادی عبادات...... بزرگانِ محترم! اسلام میں بنیادی طور پر عبادتیں، دو ہی ہیں۔ جن پر پورے اسلام کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، ایک نماز، دوسرے حج۔ وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی لامحدود صفاتِ کمال کو اگر اصول طور پر سمیٹا جائے تو وہ دو ہی نوعوں میں کھنچی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک صفاتِ جمال اور دوسرے صفاتِ جلال۔

منشاءِ عبادات...... صفاتِ جمال مہر ولطف کی صفات ہیں جیسے رحمت ورافت، عفو وکرم، حلم وصبر، خلاقی ورزاقی، نگہداشت وحفاظت، راہنمائی وہدایت، ستاری ومغفرت، جود وعطاء، انعام واحسان، نصرت واعانت وغیرہ اور صفاتِ جلال قہری صفتیں ہیں جیسے قہر وغضب، جبر وتشدد، مواخذہ وانتقام، غلبہ واستیلاء، عزت وجبروت، مالکیت وملکیت، حکومت حاکمیت، سلب ومنع وغیرہ۔ قرآنِ حکیم نے حق تعالیٰ کی ان دونوں شانوں کی طرف جن کے نیچے یہ دونوعیں آئی ہوئی ہیں، ان جامع اور معجزانہ الفاظ میں ارشارہ فرمایا ہے ﴿تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ﴾ ① جلال کے نیچے قہری صفتیں آجاتی ہیں اور اکرام کے نیچے مہری صفات رہتی ہیں۔ ایک جگہ صراحت کے ساتھ ان دونوں شانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔ ﴿نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِیْ ھُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ﴾ ②

ایک جگہ فرمایا ﴿غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ﴾ ③

ایک جگہ صفاتِ جمال کے افعال بیان فرمائے گئے کہ ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ

① پارہ: ۲۷، سورۃ الرحمن، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۴۹، ۵۰۔

③ پارہ: ۲۴، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۳۔

جَمِیْعًا﴾ ① اور اس کے آگے صفت جلال کے اثر کا تذکرہ فرمایا گیا کہ ﴿وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾ ② اسی طرح ایک موقع پر صفت مہر کے تحت امیدیں باندھتے رہنے کا حکم دیا اور مایوسی ختم فرمادی کہ ﴿اِنَّهٗ لَا یَیْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ③ ''بلاشبہ کفار ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں''۔ اور صفات قہر کے تحت بے خوف ہوجانے سے روکا گیا کہ ﴿فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ④ ''اور (آدمی) مطمئن نہ ہو بیٹھے اللہ کی مخفی تدبیر سے''۔

منشاء جلال و جمال۔ ایک جگہ صفات جلال اور صفات جمال دونوں کے منشاء پر مطلع فرمایا گیا کہ صفات قہر کے ظہور کا منشاء جرائم ہیں اور صفات مہر کے نزول کا منشاء ایمان ہے۔ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ ⑤ ایک جگہ اولا شان رحمت کے تحت افعال خیر پر انعام کا ذکر فرمایا گیا اور آگے اسی کے ساتھ شان غضب کے تحت شر پر سزا و انتقام کا ذکر کیا گیا ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا﴾

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ﴾ ⑥ بہرحال صفات کمال کی یہی دو بنیادی نوعیں ہیں جن کے نیچے تمام صفات ربانی آئی ہوئی ہیں۔ جلال و جمال اور مہر و قہر، صفات جمال کا سرچشمہ رحمت ہے۔ اور صفات جلال کا سرمنشاء غضب ہے۔ اسی لئے اس کی ذات بابرکات رحمٰن بھی ہے اور غضبان بھی۔ رحمت کی شان سے کرم فرماتا ہے۔ اور غضب کی شان سے تنبیہ و مواخذہ۔ ظاہر ہے کہ بندوں کو دونوں ہی کی ضرورت ہے کیونکہ مخلوق خیر و شر کے دو مادوں سے مرکب ہے، بندہ کی خیر رحمت خداوندی کو جذب کرتی ہے اور اس کا شر غضب الٰہی کو اور سب جانتے ہیں کہ ان دونوں نوعوں کے جمع ہوئے بغیر ربوبیت اور پرورش کا کارخانہ نہیں چل سکتا۔ ماں ایک طرف بچے کو پیار بھی کرتی ہے اور دوسری طرف اسے گھور کر طمانچے بھی مارتی ہے کیونکہ نرم اور گرم دونوں کے جمع کرنے سے ہی تربیت ہوتی ہے۔ ﴿بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ یُنْفِقُ كَیْفَ یَشَآءُ﴾ ⑦ ''(اس کے دونوں ہاتھ، مہر کے بھی اور قہر کے بھی) کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہے صرف فرمائے''۔

جلال و جمال کے آثار و لوازم...... یہ دونوں شانیں چونکہ ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اس لئے ان کے آثار و لوازم اور تقاضوں میں بھی یہی تقابل اور تضاد کی شان پائی جاتی ہے صفات جمال یعنی مہر و لطف کا قدرتی اثر انس و محبت اور گرویدگی و شیفتگی ہے کہ بندہ رام ہوجائے جھک جائے اور الفت میں سرشار ہوجائے محو ہو مٹا ہوا ہو، نہ اپنا ارادہ ہو نہ خواہش، نہ اپنی خبر نہ اپنے نام کے ہوؤں کی پرواہ سوختہ جانی ہو اور سوختہ روانی۔ ربودگی میں نہ اپنا باہر کا ہوش ہو اور نہ اندر کا جوش۔ مطمع نظر اور مقصد دل ہر وقت محبوب ہو اور اس کی ادائیں، اس کی طرف دوڑنا اور

---

① پارہ: ۲۴ سورۃ الزمر، الآیۃ: ۵۳۔ ② پارہ: ۲۴ سورۃ الزمر، الآیۃ: ۵۴۔ ③ پارہ: ۱۳ سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۷۔
④ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۹۹۔ ⑤ پارہ: ۲۱ سورۃ الروم، الآیۃ: ۴۷۔
⑥ پارہ: ۲۰ سورۃ النمل، الآیۃ: ۸۹، ۹۰۔ ⑦ پارہ: ۶ سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۶۴۔

اسی کی طرف بھاگنا، سوتے جاگتے اس کا دھیان اور اس کے تصور میں محویت و سرشاری ہو۔ کہ صفات جمال کا یہی قدرتی تقاضا ہے اور صفات جلال یعنی قہر و غضب کا قدرتی اثر رعب و ہیبت، فکر و مغلوبیت، سرنگونی اور سرافگنی ہے کہ بندہ خوفزدہ اور لرزاں و ترساں رہے، گردن جھکی ہوئی ہو، ناک نیچی ہو اور دربار شاہی (مسجد) میں حاضر ہو تو نگاہ اعضاء کا ادب پیش نظر ہو، زبان خاموش ہو، چال میں سکون و مسکنت ہو، چہرے سے خوف و خشیت نمایاں ہو، ادب سے دایاں قدم پہلے ہو اور بایاں پیچھے، قیام دست بستہ ہو، ہاتھ بندھے ہوئے ہوں، نشست ہو تو دوزانو ہو، کھڑا ہونا اور چلنا ہو تو سکون و تواضع سے ہو، نہ دوڑنا، بھاگنا، لپکنا، نہ تحرکن، سکینت و متانت میں ہمہ وقت غرق اور جوش کے ساتھ ہوش میں ہو، ہر آن محو و مستغرق، غرض ہر نقل و حرکت اور ہیبت و وضع میں ادب و خاکساری، ذلت و انکساری اور عجز و نیازمندی رچی ہوئی ہو۔

خلاصہ یہ کہ صفات قہر جلال چاہتی ہیں کہ اللہ کے بندے اس کے سامنے خوف و خشیت اور مرعوبیت کے ساتھ نیازمندانہ حاضر ہوں جن کے رونگیں رونگیں سے بندگی و مسکنت غلامی و محکومی اور تمام ضوابط حکومت کی عاقلانہ پابندی ٹپکتی ہو اور صفات مہر و جمال چاہتی ہیں کہ خدا کے بندے اس کے سامنے انس و محبت، فنائیت و محویت اور استغراق و استہلاک کے ساتھ حاضر ہوں، جن کی ہر ایک نقل و حرکت سے ربودگی، خودگزاری از خود رفتگی، ذوق و شوق اور تسلیم و رضا، عاشقانہ انداز سے نمایاں ہو، پہلی صورت مہذب اور باادب محکوم کی ہے۔ دوسری صورت ایک از خود رفتہ اور از خود گزشتہ عاشق کی ہے یعنی ایک شان کے نیچے آدمی عاشق ناپسند ہوتا ہے۔ ایک کے نیچے عاقل فکر مند اس لئے اللہ کی ان دونوں صفات (جلال و جمال) کے تقاضوں سے انسان پر دو ہی قسم کی عبادتیں فرض ہوئیں۔ صفات جلال کے تحت اظہار عجز و نیاز اور مظاہرہ ذلت و مسکنت کی عبادت رکھی گئی جس کی صورت نماز ہے۔ اور صفات جمال کے تحت اظہار عشق و محبت اور مظاہرہ محویت و فنائیت کی عبادت فرض ہوئی جس کی صورت حج ہے۔

نماز شان کبریائی کا مظہر...... چنانچہ نماز کے ایک ایک عمل سے اپنی ہی فدویت و عبدیت، لجاجت و سماجت اور مرعوبیت و ہیبت زدگی نمایاں کی جاتی ہے جس میں فکر و عقل کے ساتھ ادب و شائستگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ ابتداء نماز ہی سے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دنیا و مافیہا سے بیزار ہونا اور اس کے ساتھ اپنے حاکم مطلق اور بادشاہ عالمین کی بڑائی کا اعلان کرنا ہے جس کا نام تکبیر تحریمہ ہے۔ پھر چاکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا جس کا نام قیام ہے۔ پھر ذلیلوں کی طرح سر کو جھکا دینا جس کا نام رکوع ہے پھر انتہائی پستی کے ساتھ ہاتھ، ناک اور پیشانی زمین پر ٹیک دینا جس کا نام سجدہ ہے۔

پھر انتہاء ادب و تعظیم کے ساتھ اس کی یکتائی کی شہادت دینا جس کا نام تشہد ہے۔ پھر انتہائی بے بسی اور محتاجگی کے ساتھ اسے پکارنا جس کا نام استغاثہ و فریاد ہے۔ پھر کمال ضعف و بے زوری اور انتہائی خوشامد کے ساتھ بھیک مانگنا جس کا نام دعا ہے پھر انتہائی تعلق و نیازمندی کے ساتھ اس کے نائبوں اور خلفاء (انبیاء و اولیاء) تک پر

صلوٰۃ وسلام بھیجنا جس کا نام درود اور صلوٰۃ وسلام ہے۔ پھر انتہائی عقیدت و نیاز سے حاضرین دربار (شرکاء جماعت اور ملائکہ) کو دوطرفہ سلام دے کر رخصت ہونا، جس کا نام تحمیل وتسلیم ہے وغیرہ وغیرہ، وہ عاجزانہ اور محکومانہ افعال ہیں جو بلحاظ حقیقت اللہ کی صفت حکومت ومالکیت اور حاکمیت وبادشاہت کا طبعی تقاضا ہیں۔ پس نماز اس کی شان کبریائی۔ اور شان جلال وحکمرانی کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور بندہ میں خوف وخشیت کی تخم ریزی کرتی ہے جس سے وہ قانون الٰہی کی نافرمانی اور فواحش ومنکرات سے بچ کر مقرب بارگاہ بن جاتا ہے۔

حج' ذاتی محبوبیت کا مظہر...... ادھر حج کے ایک ایک رکن اور ایک ایک سنت وواجب سے عاشقی، محبت وانس اور محبوب پر مرمٹنے کا والہانہ اور شیدایانہ انداز سے ثبوت دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حج میں مشغول انسان کی عاشقانہ کیفیات اور ازخودرفتگی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے تن من دھن کی کچھ پروانہیں رہتی نہ کپڑوں کی خبر، نہ آرائش وزیبائش کی پروانہ وضعدار لباس نہ قطع وبرید کی بوباس بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے لبیں پھیلی ہوئیں۔ رواں چکٹا ہوا، ننگے سر، ننگے پاؤں، کپڑے گرد آلود، بدن پر میل کچیل کی نمود، در محبوب پر سر بسجود، گھر سے بے گھر، تارک مال وزر نہ کھانے کی پروا، نہ پینے کی خبر، دل پر لذت نکاح کا اثر نہ تن پر آثار دولت وزر، نہ صفائی وستھرائی سے سروکار، نہ عطر وخوشبو کا روادار، نہ غسل کا دھیان نہ نظافت کا وہم وگمان، آثار محبت سے وارفتہ، گریہ وبکا سے سوختہ۔ رکی وقار سے دل گرفتہ، خانہ محبوب کے تصور میں ازخودرفتہ، حضوری ہوتو حاضر حاضر کہہ کر چلانا، غیبت ہوتو دم بخود ہو جانا اور محبوب سامنے آئے تو لپکنا، خانہ محبوب کے اردگرد چکر لگانا، درودیوار کو چھونا، پردہ ہائے دیوار سے لپٹنا اور رونا کہیں شوق میں لپکنا، کہیں خوف سے تھمنا، کہیں ذوق سے دوڑنا کہیں رعب جمال سے رکنا، خدام محبوب نمایاں ہوں تو نعرہ مستانہ کے ساتھ سر جھکا دینا اور دشمنان محبوب کا تصور آئے تو اکڑنا اور سینہ تان لینا، تجلی محبوب نمایاں ہو تو سرنگوں ہو جانا اور دشمن محبوب (شیطان) کا مقام سامنے آجائے تو کنکر پتھر لے کر لپکنا اور مارنا، ہر لذت ہر زینت اور ہر کی صورت سے بیزار رہنا، کسی ایک جگہ قرار نہ پکڑنا، کوچہ ہائے محبوب کے در در کی خاک چھاننا، کبھی مکہ تو کبھی منیٰ، کبھی عرفات، کبھی مزدلفہ نہ چال میں سکون، نہ انداز میں قرار کبھی یہاں اور کبھی وہاں۔ اپنے کو مٹا دینے کا جذبہ اور تن من دھن کو خاک میں ملا دینے کا داعیہ اور آخر فدائیت وجاں سپاری کی انتہا پر اپنے نفس کو بھی باذن محبوب فدیہ حیوان دے کر فدا کر دینا ذرا بھی کوتاہی ہو تو مال وزر دے کر خوشامد سے تلافی کرنا، وسیلہ محبوب کا دھیان آئے جس کی بدولت رسائی ممکن ہوتو سو جان سے وہاں حاضر ہونا سلام کرنا، لجاجت اور شوق وذوق سے عرض ومعروض کر کے وسیلہ لینا وغیرہ وہ عاشقانہ افعال ہیں جو عشق ومحبت کے جذبہ میں فطرتاً عاشق سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی صفات جمال اور ذاتی محبوبیت کا مقتضا ہیں۔

حسنِ تعبیر...... ان میں سے ترک آسائش وآرائش اور ترک لذت وزیبائش کے مجموعہ کا نام احرام ہے خانہ محبوب کے اردگرد گھومنے کا نام طواف ہے۔ تصور اعداء کے موقعہ پر سینہ تان کر اکڑنے کا نام رمل ہے۔ ذوق وشوق میں

دوڑنے کا نام سعی ہے کوچہ ہائے محبوب کے ذروں کی خاک چھاننے کے نام سیاحت حج ہے۔ خاک صحن پر ٹھہر کر گریہ و بکاء کرنے اور شوق وصال کے اظہار کا نام وقوف ہے۔ شیطان پر پتھر برسانے کا نام رمی ہے۔ اور فدیہ حیوان کے ذریعہ خود فدا ہو جانے کا نام نحر ہے ان میں سے کسی بھی عاشقانہ فعل میں فروگزاشت کا نام جنایت ہے۔ اور اس کے تدارک و تلافی کا نام صدقہ و کفارہ ہے۔ اور پھر افعال کے مجموعہ کا نام مناسک ہے۔ اور پھر وسیلہ محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار (مدینہ) میں حاضر ہو کر زیارت کرنے اور صلوٰۃ و سلام کے بعد ہزار خوشامد سے وسیلہ لینے کا نام زیارت و توسل ہے۔

عجز و عشق کے مظاہر...... بہر حال پہلا مظاہرہ عجز و نیاز کا ہے جس کی صورت نماز ہے۔ اور دوسرا مظاہرہ عشق و محبت کا ہے جس کی صورت حج ہے۔ اس لئے یہ دو ہی عبادتیں اسلام کی اساس و بنیاد بنائی گئی ہیں۔ جب کہ تمام صفات خداوندی بھی دو نوعوں (جلال و جمال) میں بٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ کے حقوق کے ادائیگی انہی دو نوع صفات کے حقوق ادا کرنے سے ممکن تھی جن کی تشکیل کے لئے نماز اور حج کے افعال رکھے گئے۔ اس لئے اصولاً اسلام میں یہ دو ہی عبادتیں اصل ٹھہرتی ہیں کہ بلحاظ حقیقت ان کے سوا کوئی دوسری صورت عبادت کی ہے بھی نہیں کہ عبادت کی متقاضی صفات کی نوعیں ہی یہ دو ہیں دو سے زائد نہیں۔

زکوٰۃ و روزہ کی حیثیت...... رہ گئی زکوٰۃ اور روزہ کہ عبادت انہیں بھی کہا گیا، بلکہ نماز و حج کی طرح مبانی اسلام میں شمار کرایا گیا ہے، سو بلاشبہ وہ عبادت ہیں اور اسلام کی اساسی ہی عبادت ہیں لیکن پھر بھی ان کے اور نماز حج کے عبادات ہونے کی نوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہے غور کیا جائے تو زکوٰۃ اور روزہ خود اپنی ذات سے نہ عبادت ہے نہ اپنی ذات سے براہ راست مطلوب ہیں بلکہ نماز و حج کی خاطر مطلوب اور انہی کی بدولت عبادت بنی ہیں زکوٰۃ تو نماز کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت بنتی ہے اور روزہ حج کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت ہوتا ہے بالفاظ دیگر زکوٰۃ نماز کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور روزہ حج کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور وسیلہ چونکہ حکم میں مقصود ہی کے ہوتا ہے اس لئے یہ دونوں بھی نماز و حج کی وجہ سے عبادت بنادی گئیں خود اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔

موانع نماز اور ان کا تدارک...... وجہ یہ ہے کہ نماز جیسی اہم عبادت میں اگر کوئی چیز حارج اور سدراہ ہے تو وہ سامان عیش اور وسائل عشرت ہیں جن کی لذتوں میں پڑ کر انسان میں نماز سے غفلت اور سستی و کسل پیدا ہوتا ہے اور آدمی جماعت سے ہی نہیں بلکہ نماز ہی سے بیگانہ ہو جاتا ہے کیونکہ نفس کی توجہ ایک آن میں دو طرف نہیں ہو سکتی ظاہر ہے کہ نفس کے مرغوبات جب نفس کو اپنی طرف کھینچ لیں گے تو مرغوب روحانی کی طرف کیسے متوجہ ہو سکے گا؟ اس لئے اکثر و بیشتر امراء ہی نماز سے غافل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اردگرد جب اسباب عیش و نشاط اور لذات نفس کا ہجوم رہتا ہے تو ان کے نفس کو طبعاً مسجد کی طرف دوڑنے کی فرصت ہی نہیں مل سکتی کہ نماز کی طرف رخ کریں،

البتہ غربا قلیل العیش اور محروم الوسائل ہوتے ہیں اس لئے عموماً وہ تعیش سے فارغ رہتے ہیں تو ان کا فارغ نفس بھی بے تکلف نماز کی طرف دوڑ سکتا ہے۔

امراء نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے — زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

اس لئے شریعت نے مال وزر اور وسائل عیش وعشرت میں (جن میں لگ کر آدمی نماز اور مسجد سے غافل ہوتا ہے) توازن اور اعتدال پیدا کرنے اور انہیں کم کرنے اور دلوں سے ان کی محبت وشغف نکال دینے کے لئے زکوٰۃ و صدقات کی عبادت رکھی تاکہ مال دولت کو راہ خدا میں خرچ کرنے اور لٹانے کے علاقے سے انسانی نفس میں سے زر پرستی اور اس سے پیدا شدہ تعیش پسندی کے غیر معتدل جذبات نکل جائیں اور مال لٹانے کی سالانہ عبادت، پھر روز مرہ کے صدقات کی خوبیاں سے خود نفس کو بھی راہ خدا اور راہ عبادت میں لٹا دینے کے جذبات پیدا ہو جائیں۔

پھر چونکہ وسائل عیش کا تعلق صرف نقد وزر ہی سے نہیں بلکہ زمینی پیداوار اور پالتو جانور، سواریوں کے حیوانات، زرتار لباسوں، زریں برتنوں حتی کہ ہر تجارتی سامان سے ہے اس لئے شریعت نے زکوٰۃ کا دائرہ بھی صرف نقود سونا، چاندی اور دولت زر تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تمام وسائل عیش میں اپنی اپنی شرائط وحدود کے ساتھ زکوٰۃ رکھی، چنانچہ پالتو جانور، گھوڑے، اونٹ، گائے بھینس، بکری وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی۔ کھیتوں کی پیداوار وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی جس کا نام عشر ہے معدنیات اور کانوں میں زکوٰۃ رکھی دفینہ اور ہاتھ آجانے والے خزانہ میں بھی زکوٰۃ رکھی جسکا نام خمس ہے، پھر ہر ایک مال تجارت پر زکوٰۃ رکھی خواہ وہ مٹی ہی کیوں نہ ہو۔ جس سے زر ومال بڑھنے اور اس کے بڑھنے سے وسائل عیش اور سامان راحت بڑھنے کا قدرتی تعلق ہے اور وہی تعلق نفس کو عیش پرستی میں مبتلا کر کے عبادت سے غافل اور بے تعلق بنا دیتا ہے، ظاہر ہے کہ جب رکاوٹ کے اسباب ہٹ جاتے ہیں تو شے وجود پذیر ہو جاتی ہے۔ پس جب راہ عبادت کا حارج یعنی زر ومال اور وسائل عیش وعشرت کو بصورت زکوٰۃ و صدقات راہ خدا میں لٹا دینے کی عادت پڑ گئی اور دل میں ان کی رغبت میں شدت اور ہوس قائم نہ رہی تو نماز سے رکاوٹ ڈالنے والے اسباب ختم ہو گئے، اس لئے نماز آسان ہو گئی پس زکوٰۃ وصدقات درحقیقت نماز کو بروئے کار لانے کے لئے فرض کی گئی ہے، اس لیے وہ وسائل نماز میں سے ہوئی جو آدمی کو کھینچ تان کر نماز تک پہنچا دیتی ہیں اس لئے عبادت کی لائن میں نماز اصل ہوئی اور زکوٰۃ اس کے تابع ہو کر عبادت بنی جب کہ وسیلہ مقصود حکم میں مقصود ہی کے ہوتا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ زکوٰۃ مبادی نماز میں ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جگہ جگہ زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ: وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ. اس انداز کی بکثرت آیتیں اس کی شاہد عدل ہیں۔

نماز کی تمہید...... یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کے پاس مال وزر نہ ہو اور وہ خود ہی نان شبینہ کا محتاج ہو تو اس پر زکوٰۃ کی فرضیت ہی نہیں حالانکہ نماز بدستور فرض رہتی ہے کیونکہ بجز وہ تکلیف مالا یطاق کے یہاں زکوٰۃ کی ضرورت بھی نہیں

کیونکہ زکوٰۃ نماز کے موانع رفع کرنے کے لئے رکھی تھی، جب یہاں موانع صلوٰۃ ہی نہیں تو رفع موانع (زکوٰۃ) کی حاجت ہی کیا ہوسکتی ہے؟ چنانچہ اس قسم کے غریب مسکین انسان عام حالات میں نماز سے بھی بیگانہ نہیں ہوتے کیونکہ جب وسائل عیش ہی مفقود ہیں جو عبادت اور بالخصوص نماز میں حارج ہوتے تھے تو ایک بے زر اور بے پر آدمی طبعی طور پر خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور نماز میں کبھی سست نہیں ہوتا اسی لئے مسلم کو عام حالات میں زہد و قناعت کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ وہ جس قدر قلیل العیش ہوگا، اسی قدر طاعت وعبادت کی طرف رخ کئے ہوئے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی اسے زکوٰۃ سے بیگانہ بنانے کے ہوئے، اگر زکوٰۃ بذاتہٖ مقصود ہوتی تو بجائے زہد وقناعت کے تمول اور تکاثر مال کی ترغیب دی جاتی بہر حال دولت ہو تو اس پر اندرون حدود زکوٰۃ وصدقات کے احکام عائد ہو کر اسے قلیل العیش بنا دیتے ہیں اور نہ ہو تو اس پر احکام زکوٰۃ وصدقات اس لیے لاگو نہیں ہوتے وہ پہلے ہی قلیل العیش ہے۔ اس لئے ان دونوں ہی صورتوں میں آدمی اپنے مقصد تخلیق (عبادت) کی طرف توجہ کئے ہوتا ہے جس سے واضح ہے کہ دولت و مال چونکہ راہ عبادت میں حارج ہوتا ہے اور اس کے نہ ہونے یا کم ہونے کی صورت میں کارخانہ عبادت میں خلل نہیں پڑتا۔

اس لئے زہد وقناعت اور مال کو لٹانے یا گھٹانے کی ترغیبیں دی گئیں جس سے زکوٰۃ کا وسیلۂ عبادت اور بالخصوص وسیلۂ نماز ہونا نمایاں ہے۔ اور ثابت ہو جاتا کہ حقیقی عبادت اگر ہے تو وہ نماز ہی ہے جس کے بغیر تعلق مع اللہ پیدا نہیں ہوسکتا اور زکوٰۃ اس کا وسیلہ اور اسے بروئے کار لانے کی ایک تمہید ہے خود اصل نہیں۔

موانع حج اور ان کا تدارک ...... ادھر حج کی عاشقانہ عبادت چونکہ مظاہر محبت ہے اور محبت میں سب سے پہلی چیز ماسوا اور غیر محبوب کا ترک ہے ورنہ اگر عاشق غیر محبوب کی طرف مائل ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ محبوب کی طرف اس کا میلان یا سرے سے ہے ہی نہیں یا ہے تو کمزور ہے تو اسے عاشق ہی کیوں کہیں گے۔

پس ایک حج کرنے والے عاشق خداوندی کا پہلا قدم خدا کے ماسویٰ کو ترک کر دینا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ماسوی اللہ مرغوبات نفس ہی ہوسکتے ہیں۔ جن میں بڑا مرغوب جس سے انسان کا دل اٹکا ہوا رہتا ہے۔ وہ کھانا پینا اور عورت سے لذت حاصل کرنا ہے کہ دنیا کے سارے جھگڑے انہیں چند مرغوبات نفس کے لئے آدمی سر لیتا ہے ظاہر ہے کہ جب تک دل میں ان چیزوں سے شغف اور کمال رغبت باقی رہے گا۔ محبوب حقیقی (حق تعالیٰ شانہ) کا شغف وعشق اس دل میں کہاں سے جگہ پاسکے گا؟ اس لئے اس محبت وعشق کی عبادت یعنی حج کے ابتدائی مراحل میں ایک عاشق خداوندی کے لئے سب سے پہلے کھانے پینے اور بیوی کی لذت اٹھانے کے شغف اور غیر معمولی لگاؤ سے الگ رہنا قدرتاً ضروری ہو جاتا ہے۔

ورنہ عشق الٰہی کا مظاہر جسے حج کہتے ہیں شروع ہی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے شریعت نے حج کے مہینوں سے قبل متصلاً ہی رمضان کا مہینہ رکھا کہ تیس دن تک نفس کے ان اولین مرغوبات کھانا پینا اور لذت جماع کی غیر معمولی

خواہش کو روزہ کے ذریعے کم سے کم کر دیا جائے۔ پس مہینے کے تیس دنوں میں دن بھر تو یہ لذتیں روزہ کے ذریعہ بالکل ہی چھڑا دی جاتی ہیں اور بھوک پیاس سے کمزوری لاحق ہو جانے سے رمضان کی راتوں میں بھی آدمی ان لذتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں رہتا ادھر راتوں میں تراویح اور تلاوت قرآن پاک کا شغل مقرر کر دیا گیا جس سے ان لذات کے لئے کچھ وقت بھی پورا نہیں ملتا کہ آدمی کا دل ان میں پھنسے اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ پورے ایک ماہ تک ان لذتوں سے بیگانہ رکھ کر رمضان میں یہ بنیادی لذتیں چھڑا دی جاتی ہیں تاکہ ان مرغوبات نفس کی خواہش ابھری ہوئی نہ رہے بلکہ ان کی محبت ورغبت کا دھیان دب جائے اور آدمی ان سے بیگانہ ہو کر محبت حق کے مظاہرہ کے قابل ہو جائے۔

حکمتِ اعتکاف...... لیکن اس کے بعد بھی گھر بار کی محبت بدستور باقی رہتی تھی مکان کی آسائش اور گھریلو سامان کی محبت جوں کی توں قائم تھی۔ حالانکہ یہ بھی وہی ماسوی اللہ ہے جو محبت الٰہی میں خلل انداز ہوتی ہے۔ خواہ دوسرے ہی درجہ میں سہی، اس لئے رمضان کے بیس دن گزرنے کے بعد عشرۂ آخر میں اعتکاف کی سنت کے ذریعہ گھر بھی چھڑا دیا جاتا ہے تاکہ آدمی گھریلو زندگی چھوڑ کر خانہ خدا میں پہنچے اور رات دن وہیں بسر کرے اور اس طرح کھانے پینے اور لذت جماع سے بیگانگی کے بعد وہ گھریلو سامان سے بھی دستبردار ہو جائے اور اس طرح نفس کے اور دوسرے محبوبات بھی ترک کرنے کی اس میں استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جائے۔

خطابِ حج...... پس! ماہ رمضان میں ان بنیادی لذات کے ترک کر دینے کی مشق سے جب آدمی کا دل محبوب حقیقی کی طرف بڑھ گیا اور اس کی طرف دوڑنے کی اس میں قریبی استعداد پیدا ہو گئی تو رمضان ختم ہوتے ہی اشہر حج (حج کے مہینے) شروع ہو جاتے ہیں اور افعال حج کے آغاز کا وقت آ جاتا ہے کہ آدمی دیار محبوب کی طرف دوڑ پڑے گویا اس عاشق خداوندی کی طرف کھانے پینے بیوی بچوں اور گھر بار سے دل ہٹا لیا تھا۔ شرعی خطاب متوجہ ہوتا ہے کہ اس عشق کی راہ میں کھانا پینا بیوی اور گھر چھوڑ دینا کافی نہیں ہے، اب وطن بھی ترک کر دو اور دیار محبوب کی طرف کوچ کرو کہ وطن بھی ایک بڑا بت ہے جو راہ خدا میں حارج ہوتا ہے۔

حکمتِ احرام...... پھر یہ عاشق خداوندی جب وطن چھوڑ کر جنگلوں بیابانوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتا ہوا اور سمندروں کو عبور کرتا ہوا دیار محبوب میں داخل ہو گیا تو حرم الٰہی کی میقات آتے ہی محبوب حقیقی کا حکم یہ ملا کہ یہ کھانے پینے زن و فرزند گھر بار اور وطن و ملک کا چھوڑ دینا بھی اس راہ عشق میں کافی نہیں بلکہ لباس زینت بھی ترک کرو سلے ہوئے کپڑے بھی چھوڑ دو کہ اس لذت کا شغل بھی محبوب حقیقی کے وصال میں حارج اور عشق کی غیرت کے خلاف ہے۔ صرف تن ڈھانکنے کی حد تک احرام کی کفنی پر قناعت کرو، ایک چادر بدن کا نصف بالا ڈھانکنے کے لئے اور ایک چادر بدن کا نصف زیریں۔ چھپانے کے لئے ہو نہ سر پر ٹوپی اور عمامہ ہو جو سر کو ڈھانپ دے نہ پیر میں کوئی گھیرا جوتا جو پورا ڈھانپ لے تاکہ جیسے رمضان میں اس عشق الٰہی کا باطن گرویدہ محبت ہو چکا تھا، اب اس کا اظہار

بھی آثار عشق سے ہو جائے اور اس عاشق الٰہی کو عشق میں تن من دھن کی کوئی خبر نہ رہے۔

عاشقانہ بول...... لیکن اس ظاہر و باطن کے درمیان کی ایک چیز ابھی باقی تھی جو ابھی تک آثار عشق سے متاثر نہیں ہوئی تھی اور وہ زبان ہے جو کسی حد تک ظاہر ہے اور کسی حد تک باطن یعنی ظاہر و باطن کے درمیان ایک برزخ ہے جو باطن کی تو ترجمان ہے اور ظاہر کی نگہبان ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اسے بھی اس عشق سے حصہ ملے اور ظاہر ہے کہ زبان کا حصہ قول اور بول ہی کی شکل کا ہو سکتا تھا اس لیے اسے عاشقانہ بول دیا گیا کہ وہ قدم قدم پر خود اپنی ترجمانی کی بجائے محبوب حقیقی کی محبت کی ترجمانی کرے اس لئے احرام باندھتے ہی زبان کو لبیک لبیک کے کلمہ سے ذکر محبوب کا پابند بنایا جاتا ہے تاکہ زبان کے ذریعے نفس اور خواہشات نفس کی ترجمانی نہ ہو بلکہ حضوری حق کے جذبات کی ترجمانی ہو اور اس قینچی کی طرح چلنے والی زبان کے تقاضے آزاد نہ رہیں کہ وہ جتنا چاہے اور جو چاہے بولتی رہے اس لئے عاشق کے ان ایام عشق میں ہر تغیر اور ہر موڑ پر لبیک کا نعرہ لازم کر دیا گیا ہے کہ ہر نیچائی اونچائی ہر پہاڑ ہر غار ہر قافلہ ہر جماعت کی مڈبھیڑ پر یہی عاشقانہ و والہانہ نعرہ زبان پر چھایا ہوا رہے کہ لبیک اللھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک پس اس طرح کی آزادلذت بھی اس عاشق حق سے ترک کرادی گئی اور یہ عاشق اپنی زبان اپنے دل اور اپنے تمام تر اعضاء و جوارح سے صرف اپنے محبوب حقیقی ہی میں مشغول و منہمک ہو گیا۔

حکمت طواف...... اب جب کہ خانہ محبوب تک رسائی ہو گئی۔ آدمی مکہ مکرمہ اور حرم محترم میں پہنچ گیا اور خانہ خدا کے سامنے آ گیا جس میں جمالات حق تجلی ریز ہیں تو پھر شرعی خطاب متوجہ ہوا کہ تم نے اب تک محبوبات نفس گھربار وسائل عیش اور اسباب راحت و عیش کی خاطر بہت چکر لگائے تھے اب یہ چال اور چکر ان سب چیزوں سے ختم کر کے خانہ محبوب کے لیے مختص کردو اور عشق کی وارفتگیوں میں غرق ہو کر محبوب کے گھر کے ارد گرد پروانوں کی طرح چکر لگاؤ ایک دو پھیروں سے نہیں بلکہ سات پھیرے پھر وجوفن حساب کی رو سے عدد زائد ہے اور کبھی گھٹنے والا نہیں پھر طواف بھی ایک دو بار نہیں بلکہ ان پاک ایام اور مکہ کے قیام کی اعلیٰ ترین عبادت ہی یہ چکر لگانا اور خانہ محبوب کے ارد گرد گھومتے پھرتے رہنا ہے جس کا نام طواف ہے۔

حکمت وقوف عرفات...... پھر مکہ کے مقدس شہر کا قیام گو وطن کا قیام نہیں مگر بہر حال شہر کا قیام ضرور ہے۔ اس میں وطن کی عمارتیں نہ سہی بلد الٰہی کی ہی سہی جو شہری زندگی کی ساری راحتیں لذتیں اور زینتیں لئے ہوئے ہیں اور عاشق کی شان غیرت کے یہ بھی خلاف تھا کہ عاشق کا دل عمارتوں اور سامان عیش و تمدن میں کسی بھی درجہ میں اٹکا رہے اس لئے اصل حج کے لئے جو حقیقی طور پر شان عشق کا مظاہرہ تھا ایام حج میں حکم یہ ملا کہ مکہ کی شہری آبادی بھی ترک کرو اور عرفات کے ریگستان میں ننگے سر ننگے پاؤں کفنی پہنے ہوئے پہنچو کہ اصل حج یہی ہے کہ ایک چٹیل میدان میں گھر بار بیوی بچے سامان تمدن اور وسائل عیش کی متقاضی ہوتی ہے بلکہ ایک کپڑے کا مسافر خانہ یعنی خیمہ ہو اور تم ہو۔ تاکہ اعلیٰ ترین ترک لذات کا مقام حاصل ہو جائے جو ایک عاشق کے لئے سزاوار واجبات عشق کے لئے درکار ہے۔

فدیہ جان...... ہاں مگر پھر بھی سب تروک کے بعد عاشق کا نفس ابھی عاشق کے پاس ہی تھا جس کی رو سے وہ اپنے کو "انا" اور "میں" کہہ سکتا تھا۔ دار انحالیکہ کمال عشق کے لئے یہ بھی ایک چیلنج ہے کہ عاشق اپنی ہستی کو برقرار رکھ کر بمقابلہ محبوب اس کا تصور بھی دل میں قائم رکھے۔ بلکہ اس کا آخری فریضہ یہ ہے کہ راہ محبوب میں اپنے نفس کو بھی ایثار کر دے اور اس ظاہری ہستی سے بھی سبکدوش ہو جائے تو خطاب شرعی متوجہ ہوا کہ عرفات سے لوٹ کر منی پہنچو اور اس کے قطعہ جان سپاری میں پہنچ کر جسے منحر کہتے ہیں نثار ہونے کے لئے اپنی جان بھی پیش کر دو، یعنی اسے بھی ترک کرنے کا عزم باندھ لو، اب یہ محبوب حقیقی کا لطف وکرم ہے کہ اس سچے عاشق کی طرف سے جس نے اپنی ساری زندگی کی تمام لذات اور آخرکار خود زندگی ہی کو پیش کر دیا، قبول فرما کر اس کی جان کے بدلے قربانی کے جانور کی جان بطور فدیہ قبول فرمالے اور اس کے بعد پھر گھر لوٹ جانے اور متروکہ وسائل عیش سے لذت اندوز ہونے کی اجازت عطا فرمائے۔ اس لئے منی میں قربانی کا حکم ہوا کہ جان کا فدیہ جان سے دیدو۔ یہ خود تمہارا اپنے نفس کا فدا ہونا ہی سمجھا جائے گا پس محبوب کے لئے آخر میں جان بھی پیش کر دی جاتی ہے جو عشق کا انتہائی مقام ہے۔

مقدمۂ حج...... بہرحال اس سے واضح ہے کہ حج تروک کا مجموعہ ہے، ترک لذت، ترک زینت، ترک راحت خانہ ترک لباس ترک وطن ترک جاہ۔ اور ترک مال وغیرہ جس کی ابتداء کھانے پینے اور عورت اور گھر کے ترک کرنے سے ہوتی ہے، یہی دنیوی زندگی کی لذات کا اعظم ترین حصہ ہے بلکہ دوسری لذات کا سرچشمہ ہے، جسے اشہر حج سے قبل کے مہینے (رمضان) میں حج کی خاطر چھڑا دیا جاتا ہے تاکہ آئندہ کے تروک کی استعداد پیدا ہو جائے، اگر کھانے پینے اور بیوی۔ سے کنارہ کشی کی استعداد پیدا نہ کی جائے تو اگلے کسی ترک پر بھی آدمی مستعد اور آمادہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے روزہ کی عبادت درحقیقت حج کا مقدمہ ثابت ہوتی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی عبادت نماز کا مقدمہ ثابت ہوئی تھی جس سے پوری طرح کھل جاتا ہے کہ اسلام میں اصل عبادتیں دو ہی ہیں نماز اور حج۔ ایک صفات جلال کا تقاضا ہے اور ایک صفات جمال کا اور زکوٰۃ اور روزہ ان کے وسائل اور مبادی میں سے ہیں۔ جنہیں ان دو کی وجہ سے عبادت بنا دیا گیا ہے۔ خود بذاتہ عبادت کے بارہ میں اصل نہیں ہیں۔

زکوٰۃ وروزہ ''عبادت لغیرہ'' ہیں...... یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز اور حج میں وسائل دولت یا وسائل لذت کے خارج ہونے کا امکان نہ ہو وہاں نماز اور حج تو ہوگا مگر زکوٰۃ وروزہ کی عبادت نہ ہوگی جیسے ملائکہ کو نماز بھی دی گئی ہے وہ ہر وقت رکوع وسجود اور قیام میں ہیں اور حج بھی دیا گیا ہے۔ کہ وہ روزانہ ساتویں آسمان پر "بیت المعمور" کا حج اور طواف کرتے ہیں بلکہ ہر آسمان میں بیت المعمور کی سیدھ میں ایک ایک قبلہ ہے جس کا اس آسمان کے باشندے طواف کرتے ہیں مگر ملائکہ میں چونکہ نہ مال ودولت کا قصہ ہے نہ شہوت وزینت اور غضب کا کہ وہ نماز اور حج سے روکیں اس لئے انہیں نہ زکوٰۃ کا پابند کیا گیا نہ روزہ کا کہ وہ خود ہی پاک ہیں، پھر مال دلوا کر اور روزہ رکھوا کر انہیں پاک کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس سے صاف نمایاں ہے زکوٰۃ اور روزہ درحقیقت نماز اور حج ہی کے لئے رکھا گیا

ہے اور یہ ان کے مبادی میں سے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ نفس کو پاک اور صالح بنا کر نماز اور حج کے لئے مستعد بنایا جائے پاکی اور صفائی پہلے سے حاصل ہے وہاں نماز اور حج تو قائم رہے زکوٰۃ اور روزہ درمیان میں سے نکال لیا گیا، اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ نماز اور حج تو صفات الٰہیہ کا تقاضا ہیں۔ ایک صفات جلال کا اور ایک صفات جمال کا لیکن زکوٰۃ اور روزہ صفات نفس کا تقاضا ہیں کہ جب تک زکوٰۃ اور روزہ کے ذریعے انسانی نفس کو پاک نہ کیا جائے وہ نماز اور حج کے قابل نہیں بنتا اور ظاہر ہے کہ حقیقی معنی میں عبادت وہی ہوتی ہے جس کا تقاضا معبود کی صفات کریں نہ کہ وہ جن کا تقاضا خود عابد کی صفات کریں، گو معبود ہی کے لئے کریں، اس لئے نماز اور حج تو بذاتہ یا خود عبادت ثابت ہوئیں اور زکوٰۃ اور روزہ بذاتہ عبادت نہیں بلکہ ان دو اصلی عبادتوں کا وسیلہ بن کر لغیرہ عبادت ثابت ہوئیں اور یہی مقصود تھا اس بیان کا۔

نماز و حج میں باہم نسبت تضاد...... اب ان دو اصل عبادتوں نماز اور حج میں مزید غور کیا جائے تو جیسے ان میں بلحاظ منشاء کے فرق ہے کہ ایک جلالی صفات سے پیدا شدہ ہے اور ایک جمالی صفات سے ایک میں گرمی ہے اور ایک میں نرمی ویسے ہی ان کے آثار ولوازم میں بھی کافی فرق بلکہ تضاد کی نسبت ہے، جو چیزیں نماز میں مستحسن اور ضروری ہیں وہ حج میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ ممنوع اور قبیح ہیں، اور جو باتیں حج میں مطلوب اور ضروری ہیں وہ نماز میں مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں۔

نماز چونکہ احکم الحاکمین کے شاہی دربار کی حاضری ہے اس لئے اس میں تو آداب شاہی کی رعایت کی گئی ہے جیسے وقت وضو جو غسل کے قائم مقام ہے لباس کی صفائی اور ستھرائی اور اس پر خوشبویات کا استعمال، وقار اور متانت کے ساتھ مساجد کی حاضری کہ بھاگتے دوڑتے نہ آویں بلکہ متین چال سے چل کر پہنچیں، سنجیدگی سے نشست و برخاست ہو، بے ڈھنگا پن نہ ہو، سکوت وخاموشی یا ذکر خفی کے ساتھ بیٹھنا ہو، شور وشغب یا آواز کی بلندی نہ ہو، بخلاف حج کے کہ وہ محبوب کے در پر عشاق کی حاضری ہے اس لئے وہاں عشق ومحبت کی وارفتگی، سوز وگداز افروختن وسوختن وجامہ گذیدن اور بیتابی وتڑپ کے ساتھ وجدی حرکتیں مطلوب ہیں تا کہ عقل ومصلحت بینی کی باتیں یا اپنی آرائش وزیبائش اور زیب وزینت جس سے عاشق کو اپنی دھن میں مٹے رہنے کے سبب کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس لئے اگر نماز میں صفائی ستھرائی اصل تھی تو یہاں بے زیب وزینت رہنا اصل ہے کہ "اَلْحَجُّ الْعَجُّ وَالثَّجُّ" ① وہاں سیاس عمدگی کی مطلوب تھی تو یہاں سر سے سلا ہو لباس ہی ممنوع ہے، وہاں لباس کی زینت مطلوب تھی تو یہاں ترک زینت مطلوب ہے وہاں خوشبو لگانا مستحسن تھا یہاں احرام کے بعد خوشبو حرام ہے، وہاں نمازوں اور بالخصوص جمعہ وعیدین کی نمازوں کے لئے بدن کی معتدل زینت ضروری تھی جو حجامت سے حاصل ہوتی

① السنن للترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی فضل التلبیة والنحر، ص: ۱۷۴۹، رقم: ۸۲۷.

ہے۔ یہاں محرم کے لئے سر سے بدن کی آرائش، اصلاح خط اور حجامت ہی ناجائز ہے، وہاں سکوت اور سر و خفا ضروری تھا یہاں لبیک لبیک کا شور ہے وہاں سکون اعضا و جوارح ضروری تھا کہ ایک جگہ جم کر کھڑے رہیں یا فکر میں مستغرق رہیں اور بیٹھیں تو گردن جھکا کر سکون سے بیٹھے رہیں۔ یہاں نقل و حرکت بلکہ بھاگ دوڑ ضروری ہے۔ کہیں صفا مروہ پر دوڑنا کہیں طواف میں چکر کاٹنا، وہاں تواضع سے گردن جھکانا ضروری تھی اور یہاں سعی سے پہلے کے طواف میں گردن تاننا اور اکڑ اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجبات میں سے ہے، وہاں نمازوں کا اکثر حصہ جیسے سنتیں اور نفلیں گھر میں پڑھنا مستحب تھا، یہاں سرے سے گھر چھوڑ دیا محبوب میں آنا ضروری ہے کہ حج فرض ہو یا نفل گھر بیٹھ کر ہو ہی نہیں سکتا۔

وہاں خون گرانے سے بچنا ضروری تھا اور یہاں اہراق دم یعنی منیٰ میں خون بہانا ہی اصل عبادت ہے، وہاں شیطانی وسوسوں کا مقابلہ ناپسند بلکہ دفع الوقتی اور ادھر سے خیال ہٹا دینا ہی وسوسہ کا علاج ہے۔ یہاں خود شیطان کے مواقع رَجُل کے بھی مد مقابل آ کر اسے کنکروں سے سنگسار کرنا ضروری ہے، غرض وہاں افعال ہی اقوال ہیں اور یہاں تروک ہی تروک۔

وہاں بقاؤ شعور کی شان کا غلبہ ضروری ہے جو عقل کا تقاضاء ہے اور یہاں فنا و لِحویت کی شان وھاں بقاء شعور کی شان کا غلبہ ضروری ہے جو عقل کا تقاضہ ہے اور یہاں فنا و لِحویت کی شان لازمی ہے جو عشق کا مقتضاء ہے غرض ان دونوں عبادتوں کے لوازم و آثار میں تضاد کی نسبت ہے، جیسا کہ عقل اور عشق کے تقاضوں میں تضاد کی نسبت ہے، بادشاہ کے دربار میں عقل و ہوش کے ساتھ آنا پڑتا ہے، اور محبوب کے در پر عقل و شعور سے بالا ہو کر محویت و ربودگی کے ساتھ حاضر ہونا ہوتا ہے غرض یہ واضح ہو گیا کہ ادھر حق تعالیٰ کی صفات کمال کی دو شانیں تھیں، صفات جلال اور صفات جمال اور ادھر ہر بندہ میں بھی دو ہی جوہر رکھے گئے تھے۔ ایک عقل اور ایک عشق یعنی اگر اللہ کی شانوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حاکم بھی ہو اور محبوب بھی۔ تو بندہ کے ان دو جوہروں کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا محکوم بھی ہو اور عاشق بھی۔

ان دونوں تقاضوں سے یہ دونوں عبادتیں مقرر ہوئیں، ایک نماز جس میں حاکم حقیقی کے سامنے اپنی محکومیت و فدویت اور نیاز مندی و عبدیت پیش کی جاتی ہے، اور ایک حج جس میں محبوب حقیقی کے سامنے اپنی محویت اور رلودگی اور جاں نثاری اور جاں سپاری پیش کی جاتی ہے، اس لئے دونوں عبادتیں اسلام کا بنیادی موضوع ثابت ہوتی ہیں۔ اسی لئے جن میں اسلام سمجھانے کے لئے تحریری مواد فراہم کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے وہ اولاً عبادات اور خصوصاً نماز و حج کے لئے سب سے پہلے مواد فراہم کرتے ہیں اور بلاشبہ یہ دونوں عبادتیں اسی کی مستحق بھی ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی جائیں۔ چنانچہ نماز پر بھی سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں جن میں نماز کے مسائل نماز کے افعال، نماز کی روح، نماز کے اسرار، نماز کے مصالح، نماز کی غرض و غایت، نماز کے ثمرات و نتائج وغیرہ جمع کئے گئے ہیں اور ایسی کتابوں کا ایک بڑا عدد تاریخ کے اوراق میں دستیاب ہوتا ہے۔

اسی طرح مناسک حج پر بھی کتابوں کا ایک ذخیرہ ملے گا جو اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے مرتب ہوا ہے۔ فضائل حج، مسائل حج، دلائل حج، اسرار حج، آثار حج، شعائر حج، مقامات حج، تاریخ حج، جغرافیہ حج، طریق حج وغیرہ پر ضخیم ضخیم جلدیں لکھی گئی ہیں۔ اور بلاشبہ یہ دونوں موضوع اسی کے مستحق بھی تھے کہ ان پر سفینے مرتب ہوں اور ان کے حقائق محض سینوں کی امانت نہ بنے رہیں جب کہ یہی دو عبادتیں اسلام کی اساس اور حقیقی عبادتیں تھیں جن سے دوسری عبادتوں نے جنم لیا، پھر اس میں بھی خصوصیت سے حج کی عبادت چونکہ نقل و حرکت اور سیر و سیاحت کی عبادت تھی جس میں ایک حاجی کو اپنی نظر و فکر کی مستعدی کی حد تک مختلف رنگ کے تجربات بھی حاصل ہوتے ہیں اس لئے حج سے متعلقہ تصانیف میں سفرناموں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے جو اہل علم حجاج نے بوقت سفر حج قلمبند کیا اور اپنے تجربات سے مابعد کے حجاج کو مستفید ہونے کا موقع بخشا تا کہ ان کے تجربات سے بعد کے لوگ مختلف معلوماتی فوائد بھی حاصل کریں اور پچھلوں کے تجربات اگلوں کے لئے راہ حج میں مدد اور آسانیوں کا ذریعہ ثابت ہوں۔

علمی حج ...... خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے بھائی محترم بزرگ بھائی، دوست اور مخلص دوست متدین اور متقی عالم مولانا محمود حسن صاحب گیاوی دام مجدہ فاضل دیوبند نے بھی اپنے سفر حج میں اپنے عملی حج کو علمی حج بنانے کی سعی مشکور فرمائی اور اپنے سفر حج کے کوائف و تجربات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سفرنامہ کی صورت میں مرتب فرمایا نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ شرعی اور فنی طور پر بھی حج کے مختلف پہلوؤں کو اپنے علم و عمل اور تجربہ کی روشنی میں جمع فرمایا ہے، جس کے عنوانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں حج کے تمام مَالَهٗ وَمَا عَلَيْهِ سے بحث کرتے ہوئے مسائل، فضائل، دلائل، شمائل، شعائر، آثار، وقائع حوادث و ضروریات وغیرہ کا ایک معتد بہ اور بڑا ذخیرہ جمع فرما دیا ہے جو ان کے علم و عمل اور اخلاص و ایثار کا شاہکار ہے اس لئے یہ سفرنامہ تاریخ، تحقیق، فقہ، کلام، روایت اور درایت ہر پہلو سے حج کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے۔ جس نے حج کو ”آئینہ“ بنا کر طالبوں کے سامنے رکھ دیا ہے اور خصوصیت سے یہ مصنف ممدوح کا خاص احسان ہے کہ انہوں نے مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات سے بھی دنیا کو فائدہ پہنچانے کی سعی فرمائی ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنَّا وَعَنْ جَمِيْعِ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرَ الْجَزَاءِ۔

آئینۂ حج اور آئینہ نمائی ...... محترم مصنف کی خواہش تھی کہ میں اس رسالہ ”آئینۂ حج“ پر بطور مقدمہ چند سطریں لکھ کر پیش کروں میرے لئے سب سے بڑی مشکل وقت نکالنے کی تھی، پھر اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے ایسے اہم اسلامی موضوع پر قلم چلانے کی تھی اور اوپر سے کتاب اپنی جامعیت اور مکمل تفصیلات کا آئینہ ہونے کی وجہ سے بھی مقدمہ و تمہید سے بے نیاز بھی تھی جب کہ اس میں جن کا پہلو خود ہی موجود ہے اس لئے تعمیل میں غیر معمولی تاخیر ہوئی پھر بھی یہ چند سطریں کسی نہ کسی طرح سفر و حضر میں تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر پوری کی ہیں اور محض ”آئینۂ حج“ پیش کر دینے کے لئے پیش کر دی گئیں تا کہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ کر لوگ خود ہی اس کا اور اپنا اندازہ لگا سکیں۔ ورنہ جہاں تک حج کے

پہلوؤں کا تعلق ہے یہ ''آئینہ'' سارے حج کا خود ہی آئینہ دار ہے، جس کے جوہروں میں حج کے سارے ہی پہلو جلوہ گر ہیں، نہ اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش ہے نہ اضافہ کی، نہ تمہید کی، نہ مقدمہ کی، پس یہ مقدمہ آئینہ حج میں خود اپنے کو دیکھنے کے لئے بطور آئینہ کے پیش کیا جا رہا ہے نہ کہ حج کو دیکھنے کے لئے۔ کہ حج نمائی کا آئینہ بنانا۔

مصنف محترم جیسے عالم و فاضل کا کام تھا جنہوں نے آئینہ حقیقتاً بنا کر دنیا کو دکھا دیا۔ میرا کام صرف آئینہ نمائی تھا جو برے بھلے انداز سے بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ حق تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور مصنف ممدوح کو جزائے خیر عطا فرمائے اور مقدمہ کی اس علمی سعی کو مشکور فرمائے۔ (آمین)

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.

پس منظر ..... جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی کے موقع پر ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو نماز جمعہ کے بعد جامعہ کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر امیر جامعہ اور منتظمین جلسہ کے اصرار پر حضرت مہتمم صاحب (رحمۃ اللہ) نے ایک نہایت ہی مختصر مگر نہایت جامع خطبہ ارشاد فرمایا جو اس درجہ مؤثر و مقبول ہوا کہ اساتذہ کرام جامعہ ملیہ اور دیگر حضرات نے حضرت موصوف سے اس کے قلمبند کرنے کی فرمائش کی تا کہ اشاعت کے ذریعہ اس کو غائبین تک بھی پہنچایا جائے اور وہ بھی اس سے اسی طرح مستفیض و محظوظ ہوں جس طرح حاضرین نے فیض حاصل کیا۔ چونکہ وہاں مصروفیت زیادہ رہی اور قیام گاہ پر زائرین اور ملاقاتیوں کا برابر ہجوم رہا۔ اس لئے اس خطبہ کو قلمبند کرنے کا موقع نہ ملا۔

دیوبند مراجعت فرمانے کے بعد احقر کے اصرار پر باوجود انتہائی عدیم الفرصتی کے حضرت موصوف نے یہ خطبہ قلمبند فرما کر مرحمت فرمایا ہے کہ اگر چہ تقریر کا بعد از وقت بعینہ تحریر میں آ جانا تو عادتاً ناممکن ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ چونکہ یہ تحریر حضرت موصوف کے قلم سے ہو کر شائع ہو رہی ہے اس لئے ایک حد تک اصل تقریر کی غمازی کر سکے گی۔

(احقر: مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند)

اہمیتِ نماز

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـا وَسَنَدَنَـا وَمَوْلَانَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ،بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ﴾ ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

کائنات کا انتہائی مقصد...... بزرگانِ محترم! مجھے اس وقت کوئی تقریر کرنا منظور نہیں ہے اور نہ اس کا پروگرام ہی ہے، مجھے امر کیا گیا ہے کہ میں آپ حضرات سے مسجد کے سنگِ بنیاد کے سلسلہ میں دعا کراؤں یہ ظاہر ہے کہ دعا کرانے کی چیز نہیں ہے۔ کرنے کی چیز ہے۔ آپ بھی خود ہی دعا کریں گے اور یہ بھی دعا کرنے میں آپ کے ساتھ شامل ہوگا۔ اس لئے دعا کرانے کے لئے بھی میں نہیں کھڑا ہوا ہوں۔ مقصد دعا سے پہلے دعا کے نقاط پر توجہ دلانا ہے کہ کن پہلوؤں پر دعا کریں گے۔ اور حق تعالیٰ سے کن مقاصد کا سوال کریں گے۔ کیونکہ اس وقت مطلقاً دعا مقصود نہیں ہے بلکہ دعا خاص مقصود ہے۔ سو اس دعا کے نقاط اور پہلوؤں پر اس طرح سے غور کیجئے کہ اس ساری کائنات کا پھل اور آخری مقصد انسان ہے جس کے لئے زمین و آسمان کا یہ سارا خیمہ تانا گیا ہے۔ اگر انسان کی تخلیق منظور نہ ہوتی تو کائنات کی تخلیق بھی عمل میں نہ آتی۔ پس ساری کائنات انسان کی خاطر بنائی گئی ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ. ② "ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے"۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ ③. "اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے ہی نفع کے لئے ہیں"۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: ﴿اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

---

① پارہ: ۱ سورۃ البقرۃ،الآیۃ: ۴۳.

② شعب الایمان، التاسع والثلاثون من شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس، ج: ۲۲، ص: ۱، رقم: ۱۰۱۸۵.

③ پارہ: ۱ سورۃ البقرۃ،الآیۃ: ۲۹.

﴿فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ○وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىٕبَیْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ○ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ﴾ ① ”اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی کو اتارا اور اس سے پھل اگائے تمہارے رزق کے لئے اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگایا تا کہ اس کے حکم سے وہ دریا میں چلیں اور دریا تمہارے کام میں لگائے اور آفتاب ماہتاب تمہارے کام میں جو چل رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے کام میں لگا دیا اور وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے اس سے مانگا۔ (خواہ وہ قولی سے یا دعا عملی یعنی اختیار و اسباب سے)“

پس زمین و آسمان، رات دن کا لوٹ پھیر، شجر و حجر اور بحر و بر کا کارخانہ سب کچھ انسان ہی کے لئے تیار کیا گیا ہے جس سے واضح ہے کہ تخلیق کائنات کا انتہائی مقصد انسان ہے۔ پھر یہ انسان کس لئے ہے؟ ظاہر ہے کہ کائنات کے لئے نہیں۔ ورنہ وسیلہ ہونے کی بجائے مقصد ہو جائے گا اور یہ خلاف نقل و عقل اور خلاف مشاہدہ ہے جیسا کہ واضح ہوا۔ اس لئے ایک ہی نتیجہ ہے کہ انسان کائنات کے لئے نہیں بلکہ خالق کائنات کے لئے ہے یعنی اس کی عبادت کے لئے۔ اس کے سامنے جھکنے اور گڑگڑانے اور اس کے آگے سر عبودیت خم کرنے کے لئے پس انسان کا مقصد تخلیق عبادت نکلا اور اب منطقی اصول پر نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات انسان کے لئے اور انسان عبادت کے لئے تو ساری کائنات کی یہ تنظیم و تخلیق صرف عبادت کے لئے عمل میں آئی ہے۔

عبادت کا فردِ کامل..... عبادت پر اگر آپ غور کریں گے تو اس کا فرد کامل نماز ہے۔ گویا ساری دنیا نماز کے لئے بنائی گئی ہے کہ یہی عبادت کا فرد کامل اور مظہر اتم ہے بلکہ میں ترقی کر کے یہ عرض کروں گا کہ سلسلہ عبادت میں عبادت صرف نماز ہی ہے اور کوئی چیز بذاتہ عبادت نہیں۔ کیونکہ عبادت کے معنی غایت تذلل اور انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جو انتہائی عزت والے کے سامنے اختیار کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے نماز کے سوا کوئی چیز بذاتہ عبادت نہیں نکلتی۔ مثلاً روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں کیونکہ روزہ کے معنی کھانے پینے اور تمام لذات نفسانیہ سے مستغنی ہو جانے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ غنا اور عدم احتیاج ذلت نہیں۔ کیونکہ غنا تو خود خالق کی شان ہے تو خالق کی شان اختیار کرنا عیاذاً باللہ ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یا صدقہ و زکوٰۃ دینا عطا ہے اور عطا تو خود اللہ کی صفت ہے اور معاذ اللہ ذلت کیسے ہو سکتی ہے؟ یا سچ بولنا خدا کی شان ہے تو اسے عبادت اور غایت تذلل کیسے کہہ دیں گے۔ اسی طرح اور تمام اخلاق حسنہ اور اعمال فاضلہ بذاتہ ذلت نہیں کہ انہیں عبادت کہا جائے پھر بھی جو انہیں عبادت کہا جاتا ہے محض امتثال امر خداوندی کی وجہ سے نہ کہ بالذات۔ ہاں نماز بالذات عبادت ہے، کیونکہ اس کی ہیئت کذائی قیام، قعود، رکوع اور آخر کار سجدہ میں ناک اور پیشانی زمین پر ٹیکنا انتہائی ذلت اور عبودیت کا اظہار ہے، اس کے اذکار مشتمل ہیں یا اظہار قدوسیت نفس پر یا اعلان عزت رب پر۔ اور یہ خود شان تذلل ہے۔ غرض نماز کی

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۳۲، ۳۳۔

ہیئت اور حقیقت سب مظہر ہے شئون تذلل اور احوال عبودیت پر۔

حاصل یہ ہوا کہ کائنات کی تخلیق عبودیت یعنی نماز کے واسطے ہوئی ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے نماز ہی کا ساری کائنات کو پابند ظاہر فرمایا ہے نہ کہ زکوٰۃ وحج اور صوم وصدقہ کا۔ فرمایا: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾ ① ''ہر چیز نے (خلقۃً اور تکوینی ہدایت سے) اپنی نماز اور تسبیح (یعنی ہیئت نماز اوراذکار نماز) کو جان لیا ہے''۔ جس سے واضح ہے کہ ساری کائنات نمازی ہے، بھلا پھر انسان کو تو کیوں نہ نمازی بنایا جاتا۔ فرق اتنا ہے کہ اور مخلوق غیر عاقل ہے تو اس میں نماز کا داعیہ جبلی اور تکوینی طور پر رکھ دیا گیا ہے اور انسان ذی عقل وہوش ہے۔ تو اس کی نماز اختیاری ہے، جس کے لئے ہدایت ورہنمائی اور وعظ وپند کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس اگر انسان نمازی نہ ہو تو گویا اس نے اپنے مقصد تخلیق کو فوت اور ضائع کر دیا۔ اس لئے فاروق اعظمؓ نے اپنے دور خلافت میں تمام رعایائے اسلام کے نام فرمان جاری فرمایا تھا کہ:

نماز ہے تو کل دین ہے...... إِنَّ أَهَمَّ أُمُورِكُمْ فِيْ دِيْنِكُمْ عِنْدِي الصَّلٰوةُ فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهُ وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أَضْيَعُ ② ترجمہ: میرے نزدیک تمہارے دین میں سب سے زیادہ اہم چیز نماز ہے، جس نے اسے ضائع کر دیا وہ دوسرے دینی کاموں کو اس سے بھی زیادہ ضائع کرے گا۔ اس سے واضح ہے کہ دین کے دوسرے کاموں کی بقاء بھی درحقیقت نماز ہی ہے۔ اسی سے اوقات کی پابندی ہوتی ہے، اسی سے عظمت حق دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ اسی سے دین کے اوامر کی عظمت ہوتی ہے اور پھر ان کی تعمیل پر دل مجبور کرتا ہے۔ غرض نماز ہے تو کل دین ہے۔ اور وہ نہیں تو دین بھی نہیں، اور مسلمان کا دین ہے تو دنیا بھی ہے ورنہ دنیا بھی نہیں۔ پس نماز ہے تو جہان ہے ورنہ حرمان وخسران ہے۔ بس اسی مقصد نماز کی تکمیل کے لئے یہ سنگ بنیاد رکھا جا رہا ہے۔ تاکہ نماز اپنے مشروع طریق سے اسی مقدس جگہ میں ادا کی جائے۔

نماز تعلق مع اللہ کی مظہر اتم ہے...... اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اب تک تو جامعہ نے اپنے پروگراموں میں رسوم ادا کی ہیں اور اب حقیقت ادا کی ہے وہ سب چیزیں نمائشی تھیں۔ حقیقت اگر ہے تو صرف یہ، جیسے اس وقت انجام دے رہے ہیں کہ اس سے مقصد زندگی تکمیل پا رہا ہے۔ نماز مظہر اتم ہے تعلق مع اللہ کی۔ اگر نماز اور تعلق مع اللہ قائم ہے تب تو یہ ساری رسمیں جو ہم نے ادا کی ہیں باروح اور زندہ کہی جائیں گی، ورنہ یہ سب چیزیں جو رسم کی شکل سے ادا کی گئی ہیں ایک بے جان لاش ثابت ہوں گی۔ اور لاش کا انجام یہ ہے کہ وہ چند ہی دن بعد گلے، سڑے، پھولے اور پھٹے اور اس کی بدبو سے دماغ متعفن ہوں اور احساسات گندے ہو جائیں۔

---

① پارہ:۱۸، سورۃ النور، الآیۃ:۴۱۔

② المصنف لعبد الرزاق، ج:۱، ص:۵۳۶، رقم:۲۰۳۸۔ مشکوٰۃ المصابیح کتاب الصلوٰۃ، الفصل الاول، ج:۱، ص:۱۲۹، رقم:۵۸۵۔

نیز یہ تعلق مع اللہ ہے جو ان رسموں کی شکلوں کی بھی اصلاح کرسکتا ہے ورنہ بلا تعلق مع اللہ اور بلا واسطہ اوامر الٰہیہ کے یہ رسمیں بھونڈی اور بد شکل متصور ہوں گی پس اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھ کر اور نمازی بن کر در حقیقت ہم اس کا تہیہ کر رہے ہیں کہ اپنی رسوم کی صورتوں کی بھی اصلاح کریں اور اس میں حقیقت و روح بھی پیدا کریں۔ تاکہ ہمارا ہر عمل پائیدار اور عواقب کے لحاظ سے نتیجہ خیز ہو۔ ورنہ بے جان نعش کی طرح ضائع اور بے جڑ درخت کی طرح بے ثمر رہ جائے۔

قیام نماز سے ایک خاص فضا پیدا کرنا مقصود ہے...... اس لئے ہمیں دعا اس کی کرنی ہے کہ اے اللہ ہمیں نماز کی توفیق دے اور نماز کے لئے ہمارے اس مکان مقدس یعنی مسجد کی تکمیل کرا دے اور اس مسجد کو بنانے والوں، اس کی تعمیر کرنے والوں، اس میں امداد دینے والوں، اور اس کے منتظموں کا یہ عمل قبول فرما۔ ہمیں اللہ سے یہ مانگنا ہے کہ وہ اس نماز کے ذریعے ہمارے ہاتھوں جامعہ میں ایسی فضا پیدا کر دے کہ جس میں نیکیاں پھلیں پھولیں اور برائیاں اپنی موت مر جائیں۔ آج کا دور وہ ہے کہ نیک نیکی کر کے شرماتا اور منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ جیسے گویا اس نے کوئی بڑا بھاری جرم کیا ہے اور مجرم بدکاریاں کر کے فخر سے سر اونچا کرتا ہے کہ گویا اس نے دنیا کا کوئی محترم کام انجام دیا ہے۔ ہمیں اللہ سے واسطہ پیدا کر کے اور نماز کو قائم کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ نیکی کر کے نیک سر ابھارے اور مجرم اور بدکار خلاف شریعت امور کر کے منہ چھپاتا رہے اور اپنی برائی کو محسوس کرے۔

آج کے دور میں ایمان سے کورے آدمی کا لقب ہے دانا، عالی ظرف اور بہادر، اور ایماندار کا لقب ہے احمق بے وقوف مجنون اور دیوانہ۔ حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔ "**يُقَالُ لِلرَّجُلِ مَآ اَعْقَلَهٗ وَمَآ اَظْرَفَهٗ وَمَآ اَجْلَدَهٗ وَلَيْسَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْاِيْمَانِ**" ① "آدمی کے لئے کہا جائے گا کہ کس قدر دانا ہے کس قدر عالی ظرف ہے اور کیسا بہادر ہے۔ درانحالیکہ اس کے دل میں ذرہ برابر ایمان کا نشان نہ ہوگا"۔ اور دوسری روایات میں فرمایا گیا ہے کہ امین کو خائن کہا جائے گا اور خائن کو امین علم والے کی اتنی بھی عزت نہ رہے گی جتنی کہ ایک مردار گدھے کی لاش کی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں آج مشاہدہ میں آ رہی ہیں۔ اہل تقویٰ کا نام مذہبی دیوانے، احمق ملانے وغیرہ ہیں اور اہل فجور کے القاب اعقل، اظرف اور اجلا ہیں تو ہمیں تعلق مع اللہ والوں کی کثرت کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ ہر ایک کو اسی کے صحیح لقب سے یاد کیا جائے اور اسی کے مرتبے کے مطابق اس سے معاملہ کیا جائے۔ پس دعا میں ایک نقطہ یہ بھی ہمیں لانا ہے کہ اے اللہ ہمیں اہل تقویٰ میں سے اور نمازی کر کے ہمیں اہل سعادت کر اور اہل سعادت کی عزت و توقیر اور شوکت دنیا میں قائم فرما۔ ہماری مادی شوکت اگر ہمیں حاصل ہو اور جس کا ہم فوجی انداز میں مظاہرہ کر کے گویا اس کی تحصیل کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں اس کا ثمرہ اور آخری غایت بھی نمازی ہے یعنی خدا سے تعلق۔

سلطنت اسلامی کا مقصود...... حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿**اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ**

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانة والایمان. ج: ۱، ص: ۳۴۷.

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ ① پس ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کا دنیوی عروج اور تمکین فی الارض یعنی سلطنت و امارت اس لئے نہیں کہ کیک، پیسٹری کی فکر میں مستغرق ہوں۔ کوٹھی بنگلوں کی تعمیر ان کا منتہائے نظر ہو اور اندا کھیں ان کا آخری مطلب ہو۔ بلکہ ان کا عروج اس لئے ہوگا کہ وہ خدا کی چوکھٹ پر جھکیں اور اس کی مخلوق کو جھکا دیں۔ دنیا میں معروف اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برائی سے دنیا کو پاک کریں صدقہ و خیرات سے غریبوں کی غربت مٹادیں سائلوں اور محتاجوں کے دلوں کو تھامیں۔ اخوۃ ہمدردی سے عالم کو بھردیں۔ تفوق اور علو و فساد کا قلع قمع کریں۔

نمازی یا نماز کے ثمرات...... پس محض اس کی دعا کرنی ہے کہ خداوند ہمیں عروج دے تاکہ ہم تیرے اس مقدس مکان میں جمع ہو کر تیری یاد کریں اور اس بھولی ہوئی اور غافل دنیا کو تیرے بارے میں ہوشیار بنادیں۔ پس یہ کام ہم اس مسجد مقدس میں جماعتی حیثیت سے انجام دینے کی توفیق اللہ سے مانگنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہمیں اپنی دعا میں نمازی کی، مکان نمازی تکمیل کی توفیق، نماز کے شوکت کے وسائل قائم کرنے کی توفیق، نماز کے لئے مادی شوکت فراہم کرنے کی توفیق اور نماز کے ذریعے اپنی صورت و سیرت اور ہیئت و حقیقت کے پاکیزہ اور مطلوب انداز پر لانے کی توفیق مانگنا ہے۔ یعنی جو کچھ بھی مانگنا ہے وہ نمازی یا نماز کے ثمرات ہیں یا نماز کے مبادی اور وسائل ہیں۔ ہم صرف نماز ہی دنیا میں چاہتے ہیں اور نماز ہی کے لئے ہر کام بھی چاہتے ہیں۔

اگر حقیقتاً ہمیں یہ زندگی میسر ہو جائے تو اسی زندگی کا نام قرآن کی زبان میں حیات طیبہ ہے۔ اسی کا نام اسوہ حسنہ اور پاک سیرت ہے جس کے لئے اسلام آیا اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم کیا گیا۔

پس دعا کے یہی چند نقاط تھے جن پر توجہ دلانے کے لئے میں کھڑا ہوا تھا، مجھے کوئی تقریر یا نماز کے موضوع پر کوئی سیر حاصل بحث کرنا منظور نہیں تھا۔ نہ اس کا وقت ہے اور نہ کوئی پروگرام اس لئے اب آپ سب حضرات ہاتھ اٹھائیں اور اپنے رب کریم کی بارگاہ میں ان مطلوبہ نقاط پر مخلصانہ دعا فرمائیں۔

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱.

رمضان اور اس کے مقاصد و برکات

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ).

اصلاحِ طینت..... بزرگانِ محترم! ایک اعلیٰ ترین باغ کا بہار آفریں نشو ونما، اس کی دلکشی اور نظر افروز سرسبزی شادابی، تازگی اور بارآوری اس وقت تک اپنے عروج کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کی زمین کو خودرو گھاس پھونس اور خس وخاشاک سے پاک نہ کر دیا جائے، اسی طرح ایک پاکیزہ برتن پر قلعی سے اس وقت تک چمک نہیں آئیگی جب تک اس کے جگری زنگ کو دور نہ کر دیا جائے اور اس پر چھائی ہوئی کدورتوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے ہو بہو اسی طرح ایک قیمتی کپڑے پر کوئی نظر فریب رنگ اس وقت تک کھل نہیں سکتا جب تک کہ میل کچیل اور آئے ہوئے دھبوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے۔ اصول یہ نکلا کہ کوئی شی بھی تہذیب وتمدن اور اصلاح عمل کے ذریعہ اعلیٰ جوہروں سے اس وقت تک شائستہ اور آراستہ نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اس کے اندر سے ابھرنے والی خرابیوں کے مادوں کو سنت سے مغلوب اور مضمحل کر کے اس کی طینت کو صاف نہ کر دیا جائے۔

سعادت کی بنیاد..... ٹھیک اسی فطری اصول کے مطابق اس کائنات کے اشرف اصول اور افضل ترین رکن انسان کو بھی دیکھو کہ اسے بھی سعادت وشرافت، بزرگی اور برتری اور ظاہر و باطن کے فضل وکمال سے اس وقت تک آراستہ نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ اس کے اندرونی شر وفساد اور جبلی عیبوں اور اخلاقی خرابیوں کے ناپاک مادوں سے اسے صاف نہ کر لیا جائے۔ اس میں پاکیزہ اخلاق اور نیکوکارانہ افعال کے مادے اس وقت تک جڑ نہیں پکڑ سکتے جب تک اس کے ظاہر و باطن کو زنگ خوردی اور زنگ ہوا وہوس سے پاک نہ بنا لیا جائے اور اس کے دل کی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۵.

زمین میں ایمان و ہدایت کا شجرہ طیبہ اس وقت تک نشو و نما اور ثمر نہیں پاسکتا جب تک کہ اس میں سے غرور و وساوس وادہام ہوائے نفس اور فانی لذتوں کی ہولناکیاں کھرچ کر باہر نہ پھینک دی جائیں۔

تخلیہ و تحلیہ......اس صورت میں قدرتی طور پر انسانی تہذیب و تربیت کے دو عمل قرار پائے جاتے ہیں، افعال اور تروک یعنی کچھ کرنے کی چیزیں جو اس سے کرائی جائیں گویا اس کے نفس میں بھری جائیں اور کچھ بچنے کے چیزیں جو اس سے چھڑائی جائیں گویا اس کے نفس میں سے نکالی جائیں کرنے کی چیزوں سے اس کا نفس خیر و خوبی سے آراستہ ہوگا اور بچنے کی چیزوں سے اس کا نفس شر اور شیطنت سے پاک ہوگا۔ اس طرح تربیت انسانی دو عملوں کا مجموعہ بنتی ہے ایک تحلیہ اور ایک تخلیہ (یعنی خالی کرنا اور بھرنا) تخلیہ کے ذریعے اس رذائل نفس سے پاک کیا جاتا ہے اور تحلیہ کے ذریعے اس کو فضائل سے آراستہ کیا جاتا ہے جب تک کہ دونوں مثبت اور منفی عمل اس میں جاری نہ کئے جائیں نہ ان کی تہذیب مکمل ہوسکتی ہے اور نہ وہ سعادت ورشد کے نور سے روشن ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت خداوندی جو انسان کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے، دو ہی اجزاء سے مرکب ہو کر نازل ہوئی ہے، ایک امر، اور ایک نہی یعنی ایک حصہ اس میں مامورات کا ہے جن کے کرنے کا امر کیا گیا ہے تاکہ نفس کو اس کی سعادت ملجائے اور ایک حصہ منہیات کا ہے، جن سے بچنے کا اسے پابند کیا گیا ہے، تاکہ نفس کی شقاوت دور ہو۔ پس مامورات کو از قسم افعال سمجھو اور منہیات کو از قسم تروک، یہی مامورات نیکیاں ہیں جن کا نوعی اور اصل نام شریعت کی زبان میں معروف ہے اور یہی منہیات بدیاں ہیں۔ جن کا نوعی اور اصولی نام اصطلاح شرع میں منکر ہے اور یہیں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغی اصطلاح بنتی ہے۔ جسے سب پہچانتے ہیں۔

اور قرآن نے جابجا اس کی تاکید کی ہیں، کہیں اس کا امر کیا ہے۔ ﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ ① ''اچھی باتوں کا حکم کرو اور برائیوں کو روکو اور کچھ تکلیف پہنچے اس پر صبر کرو۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے''۔ کہیں امت کی خیریت اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر دائر کردی ہے۔ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② ''ان تمام امتوں میں تم بہترین امت ہو جو تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے، بھلائیوں کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو''۔ کہیں رفعت و برتری اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرار دیا گیا ہے فرمایا گیا کہ ﴿اَلنَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ③ ''نبی امی کہ جس کی بات وہ تورات و انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو اچھی باتوں کا حکم کرتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے''۔

① پارہ: ۲۱ سورۃ لقمن، الآیۃ: ۱۷۔ ② پارہ: ۴ سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۱۰۔

③ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۷۔

نظام سعادت ..... شریعت کے یہ تمام مامورات یا معروفات جس کا شمار نیک افعال میں ہے، اصلاح شریعت میں ان کے افعال کا نام بر ہے اور وہ تمام منہیات یا منکرات جو از قسم تروک ہیں ان سے بچنے کا اصطلاحی نام تقویٰ ہے اس لئے گویا پوری شریعت کا خلاصہ برو تقویٰ نکل آتا ہے جس پر انسانی سعادت کا نظام قائم ہے۔

اگر افعال بر یا امور خیر کو معطل کر دیا جائے تو حصول خیر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا جس کو شرعی زبان میں اثـــــم کہتے ہیں اور یہ اثم یا گناہ ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے اور اگر تقویٰ کو معطل کر دیا جائے تو دفع شر کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ جس کا اصطلاحی نام "عُـدْوَان" ہے (یعنی حدود سے تجاوز اور زیادتی) اور اللہ کی قائم کی ہوئی ان حدود سے تجاوز کرنا ہی تمام فساد انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کی جڑ ہے۔ پس کوئی انسان محض برے یا نیک کاموں سے کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس میں تقویٰ کے تروک نہ ہوں اور کوئی فرد بشر محض تروک تقویٰ سے کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک اس میں بر (نیکی) کے افعال اور تاثیرات نہ ہوں۔

اب چونکہ بر و تقویٰ نیکی اختیار کرنے اور برائیوں سے بچنے کے اس مثبت و منفی عمل کے مجموعی نظم ہی سے دین اور تہذیب و تمدن کا نظام استوار ہوتا ہے، اس لئے شریعت اسلام نے ان دونوں میں باہمی تعاون کی اور انکی اضداد یعنی اثم و عدوان سے عدم تعاون کی دعوت دی ہے۔ قرآن حکیم نے یہ ساری بنیادی تفصیلات بلکہ پوری شریعت کے امر و نہی کے نظام کو ان دو جامع اور معجزانہ جملوں میں ادا کر دیا ہے جن سے ان انواع کے یہ اصطلاحی نام بھی متعین ہو جاتے ہیں۔ ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [1] "تعاون کرو نیکی اور تقویٰ پر اور گناہوں اور سرکشی پر تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والے ہیں"۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ بر و تقویٰ کے یہ افعال و تروک محض ان کے نظم (الفاظ) کی جوہری خوبی اور برتری سے انسانوں میں قائم نہیں ہو سکتے، جب تک کہ خود انسانوں میں بھی بر و تقویٰ کو قبول کرنے اور ان سے اثر پذیر ہونے کا مادہ اور صلاحیت نہ ہو۔ اور اس میں ایسی قوتیں رکھی ہوئی نہ ہوں جو اس بر و تقویٰ کے جذب کرنے پر جھکی ہوئی ہوں اور اسے برداشت کریں جس سے نفس انسانی پر بر و تقویٰ کا رنگ چڑھ سکے، ورنہ اگر اندرونی قابلیت کے بغیر ہی بر و تقویٰ کا خطاب صحیح ہوتا یا محض بر و تقویٰ کے شرعی نظام کو خوبی اور برتری ہی نفوس میں اسے جاگزیں کر دیا کرتی تو حیوانات آخر اس تکلیف شرعی سے الگ کیوں رکھے جاتے؟ ان کو بر و تقویٰ کا مکلف نہ بنائے جانے کی اس کے سوا وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ان میں بار اور متقی نیک اور پرہیزگار بننے کی یا بر و تقویٰ قبول کرنے کی کوئی استعداد اور کوئی قوت موجود نہیں اس لئے محض بر و تقویٰ کے شرعی نظام کا اعلیٰ اور منضبط ہونا ان کے لئے کارآمد نہیں، اس سے یہ نتیجہ نکل آنا قدرتی ہے کہ اگر خدا نے انسان کو بر و تقویٰ کا مکلف ٹھہرایا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں بھی بر و تقویٰ کے نظام کو

[1] پارہ: ٦ سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٢.

قبول کر لینے کی قوتیں بھی ہوں جن پر یہ نظام بد وتقویٰ اپنا عمل کرے اور انسان بارو متقی ۔ نیکوکار اور پرہیزگار بنے ،اسی طرح انسان میں اثم وعدوان کے مادے بھی ہونے ضروری ہیں جن سے وہ اثم وعدوان کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ ہوتا ہو اور شریعت اسے ان قبیح حرکات سے روکے، ورنہ اس میں ان گناہ کاریوں کے مادے ہی نہ ہوتے تو وہ کبھی بھی اثم وعدوان کا مرتکب نہ ہوسکتا اور ایسی صورت میں اسے اثم وعدوان سے باز رہنے کا حکم دیا جانا بالکل ایسا ہی حکم ہے جیسا کہ کسی جنگلی جانور شیر اور بھیڑیے کو کہا جائے کہ خبردار گناہ مت کرنا اور اثم وعدوان کا مرتکب نہ ہونا ۔ظاہر ہے کہ جیسے یہ حکم غیر حکیمانہ ہے ایسی ہی اثم وعدوان کے مادے کے بغیر انسان کو یہ حکم دیا جانا لغو اور لایعنی ہوتا ہے، جس سے اللہ کی شریعت بری ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان میں میں اثم وعدوان کے مادے بھی ہوں اور وہ ان قبیح حرکات کا مرتکب ہوسکتا ہو بلکہ ہوتا ہو اور پھر اسے روکا جائے جس سے وہ اپنے اختیار سے خود رکے، تاکہ یہ رکنا شریعت کے لئے حکیمانہ فعل ثابت ہو اور رکنے والے کے لئے امر حسن باعث اجر و کمال بنے ۔

ایمان و امانت ......اس اصول کے بعد سمجھئے کہ انسان میں جو قوت افعال بر کا تحمل کرتی ہے بلکہ افعال بر کا مصدر ہے جس سے یہ افعال صادر ہوتے ہیں ان کا نام شریعت کی اصطلاح میں امانت ہے اور جو قوت تقویٰ کا بوجھ اٹھاتی ہے اور اس سے متقیانہ تروک کا ظہور ہوتا ہے اس کا نام شریعت کی زبان میں حیاء ہے ۔ پس امانت امر حسن اور اچھے کام کی رغبت کے مادے کا نام ہے اور حیا امر قبیح سے انقباض کے مادہ کا نام ہے ۔

پس ایمان اور اس کے سارے عملی شعبے عبادۃ، اطاعۃ، تفویض وغیرہ درحقیقت امانت کے کندھوں پر سوار ہو کر آگے بڑھتے ہیں ۔ اگر امانت نہ ہو یعنی دل میں ان امور حسنہ کی رغبت وقبول کا مادہ ہی نہ ہو تو آدمی نہ ایمان قبول کر سکتا ہے نہ عمل صالح نہ دین دیانت ۔

پس امانت کی وہی نوعیت ہے جو رنگریزوں پھٹکری کی ہوتی ہے کہ وہ ہر رنگ کے لئے زمین ہے اگر رنگ کو پھٹکری نہ دی جائے تو کوئی رنگ بھی نہ کپڑے پر چڑھ سکتا ہے نہ کھل سکتا ہے ۔یا جیسا کہ عطاروں میں تل کے تیل کو ہوتی ہے کہ ہر خوشبو کے لئے یہ سادہ تیل زمین ہے جو گلاب، چمبیلی اور کیوڑہ ہر خوشبو کو قبول کر لیتی ہے، اور مختلف عطر بن جاتے ہیں ۔ اگر یہ زمین (تل کا تیل) نہ ہو تو کوئی عطر تیار نہ ہو ۔ٹھیک اسی طرح امانت زمین ہے، ایمان اور ایمانیات کے لئے جس پر ایمان کا رنگ چڑھ جاتا ہے یا ایمان اور ایمانیات کی خوشبو میں جم جاتی ہیں، اگر قلب میں یہ امانت کا مادہ نہ ہو تو نہ ایمان ہوتا نہ ایمانیات، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ۔لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ ...... ''اس میں ایمان ہی نہیں جس میں امانت نہ ہو'' ۔

پس ایمان و ایمانیات کو امر حسن اور مرغوب سمجھوانے والی طاقت اور پھر اسے جذب کرنے والی قوۃ یہ امانت ہی کی قوۃ ہے ۔امانت کی ضد بددیانتی اور خیانت ہے جس کے معنی ہیں امور خیر کی رغبت نہ کرنا انہیں مستحسن نہ سمجھنا اور قبول نہ کرنا اور نتیجے کے طور پر لہو ولعب اور خرافات میں مبتلا رہنا اور زندگی کو برباد کر دینا ۔اس خیانت کی قوت کو جو

امور خیر کو بالا بالا دفع کر دیتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں فتنہ کہتے ہیں جو در حقیقت امانت کی ضد ہے۔ پس امانت، ایمان اور عمل صالح کو جذب کرتی ہے اور فتنہ اسے دفع کرتا ہے۔ فتنہ کا حاصل بددیانتی، اور خیانت ہے اور خیانت امر خیر میں ہوتی ہے۔ امر شر کو دفع کرنے کا نام خیانت نہیں۔ ایمان کے نظام صالح اور حسن معاشرت میں رخنہ اندازی اور اس کے نظام میں افراتفری پھیلانا ہی خیانت ہے جسے فتنہ کہتے ہیں۔ پس بر ہونے کی قوت کا مادہ امانت ہے اور ہر نیکی کو دفع کرنے کے اور توڑنے درہم برہم کرنے کے مادہ کا نام فتنہ ہے اور دونوں مادے انسان میں موجود ہیں۔ شریعت مادہ امانت کو اجاگر کرنے اور مادہ فتنہ کے استیصال کے لئے آئی ہے۔

جہاد و قتال انسانوں کے گلے کاٹنے کے لئے نہیں رکھا گیا بلکہ دفع فتنہ کے لئے رکھا گیا ہے۔ تا کہ کوئی فتنہ زدہ قوم نظام صالح کو برباد نہ کر پائے۔ یہ جدا بات ہے کہ اس کی بربادی اور رخنہ اندازی انسانوں ہی کے ہاتھوں ہوا کرتی ہے تو وہ فتنوں کو مٹانے والی طاقت بالآخر ان ہی کی گردنوں پر مسلط ہوتی ہے ورنہ اصل مقصود دفع فتنہ ہے قتل انسان نہیں۔ چنانچہ یہی فتنہ زدہ انسان اگر فتنہ سے ہٹ کر امانت پر آ جائیں تو قتال فوراً بند ہو جاتا ہے۔ بہر حال امانت امور حسنہ کے امتحان کی قوت ہے اور فتنہ امور حسنہ کے استہجان و تخریب کی قوت ہے۔

حیاداری اور فحش کاری..... ترک تقویٰ کو بروئے کار لانے والی قوت جو انسان کے باطن میں رکھی گئی ہے حیاء ہے جس سے انسان امر قبیح کے ارتکاب سے رکتا اور منقبض ہوتا ہے جس سے قبائح متروک ہو جاتے ہیں اگر حیاء کا مادہ نہ ہو تو امور قبیحہ سے رکنے بچنے کی صورت نہ ہو۔ پس منکرات کو برداشت کرنے والی اور بچانے والی طاقت حیاء ہے حیاء کی عدم موجودگی میں نہ آدمی قبیح کو قبیح کہتا ہے اور نہ اس سے رک سکتا ہے اس لئے فرمایا گیا إِذَا فَاتَكَ الْحَيَآءُ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ ① "جب تجھ سے حیاء جاتی رہے تو جو تیرا جی چاہے کر"۔ اسی لئے حدیث میں اَلْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهُ ② (حیاء کل کی کل خیر ہی خیر ہے) فرمایا گیا اور اسی لئے حیاء کو ایمان کا عظیم ترین شعبہ قرار دیا گیا ہے کہ خلاف ایمان حرکات سے بچاؤ اس قوت کے بغیر میسر آنا ممکن نہ تھا۔

حیاء کی ضد فحش ہے جو ہر امر قبیح پر بے حیائی اور بے غیرتی کی بات کو بروئے کار لاتی ہے اور حیاء دارانہ امور کا نظام گڑبڑ ہو جاتا ہے، زنا کاری، شراب خوری، جوئے بازی، نقب زنی، کذب بیانی اور بدگوئی وغیرہ سارے قبائح پر آمادگی اور ان کا ارتکاب اسی قوت فحش سے ہوتا ہے۔ پس حیاء منکرات سے دور کرتی ہے اور فحش منکرات کے قریب لاتا ہے۔ پس منکرات شرعیہ کا مصدر اور سرچشمہ فحش ہے اور ان سے بچاؤ کا سرچشمہ اور مصدر حیاء ہے۔

خلاصۂ کلام..... خلاصہ یہ نکلا کہ امور خیر یعنی معروفات کی رغبت و تعمیل کا سرچشمہ امانت ہے اور ان کی خلاف ورزی اور درہمی برہم کا سرچشمہ فتنہ ہے اور تمام امور شر یعنی منکرات سے بچاؤ کا سرچشمہ حیاء ہے اور ان کے

① الصحیح للبخاری کتاب الأدب، باب اذا لم تستحی فاصنع ما شئت. ج ۱۹، ص: ۷۹.

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان وافضلها، ج ۱ ص ۱۴۳.

ارتکاب اور سیہ کاری کا سرچشمہ فحش ہے۔ پس امانت و فتنہ حیاء و فحش کی یہی چار قوتیں ہیں جس سے معروف منکر اور بر و تقویٰ کا تعلق ہے۔ اول دو طاقتوں کا تعلق افعال بر کے کرنے اور چھوڑنے سے ہے اور آخر کی دو قوتوں کا تعلق متروکات تقویٰ کے ترک اور ارتکاب سے ہے۔ اس لئے شریعت الٰہی کا کام جو بنی آدم کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے۔ یہی ہوسکتا تھا کہ وہ افعال بر کا امر کر کے امانت کی طاقت کو مضبوط بنائے اور اس کی ضد فتنہ کا استیصال کرے اور متروک تقویٰ سے نہی کر کے حیاء کی طاقت کو مستحکم بنائے اور اس کی ضد فحش کا استیصال کرے کہ یہی عین عدل و احسان ہے۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ ① ''اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا' اور روکتا ہے برے کاموں اور منکر سے' اور نصیحت کرتا ہے تم کو شاید کہ یاد کرو''۔

بر و تقویٰ سے انقلاب باطن...... پس یہ امر بالمعروف یا امر بالبر براہ راست قوت امانت پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے آدمی امین بنتا ہے اور امین بن کر ایماندار ہوتا ہے' ایماندار ہو کر مامون ہوتا ہے جس سے خیر کے عناصر ابھر جاتے ہیں اور فتنے دب جاتے ہیں اور نہی عن المنکر یا ہدایت و تقویٰ براہ راست قوت حیاء پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے آدمی باحیاء بنتا ہے اور حیاء دار بن کر برائیوں اور منکرات سے نفرت کرنے لگتا ہے جس سے شر کے عناصر دب جاتے ہیں اور ایمانداری کے موانع دور ہو کر ایمان اور عمل صالح کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

الحاصل بر و تقویٰ کے عمل سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تا کہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بر و تقویٰ اور لائحہ انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے کن قوتوں کو ابھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پست کرتا ہے' اور اصلاح کے اسی مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جس سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔ الحاصل بر و تقویٰ کے عملی سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تا کہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بر و تقویٰ اور لائحہ افعال و متروک انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے کن قوتوں کو ابھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پست کرتا ہے اور اصلاح کے اس مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جس سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔

اب افعال و متروک یا بر و تقویٰ (احکام اور امتناعی احکام نیکوکاری اور پرہیزگاری) کے اصولی نقشہ کے عملی پہلو پر نظر ڈالو۔ تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں ایمان باللہ۔ اخلاص للہ، ذکر اللہ، تذکر بایام اللہ، تلاوت کلام اللہ، تعظیم شعائر اللہ، جہاد فی سبیل اللہ اور حضور مع اللہ یا (نماز و دعا اور مجاہدہ و مراقبہ وغیرہ) ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں خدمت خلق اللہ، انفاق فی سبیل اللہ، احسان للہ، اطعام لوجہ اللہ، اخوۃ فی اللہ اور النصح لدین اللہ یعنی عام خیر خواہی بی

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰۔

نوعِ انسان عدل وانصاف وفاءِ عہد اور ایفائے عہد وغیرہ سب کے سب امورِ بر کے اجزاء ہیں جن کے کرنے سے انسانی نفس سربلند مقبول اور محبوبِ خدا و خلق بنتا ہے عند اللہ اس کی وجاہت قائم ہوتی ہے، اور عند الناس اس کی بالادستی اور برتری مسلّم ہو جاتی ہے جس سے وہ دنیا و آخرت کے بلند مناصب و مقامات کا حق دار ہو کر ابرار و اخیار کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن بر (نیکوکاری) کا یہ سارا لمبا چوڑا سلسلہ اس وقت تک کارگر اور موثر نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ نفسِ انسانی میں سے نفسانیت اور اس کے رذائل کا خاتمہ نہ ہو جو اس امورِ بر کے حق میں سمِ قاتل اور قوی مانع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کسی طرح بھی انسان کو ان سربلندیوں پر نہیں پہنچنے دیتے مثلاً جب تک انسانی نفس سے باہ کے رذائل جیسے حرص و ہوا، ہوس رانی اور بدمستی سے کھانے پینے کی لذتوں میں غرقابی جنسی خواہشات اور نفسانی عیش میں ہمہ وقت سرگردانی کے جراثیم خارج نہ کئے جائیں یا جاہ کے رذائل جیسے ہوسِ اقتدار، نمائشی وقار کی ہمہ وقت بھوک، جذباتِ انانیت، خودی اور ہوسِ ریاست و امارت زائل نہ ہو سکے۔

نفسانیت کا شر دور کئے بغیر ملکیت کی خیر قرار نہیں پکڑ سکتی...... خلاصہ یہ نکلا کہ ایک طرف زن، زر، زمین کی جاہ پسندانہ بدمستیوں اور دوسری طرف نفس و ہوائے نفس کی جاہ پسندانہ خودی، خود بینی اور خود آرائیوں کا سودا انسان کے سر سے نہ نکالا جائے یا کم از کم ان کے ترک کا خوگر نہ بنایا جائے اس وقت تک انسان پر اعمالِ بر کا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ اگر بتکلف چڑھ بھی گیا تو وہ جڑ نہیں پکڑ سکتا اور اگر اتفاقاً کچھ جم بھی گیا تو پختہ نہیں رہ سکتا۔ ایک ہی شوب میں اتر جائیگا۔

بہرحال نفس میں روحانیت اور ملکیت کی خیر اس وقت تک جاگزیں نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں سے نفسانیت کا یہ جبلی شر کھرچ کر باہر نہ پھینک دیا جائے، بالفاظ دیگر افعال بر کی قلعی سے اس وقت تک نفس پر چمک دمک نہیں آسکتی جب تک کہ تروک تقویٰ سے اس کا رنگِ خودی اور زنگِ انانیت اتار نہ جائے اور اس تک قلب کے آئینہ میں انوارِ الٰہیہ منعکس نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس صیقل کر کے شفاف نہ کر لیا جائے ؎

دل را اگر تو صاف کنی ہچو آئینہ   در دے جہاں دوست بہ بینی چو آئینہ

عباداتی سال کا آغاز و اختتام...... اس لئے شریعت نے اپنے آغازِ کار سے لے کر انجامِ کار تک افعال و تروک اور (مثبت اور منفی احکام) کا رشتہ ملا جلا رکھا ہے۔ اور افعالِ بر کو تروک تقویٰ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہونے دیا چنانچہ شریعت کا آغاز نزولِ قرآن سے ہوتا ہے اور نزولِ قرآن ماہِ رمضان سے ہے۔ اس لئے ماہِ رمضان گویا شریعت اور اس کی عبادتوں کا سنِ آغاز ہے بالکل اسی طرح جیسے اداروں و کارخانوں اور تعلیم گاہوں وغیرہ میں سال کا آغاز کسی خاص مہینے سے مقرر کر لیا جاتا ہے، اور اسی ماہ سے اس کے کاروبار کا آغاز سمجھتے ہیں اور اسی سے رجسٹر دفتر اور بہی کھاتے شروع کرتے ہیں مثلاً اسلامی اداروں میں حسابی سال عموماً محرم سے شروع کر کے ذی الحجہ پر ختم کیا جاتا ہے تعلیم گاہوں میں تعلیمی سال عموماً شوال سے شروع کر کے رمضان میں ختم کیا جاتا ہے۔ انگریزی اداروں میں دفتر

سال جنوری سے شروع کر کے دسمبر پر ختم کیا جاتا ہے، ایسے ہی اسلامی شریعت کا دینی اور عباداتی سال ماہِ رمضان سے شروع ہو کر شعبان پر ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نزولِ قرآن جو اساسِ شریعت ہے، ماہِ رمضان میں ہوا ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ① ''رمضان کا مہینہ وہ ہے کہ اس میں قرآن اترا ہے''۔

اسی لئے رمضان گویا عباداتی سال کا نقطۂ آغاز نکلا جس سے انسان کا ایمانی نشو ونما متعلق ہے۔ اور شعبان نقطۂ اختتام ثابت ہوا۔ جو اس ایمانی شباب کے بلوغ کی حد ہے۔ اس لئے بنص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے مہینے میں عمروں کے اختتام کا اعلان عالمِ غیب میں ہو جاتا ہے۔ جو در حقیقت اعمال کے انقطاع کا اعلان ہے کہ عمل کا تعلق عمر سے ہی ہے، بلکہ عمر دی ہی گئی ہے عمل کے لئے۔ اس لئے جس آن یہ زندگی ختم ہوگی، اسی آن انسان کا عمل، رزق اور کسب وغیرہ سب منقطع ہو جائے گا۔ یوں بھی ہر سال پچھلے رزق کا حساب ختم کر کے نئے سال کے نئے روزی رزق اس کا ماہ میں تعین کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے۔ پس شعبان اعلان اختتامِ طاعات و انقطاعِ اعمال کا مہینہ نکلا جسے عباداتی سال کا نقطۂ اختتام کہنا چاہئے۔ جس طرح کہ رمضان اس کا نقطۂ افتتاح و آغاز تھا۔

ماہِ رمضان نیکیوں کا مرکزِ اتصال......اب رمضان کو لیجئے تو اس میں افعالِ بر اور تروکِ تقویٰ کو باہم ایک دوسرے سے اس طرح گوندھ دیا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہلالِ رمضان نظر آتے ہیں اول شب ہی سے اس ماہ کا افتتاح دو چیزوں سے کیا گیا ہے جو اعمالِ بر کی جان ہیں یعنی تلاوتِ قرآن اور نمازِ تراویح۔ یہی دو چیزیں ہیں جس سے انسانی نفس کو قربِ خداوندی اور لذتِ وصال کی دولت میسر آتی ہے۔ نمازِ تراویح سے تو انتہائی قرب ہوتا ہے۔ کیونکہ بنص قرآن و بتصریحِ حدیث سجدہ ہی کمالِ قرب کا ذریعہ ہے جو افعالِ صلوٰۃ کا اصلی مقصود ہے۔

ارشادِ قرآنی ہے ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ ② ''سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ''۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ''اِنَّ اَقْرَبَ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ'' ③ ''بے شک بندہ اپنے رب سے قریب تر اس وقت ہوتا ہے کہ وہ سجدے میں ہو''۔ اور قرب بمعنی اتصال ہی نہیں بلکہ بمعنی الصاق بھی ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تصریح ہے کہ بحالتِ سجدہ انسان کا سر اللہ کے قدموں پر گرتا ہے۔ پس اقربیت یعنی کمالِ قرب دیکھو تو نماز سے ملا اور پھر اس کمالِ قرب کی بھی تکمیل اور باثمرہ ہو جانا روزانہ کے چالیس سجدوں سے ہو جائے گا۔ کیونکہ بیس رکعت میں چالیس سجدے ہوتے ہیں اور چالیس کے عدد کو تکمیلِ شے میں خاص دخل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو جب وحی کے ملنے کا وقت آیا تو چالیس دن کا چلہ کرا کر مناسبت مع الغیب کی تکمیل و تقویت کرائی گئی۔ اور بنص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلب سے حکمت کے چشمے پھوٹ نکلے یعنی قلب کی ایک خاص علمی تکمیل کے لئے چالیس دن کا مخلصانہ عمل تجویز فرمایا گیا جس سے حضرات صوفیاء کرام نے چلہ کشی کا اصول اخذ کیا۔ غرض چالیس کے عدد

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۵۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱۹۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقول فی الرکوع والسجود، ج: ۳، ص: ۱۲۹۔

کو تکمیل حال و خیال میں خاص دخل ہے۔اس لئے رمضان کی تراویح میں روزانہ چالیس سجدے پیاپے کرائے گئے۔

بندہ و خدا میں ربط باطنی...... پھر اس کمال قرب کو بے ثمر نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ اس کے ساتھ کمال وصال کی تکمیل تلاوت قرآن سے کی گئی کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن کو اللہ کے باطن کی چیز فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے"تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ" ① ''قرآن سے برکت حاصل کرو، کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔اس سے واضح ہوا کہ قرآن اللہ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے جو تلاوت کے ذریعے ہمارے اندر پہنچ جاتی ہے یعنی اس کے باطن سے چلتی ہے اور ہمارے باطن میں پہنچ جاتی ہے، جس سے اللہ اور اس کے بندے کے درمیان باطنی ربط پیدا ہوتا ہے۔

کامل ترین ملاپ...... ادھر ایک دوسری حدیث میں تلاوت قرآن کو محادثہ مع اللہ یعنی اللہ سے باتیں کرنا بتلایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ بات کر کے متکلم اور مخاطب اپنا اپنا مافی الضمیر دوسرے تک پہنچا دیتے ہیں، جسے علمی قرب کی انتہائی منزل کہنا چاہئے۔

پس! تلاوت کے ذریعے ہمارے اور اس کے باطن کا ریل میل کچھ اس شان سے ہو جاتا ہے کہ اس سے زیادہ توافق اور تواصل کی دوسری صورت نہیں ہو سکتی کیونکہ جسمانی میل میلاپ اور وصل صرف اطراف بدن کے مل جانے کی حد تک ہوتا ہے ایک جسم دوسرے جسم میں سما نہیں سکتا، گویا جسمانی وصال بھی محض سطحی ہوتا ہے۔ اور اس میں لذت بھی اگر ہوتی ہے تو سطحی اور عارضی، لیکن روحانی ملاپ ہے کہ جسمانی میل ملاپ تو بجائے کود ہے، روحانی میل ملاپ تو بجائے خود ہے، روحانی میل ملاپ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس وصل و وصال اور میل ملاپ کو بھی اگر دیکھا جئے تو وہ بھی وسیلہ ہی ہے۔ اصل مقصد قبول ہے نہ کہ وصول۔ اگر وصول ہو اور قبول نہ ہو تو وہ وصول بے کار ہے۔ بادشاہ کے یہاں وصول تو شاگرد پیشہ اور کم مرتبہ ملازمین کو بھی ہو جاتا ہے مگر قبول نہیں ہوتا وزیر اعظم اور امراء شاہی اگر واصل ہوتے ہیں تو یہ محض وصول ہی نہیں بلکہ ان کا قبول بھی ہوتا ہے۔

اعترافِ قبولیت...... سو اس تلاوت تراویح میں جبکہ فاتحہ کی تلاوت ضروری ہے اور ہر رکعت میں ضروری ہے۔ خواہ بلا واسطہ ہو یا بواسطہ امام، اور اس کی ایک ایک آیت پر ادھر سے قبولیت کا بروقت اعتراف واعلان کیا بھی جاتا ہے۔ بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری تعریف کی) وہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو فرتے ہیں اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ میرے بندہ نے میری ثناء وصفت بیان کی۔ جب یہ کہتا ہے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو فوراً فرماتے ہیں مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی) جب یہ کہتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو فرماتے ہیں هٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ (یہ میرا اور بندہ کے درمیان کا معاملہ ہے) جب وہ سوال کرتا ہے اور اِهْدِنَا سے آخر تک پڑھ جاتا ہے تو

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

فوراً فرماتے ہیں۔ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ (میرے بندہ کے لئے وہ سب کچھ ہے جو اس نے مانگا ہے) تو یہ بروقت اقرار و اعتراف اور بندہ کو اپنا کہہ کر اس کی بات کو سراہنا ہی قبول ہے جس کے لئے وصول کی تمنا کرتے ہیں۔ ①

بشری عروج کا نقطۂ کمال ...... پس تراویح و تلاوت میں ابتدائی مرتبہ قرب اتصال کا ہے جو نماز سے حاصل ہوتا ہے پھر قرب سے وصول و وصال کا ہے جو تلاوت سے حاصل ہوتا ہے اور پھر وصول سے قبول و رضا کا ہے جو تلاوت خاص کے مکالمہ سے حاصل ہوتا ہے غرض تراویح و تلاوت سے حضرت حق کی ہم نشینی، معانقہ اور مکالمہ، تراضی طرفین کی دولت حاصل ہو جاتی ہے جس سے آگے بشری عروج و کمال کا کوئی اور مقام نہیں۔ لیکن نظر اس پر کیجئے کہ جہاں رمضان کی راتوں میں نماز و تلاوت سے وصول و قبول کی لذتیں دی جاتی ہیں۔ وہیں اس مبارک مہینہ کے دنوں میں نفس کی ہوسنا کیوں اور نفسانی لذات کو بھی قوت سے ترک کرایا جاتا ہے۔ کھانا پینا بھی ترک، مقاربت نسواں بھی بند، حتیٰ کہ ان چیزوں سے خالی لذت لینا بھی ناپسندیدہ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ شب کی غیر معمولی لذۃ وصول و قبول، جو افعال بر میں سے فعل تراویح و تلاوت سے ملتی تھی بغیر ان تقوائی تروک کے میسر آنی ناممکن تھی۔

پس رمضان کے مہینہ میں دن بھر روزہ کے ذریعہ جو مجموعہ تروک ہے نفس کو مانجھا اور صاف کیا جاتا ہے اور شب کو اس صاف شدہ ظرف پر تلاوت و تراویح سے جو مجموعہ افعال بر ہے قلعی کی جاتی ہے جس سے وہ چمک اٹھتا ہے اور اس میں قرب و اتصال اور قبول و وصال کی اس چمک دمک سے انوار خداوندی منعکس ہونے لگتے ہیں گویا نفس انسان۔ منِ نفس رحمان نظر آنے لگتا ہے۔ پس ماہ رمضان جیسے برکا مہینہ ہے ویسے ہی تقویٰ کا بھی مہینہ ہے۔ اور جیسے اس میں اثم سے بچاؤ میسر آتا ہے ویسے ہی اس میں عدوان سے بچاؤ کی توفیق ملتی ہے۔

روزہ اور ماہِ روزہ کا ثمر ...... اس لئے قرآن حکیم نے جب رمضان کے روزوں کا ذکر کیا تو اس کا سب سے بڑا ثمرہ تقویٰ بتلایا ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ② ”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے تم سے پچھلوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ“۔ اور جب خود ماہ رمضان کا ذکر کیا جس میں دنوں کے ساتھ راتیں بھی شامل ہیں تو نزول قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا سب سے بڑا ثمرہ نور ہدایت، نور دلائل اور نور معرفت ظاہر فرمایا جو درحقیقت انسانی نفس کی چمک دمک اور قلعی کا سب سے اعلیٰ سامان ہے۔ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ ③ ”مہینہ رمضان کا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کے کھلے دلائل کا مجموعہ اور قوت تمیزی کا علم ہے“۔ گویا روزہ کا ثمرہ تقویٰ اور ماہ کا ثمرہ بر نکلا اور اس طرح قرآن کریم سے ماہ رمضان بر و تقویٰ کا مہینہ ثابت ہوا جس سے اثم و عدوان کا خاطر خواہ دفعیہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، ج: ٢، ص: ٣٥٢.

② پارہ: ٢، سورة البقرة، الآية: ١٨٣. ③ پارہ: ٢، سورة البقرة، الآية: ١٨٥.

اثم وعدوان کے چشمے سوکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ نفس کا ذخیرہ پانی بند ہو جاتا ہے۔ اور شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں جو اثم وعدوان پر ابھارتے تھے۔ ایک دانا دشمن کی حیثیت سے، اور ایک نادان دشمن کی حیثیت سے ظاہر ہے کہ دونوں دشمنوں کے اسیر ہو جانے پر اثم وعدوان کا دفعیہ قدرتی تھا۔

صیام و قیام کا باہمی تناسب...... اس لئے روزہ و تلاوت تراویح یعنی صیام و قیام کا تناسب اور ایک سے دوسرے کا رابطہ بھی واضح ہو گیا کہ ایک تخلیہ کا مقام ہے یعنی روزہ جو انسان کو رذائل نفس سے پاک کرتا ہے اور ایک تحلیہ کا مقام ہے یعنی قرآن اور تراویح جو نفس انسانی کو چمک دار اور نورانی بناتا ہے۔ اس لئے قیامت کے دن صیام و قرآن کی شفاعت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں بطور قرین وعدیل کے ذکر فرمایا گیا ہے۔

خلاصہ مضمون حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن صیام و قرآن دونوں مل کر بندہ کے شفاعت کریں گے۔ روزے کہیں گے کہ خداوندا! ہم نے دن بھر اس بندہ کو کھانے پینے اور شہوانی لذتوں سے محروم رکھا تو اس کے حق میں ہماری شفاعت کو قبول فرما۔ قرآن کہے گا۔ خداوندا! میں نے اس بندہ کو راتوں میں نیند اور آرام سے محروم رکھا تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی شفاعت کا انجام سوائے قبولیت شفاعت کے دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن کلام الٰہی اور صفت خداوندی ہے۔ تو اس کی شفاعت ایک صفت الٰہی کی شفاعت ہے، جو ذات سے جدا نہیں۔ اس لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ خود ہی اپنی بارگاہ میں شفاعت فرمائیں گے۔ تو کون ہے کہ اس شفاعت کو رد کر سکے؟ اور وہ خود کیسے رد فرمائے گے

چوں خدا از خود سوال و کد کند   پس دعائے خویشتن چوں رد کند

ادھر روزہ کو تمام عبادات میں حق تعالیٰ نے اپنی چیز فرمایا ہے۔ اور یہ کہ میں ہی خود اس کا بدلہ دوں گا اور ظاہر ہے کہ اپنی چیز کو آتا کہہ کر کون بے آبرو کیا کرتا ہے کہ اسے رد کرے۔ اس لئے صیام و قرآن کی شفاعتیں رد ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس سے صاف واضح ہوا کہ شریعت نے اپنے عباداتی سال کا افتتاح افعال و تروک دونوں سے کیا ہے جو تربیت انسانی کے دو بازو ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ دنوں میں ترک کو اصل رکھا اور افعال اس کے ضمن میں رکھے، اور راتوں میں افعال کو اصل قرار دیا اور تروک اس کے ضمن میں بقدر ضرورت آ جاتے ہیں جو بوقت تلاوت وصلوٰۃ قائم رہتے ہیں۔ اور اس طرح سے اس کی راتیں روشنی میں دنوں سے کم نہیں ہیں بلکہ لَيْلُهَا وَ نَهَارُهَا سَوَآءٌ کی مصداق ہیں۔

ہلالِ عید... جب رمضان کے یہ معدودے چند ایام اس شان سے پورے ہو جاتے ہیں کہ اس کے دن تروک میں مصروف اور اس کی راتیں افعال میں مشغول تو ہلال عید تکمیل عبادت کا مسرت بخش پیغام لے کر فضاءِ آسمان میں نمودار ہو جاتا ہے۔ گویا منجانب اللہ آسمان سے اطلاع دیتی ہے کہ اے بندگان الٰہی! تم نے وہ فرض پورا کر دیا جو ہلال رمضان نے تمہارے ذمہ عائد کیا تھا۔ تم نے اپنے دلوں کو نفسانی لذتوں (طعام و شراب اور مقاربت) سے بے نیاز رکھ کر خداوندی قرب و وصال کی لذتوں کو ترجیح دی اور اپنی راتوں کو لہو الحدیث اور قصہ کہانیوں میں گنوانے

کی بجائے خیر الحدیث اوراحسن القصص کے کہنے اور سننے میں مشغول رکھا اس لئے تمہیں ہلال عید کے نورانی حروف کے ذریعے مبارک بادوی جاتی ہے کہ تم کامیاب ہوئے اور منزل تک پہنچ گئے اس پر بندوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے قدرداں اور مشکور پروردگار کا جان و مال سے شکریہ ادا کریں چنانچہ عید کی صبح ہوتے ہی اولاً صدقہ فطر ادا کر کے مال سے اور پھر دوگانہ عید ادا کر کے جان و مال سے اپنے محسن رب اور منعم پروردگار کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے تیس دن کی یہ حقیر اور ناچیز قربانی قبول فرمائی اور دوران قربانی میں تو خصوصی طور پر لذت قرب ووصال سے نوازا۔ اور بعد تکمیل ہلالی حروف سے اپنی خوشنودی کا اعلان عام فرمایا۔

تتمۂ رمضان ...... پس عید درحقیقت رمضان کے افعال وتروک کا ایک عملی شکریہ ہے جو بندوں کی جانب سے جناب خداوندی میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس شکریہ پر حسب وعدہ الٰہی ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ ① (اگر تم شکر گزار ہو گے تو تمہاری نعمت میں اضافہ کروں گا) بسلسلہ اضافہ نعمت ششِ عید یعنی شوال کے ۶ روزوں کا مزید اضافہ کیا جاتا ہے جنہیں رمضان تو نہیں تتمہ رمضان کہا جائے گا۔ کیونکہ رمضان کی مدت ایک ماہ کی مدت جو ایک منضبط اور معتدل مدت ہے جس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔

سال سے کم اور ہفتہ سے زیادہ ایک درمیانی مدت ہے۔ اس میں اگر ایک دن کا بھی اضافہ ہو جاتا تو دوسرا ماہ لگ جانے سے رمضان کی مدت دو ماہ ہی کہلاتی۔ اور روزے ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کے کہلائے جاتے جو یقیناً طبائع پر بھی شاق گذرتے، مدت بھی معتدل نہ رہتی اور اس میں کسر بڑھ جانے سے مدت کا انضباط بھی فوت ہو جاتا۔ اس لئے روزہ کا ایک ماہ پورا کرا کر اور درمیان میں ایک دن خوشی اور کھانے پینے کا دے کر بطور تتمہ رمضان ۶ روزے اور دیئے اور وہ بھی غایت رحمت سے اختیاری دیئے گئے جن میں کوئی جبر واکراہ نہیں تا کہ بندوں پر بھاری بھی نہ ہو اور خدا کی طرف سے اس شکر گذاری پر حسب قانون الٰہی زیادت نعمت کا وعدہ بھی پورا ہو جائے۔ گویا اس طرح اس عباداتی سال کا افتتاح ۳۶ روزوں اور ۳۰ دن کی تراویح سے کر دیا گیا۔ یعنی ۳۶ تروک ۳۰ افعال سے انسانی عبادت کا سال شروع ہوتا ہے۔

عبادت کا ہمہ گیر نقطۂ آغاز ...... غور کرو تو رمضان میں عبادت کا یہ جمع شدہ ذخیرہ رمضان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ سال بھر تک یہی ذخیرہ توفیق و برکات کا کام دیتا ہے اگر یہ ذخیرہ اس ماہ میں جمع نہ ہوتا تو پورا سال عبادت سے بیگانگی اور برکات باطن سے محرومی میں بسر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصولاً ہر شے کے نقطۂ آغاز ہی میں اس کا انجام اور وسط پنہاں ہوتا ہے۔ وہ نقطہ پھیل کر وسط سے گذرتا ہوا انجام تک جا پہنچتا ہے یعنی آخر تک اسی کا نقطہ فیض کام کرتا رہتا ہے۔ مثلاً ہر کلمہ اور کلام کا نقطۂ آغاز حروف مقطعات (حروف تہجی) ہیں اس لئے ہر کلمہ وکلام اور لمبی سے لمبی عبارات میں فیض ان ہی حروف ہجا کا ہوتا ہے درخت کی ہر شاخ اور پھول پتی کا نقطۂ آغاز اس کا تخم ہے تو

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷۔

وہی تخم کی مادہ پھیل پھیل کر پھول پتیاں اور برگ و بار بنتا رہتا ہے۔ وہ نہ ہو تو نہ شاخ ہو نہ برگ و بار، گویا سارے برگ و بار درحقیقت اس تخم کا فیض ہوتی ہیں۔

اعداد کا نقطۂ آغاز واحد ہے وہی (ایک) مکرر سہ کرر ہو کر دو اور تین اور سوالاکھ بنتا رہتا ہے، وہ نہ ہو تو دو نہ ہوں نہ سو اور نہ لاکھ گویا ارب ہا ارب اور کھرب در کھرب فیض صرف ایک ہی کا ہوتے ہیں۔ خود بذاتہ کچھ نہیں، اس اصول پر سمجھو کہ عبادتی سال کا نقطۂ آغاز رمضان المبارک اور اس کے افعال و تروک ہیں۔ (جیسا کہ ابھی واضح ہوا) یہی ایک حصہ افعال و تروک کا ذخیرہ درحقیقت سال بھر کی عبادت کا نقطۂ آغاز ہے اس لئے یہی مادہ عبادت پورے سال کی عبادات کا مادہ ہے جو رنگ بدل بدل کر مختلف طاعات میں ظہور کرتا رہے گا۔ گویا سال بھر کی مختلف الانواع عبادتیں اور برو تقویٰ کے مختلف مظاہر اس ماہ کے صبر و استقامت کا فیض ہوتے ہیں، یہ نہ ہو تو سال بھر کی توفیق و برکت درجہ صفر میں رہ جائے۔ جیسا کہ روایات حدیث میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔

ماہِ رمضان کے اعداد کا اثر..... شاید اسی لئے اس ماہِ مبارک کے افعال و تروک کے اعداد کچھ ایسی مناسب سے رکھے گئے ہیں کہ برکۃً ہی نہیں عدداً بھی پورے سال پر پھیل گئیں۔ بلکہ ان کی ایک ایک اکائی دوسرے مہینوں کی دہائیوں کے برابر ثابت ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ آخر رمضان میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ کا ایک حصہ یہ ہے۔ ''یَاۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّکُمْ شَهْرٌ عَظِیْمٌ شَهْرٌ مُّبَارَکٌ شَهْرٌ فِیْهِ لَیْلَةٌ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِیَامَهٗ وَقِیَامَ لَیْلِهٖ تَطَوُّعًا مَنْ تَقَرَّبَ فِیْهِ بِخَصْلَةٍ مِّنَ الْخَیْرِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَةً فِیْمَا سِوَاهُ وَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَةً فِیْهِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی سَبْعِیْنَ فِیْمَا سِوَاهُ'' ① ''اے لوگو! تم پر سایہ گستر ہوا ہے ایک عظمت والا مہینہ ایک برکت والا مہینہ، وہ مہینہ جس میں ایک رات، ہزار رات سے بہتر ہے اللہ نے اس میں روزے فرض کئے ہیں اور قیام لیل (تراویح) نفل رکھی ہے جس نے اس مہینے میں کوئی بھی بھلائی کی بات کی تو وہ ایسا ہے کہ کسی شخص نے ماسوا رمضان کے (بقیہ سال میں) کوئی فریضہ ادا کیا۔ اور جس نے اس ماہ میں فریضہ ادا کیا مثلاً (روزے رکھے) تو وہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے غیر رمضان میں (بقیہ سال) میں ستر فریضے ادا کئے''۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اس ماہ کی نفل بقیہ سال کے فرض کے برابر ہے اور اس کا فرض بقیہ سال میں ستر فرائض کی برابر ہے۔ گویا بلحاظ برکت ہی نہیں بلکہ بلحاظ اجر اور عدد بھی اس مہینہ کی طاعت کی ایک اکائی دوسرے مہینوں کی طاعت کی دہائیوں کے برابر ہے۔ ماہ رمضان کے دنوں کو دیکھئے تو ان میں ۳۰ روزے رکھے گئے ہیں اور شریعت کی بخششیں بے کراں نے ایک نیکی کو دس نیکی کے برابر شمار کیا ہے۔ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ ②

اس اصول پر یہ ۳۰ روزے ۳۰۰ ہو جاتے ہیں۔ اور ادھر عید کے بعد شش عید جو بطور تتمہ و توابع رمضان کے ساتھ لاحق کئے گئے ہیں (گو بوجہ تسہیل و رحمت انہیں اختیار رکھا گیا اور جزو رمضان نہیں بنایا گیا) اصول مذکورہ

① شعب الایمان للبیهقی، فضائل شهر رمضان، ج:۸ ص: ۱۲۰ ② پارہ:۸، سورة الانعام، الآیة: ۱۶۰.

پر ۶۰ ہو جاتے ہیں تو رمضان کے اصلی اور ملحقہ روزوں کا مجموعہ بھی وہی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔ اور اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انہی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔ اور اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انعامی ۳۶۰ روزے سال بھر کے اور یہ ۳۶۰ دنوں کے مساوی ہیں اور رمضان کے یہ اصل اور توابع روزے پورے کر دینے والا سال کے تمام روزے رکھنے والا بن کر صائم الدہر بن جاتا ہے۔ اسی مضمون کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ ذیل میں ارشاد فرمایا ہے۔ جس کو حضرت انصاریؓ روایت فرما رہے ہیں "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ" ① "جس نے رمضان کے روزے پورے رکھے۔ پھر شوال میں ۶ روزے ان کے ساتھ اور ملا لئے تو تو یہ عمر بھر روزے رکھنے کی مانند ہے" (رواہ مسلم)۔ ② حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے "اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ اِلٰى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ اِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ" ③ "پانچ نمازیں جمعے سے جمعہ رمضان سے رمضان تک درمیانی دنوں کے گناہوں کا کفارہ بیر رمضان ہی ادا کر دیتا ہے جبکہ کبیرہ گناہوں سے بچا رہے"۔

اس سے واضح ہو گیا کہ رمضان ہی کی اطاعتوں اور مغفرتوں کا فیض سال بھر تک چلتا رہتا ہے۔ اور یہی فیض منتشر ہو کر سال بھر کے دنوں راتوں کی عبادت اور توفیق کی شکل اختیار کرتا رہتا ہے۔ تو صرف برکۃً یا اثراً بلکہ عدداً بھی رمضان سال عبادت کا نقطۂ آغاز اور تخم توفیق تھا۔ اس کے مادہ توفیق و طاعت سال بھر کی عبادات کے برگ و بار کی آبیاری کرتا ہے اور پورے سال پر چھایا ہوا رہتا ہے۔

رمضان اور اشہرِ حج کا باہمی ارتباط..... یہی وجہ ہے کہ رمضان کے ایام نے جن تروک (ترکِ طعام، ترکِ شرب اور ترکِ خواہشات) کا پرداز ڈالا، وہ رمضان ہی پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ان تروک سے دوسرے اور تروک نشوونما پاتے ہیں اور تقویٰ کے آگے کی منزلیں سامنے چلی جاتی ہیں، جو اگر رمضان میں نہیں ہوتیں مگر رمضان ہی کے تروک کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ ماہ رمضان میں طلب حق نے محبت حق کی خاطر اپنے نفس کی عظیم آرزوؤں یعنی کھانے پینے اور لذت نفسانی کی چیز کو ترک کر کے ترک ہوائے نفس کی استعداد پیدا کر لی تو تروک کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ کھانے پینے اور قرب و وصال کی لذتوں کے سوا اور بھی بہت سی لذات ہیں جن کی خواہش نفس میں ہمہ وقت موجزن رہتی ہے یہ تو صرف مادے کے سلسلہ کی لذتیں تھیں۔ جنہیں رمضان نے ایک دم چھڑا کر ان کے مقصد کر لینے کی قوت انسان میں پیدا کر دی تھی۔ لیکن ان سے زیادہ سخت اور ہولناک جاہ کے سلسلہ کی لذتیں ہیں۔ جو انسان کو مغرور و متکبر بنا کر مشاہدہ حق ہی سے نہیں جادہ حق سے بھی بھٹکا دیتی ہیں۔ اور قرب و وصال کے درجات میں سد راہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب استحباب صوم ستة ایام من شوال۔ ج: ۶ ص: ۶۲۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب استحباب صوم ستة ایام من شوال ج: ۲ ص: ۱۹۱۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الطهارة، باب الصلوات الخمس والجمعة الی الجمعة۔ ج: ۲ ص: ۲۴۔

ہو جاتی ہیں کبھی مکان اور بلڈنگ سے اپنے کو باوقار کہلانے کی کوشش کرتا ہے کبھی اپنے قبیلے اور دوست احباب کے اجتماع اور جمگھٹوں سے اپنے لئے شیخی اور فخر کا سامان بہم پہنچاتا ہے کبھی اپنی متانت اور سنجیدگی و بامعنی خاموشی کی نمائش سے اپنے سے وقار کی نمائش کرتا ہے کبھی اپنی زینت و آرائش اور خوبصورتیوں پر گھمنڈ کر کے اپنے خیال میں بدقسمت ہو جاتا ہے اور پھر ان ہی جاہ پسندانہ اندازوں سے دوسروں پر ظلم و تعدی وغیرہ کی بنیادیں کھڑی ہوتی ہیں جن سے دنیا میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے اور دنیا امن و سکھ سے محروم ہو جاتی ہے۔

غرض جاہ پسندی اور دوسروں پر بڑا بننے اور عوام میں امتیازی شان نمایاں کرنے کے مختلف ڈھنگ ہیں اور مختلف راستے ہیں جس سے گزر کر ایک مغرور انسان قرب الٰہی اور وصال حق سے محروم ہو جاتا ہے اس لئے ان کا ترک ان تروک سے بھی زیادہ ضروری ہے جن کی رمضان نے مشق کرائی تھی۔

اس لئے جونہی ان باہی اور شہوانی لذات کے افراط سے نجات پا جانے کی استعداد پیدا کر کے رمضان رخصت ہو جاتا ہے ویسے ہی حج کے مہینے شروع ہو جاتے ہی، جو حج کا پیغام دیتے ہیں جس طرح ہلال رمضان نے اعلان کیا تھا کہ اگر دربار الٰہی میں حاضر ہو کر قرب و وصال شاہی منظور ہے تو شہوانی لذات سے پاک و صاف ہو کر اور انہیں ترک کر کے دربار شاہی (مساجد) میں تراویح و تلاوت کے لئے حاضر ہو جاؤ۔ اسی طرح ہلال شوال اعلان کرتا ہے کہ محل سرائے شاہی (حرم کعبہ) یعنی سید المساجد میں حاضری اور خلوت محبوب مطلوب ہے تو ان جاہ پسندیوں کو ترک کر کے عاشقانہ وارفتگی پیدا کرو اور خدا کے گھر کی طرف پروانہ وار بڑھو مگر ع

شرط اول قدم آن ست کہ مجنون باشی

یہ سامان وقار چھوڑو، اسباب جاہ ترک کرو۔ وسائل غرور و گھمنڈ کو خیرباد کہو اور دیوانہ وار محبوب حقیقی کی طرف چلو، سب سے پہلے گھربار اور وطن ترک کرو اور اپنا گھر چھوڑ کر محبوب کے گھر کی طرف کوچ کرو اپنا شہر چھوڑ کر خدا کے بلد امین کی طرف بڑھو عزیز و اقرباء کی موانست مانع وصال الٰہی ہے تو اسے بھی چھوڑ و مسافرت اور غربت اختیار کرو جتھے اور قبیلے کی طاقتوں پر بھروسہ تھا تو اسے بھی خیرباد کہو کسمپرسی اور بے کسی کی شان سے گھر سے نکل کھڑے ہو۔ پھر نکلو تو دیوانوں کی طرح عاشقوں کی طرح نکلو۔

عاشقی، درویشی اور سرشاری..... سب سے پہلا سامان وقار لباس اور اس کا فیشن ہے اس ترک کر کے احرام باندھو اور ایک لنگی کندھے پر اور ایک لنگی گھٹنوں میں یعنی شاہانہ رئیسانہ اور منعمانہ ٹھاٹھ چھوڑ کر فقیروں کا بھیس بھرو اور مسکینوں کی سی وضع بناؤ کپڑوں کی بو کا بھی دھیان نہ رہے۔ کہ خوشبو کی فکر ہو۔ عاشق کو ان نمائشی چیزوں سے کیا واسطہ اگر وہ عشق سے مغلوب ہے۔ بدن کی صفائی ستھرائی کے دھیان کو ترک کرو نج اعج واثج حج تو نام ہی ہے میلے کچیلے رہنے یعنی صفائی ستھرائی کے خیال کو غیر سمجھ کر ان سے بے نیاز ہو جانے کا بدن کے بناؤ سنگار کی فکریں چھوڑ دو نہ غسل کی پرواہ نہ حجامت کی خبر نہ خط کی اصلاح نہ ناخنوں کے بڑھے ہوئے کی فکر حتی کہ میلے بدن میں جوئیں بھی

پڑ جائیں تو انہیں بھی مت چھیڑو کہ تم محبوب کے عاشق بن کر چلے ہو تمہیں جانداروں کے قتل و غارت سے کیا سروکار؟ چہرہ غبار آلود پیر گرد آلود نہ سر پر ٹوپی نہ پیر میں جوتہ نہ کندھوں پر عباء و قباء نہ بال سنوارے ہوئے نہ مانگ نہ پٹی نہ ان میں تیل پھر بولنے میں نہ آواز بنانے کی فکر نہ الفاظ کے سنوارنے کی فکر نہ کلمات کی سجاوٹ، نہ عبارت کی زینت، بلکہ سرے سے ہی فضول کلام ترک کر دو اور زبان ہو لبیک کبھی پست آواز سے ہو تو کبھی بلند آواز سے کبھی آہستہ سے اور کبھی شور کے ساتھ یعنی آوازیں بھی عاشقانہ۔

گرد یوانگی پیدا کرو۔ قافلے میں ہو تو لبیک لبیک کا شور ہو۔ زمین کی اونچ نیچ آ جائے تو چلا پڑو تا کہ آواز کا وقار جس کی بناوٹ اور سجاوٹ کی فکر تھی مٹ کر رہ جائے غرض نہ بات اپنی نہ کلام اپنا۔ بات ہو تو محبوب کی اور کلام ہو تو شوقِ محبوب اور ذوقِ عشق کا یعنی زبان اور گلا صرف اسی کے لئے وقف ہو۔ محبوب کا گھر آ جائے تو آواز شوق بلند کرو، شوق و ذوق میں کبھی خانہ محبوب کے پتھروں کو چومو، کبھی پردہ دیوار کو تھام کر روؤ اور چیخو، کبھی اس گھر کے اردگرد پروانوں کی طرح گھومو، نثار ہو، کبھی یاد میں غرق ہو کر سرنگوں ہو اور کبھی بھکاری بن کر بانگ سے سرفراز ہو، کبھی فریاد اور کبھی یاد کرو، کبھی قرب کا شکریہ کبھی بعد کا شکوہ، پیر چکر میں ہوں اور زبان عشق کی حرکت میں، پھر ان چکروں میں چال بھی ایک انداز کی نہ ہو جس سے چال کی خوشنمائی کا وقار آ گے آئے، اگر چند پھیروں میں سیدھے چلو تو چند پھیروں میں اکڑ کر مونڈھے ہلا ہلا کر سینہ تان کر چلو۔ یعنی کبھی در محبوب کے مسکین بن جاؤ۔ اور کبھی محبوب کے سپاہی ہو جاؤ، صورت و سیرت ہی نہیں مرضی بھی تمہاری کوئی اپنی نہ ہو۔ ایک مرضی محبوب ہو اور تم ہو، مرضی حق ہو اور اس کی پیروی تا کہ اندرون میں کوئی شیخی و غرور نہ رہ جائے اور نہ بیرون پر کوئی اتراہٹ اور ناز و انداز کی نمود آئے۔

صورت وقار کی بھی ممانعت...... پھر یہ کفنی کا لباس بھی ان پھیروں میں کبھی ایک ہیئت و رنگ پر نہ ہو کہ صورت وقار پیدا ہو جائے اگر پہلے تین پھیروں میں وہ بر جائے خود نہ ہو۔ تو چار پھیروں میں اسے دائیں کندھے کے اوپر کو لیا جائے۔ تا کہ اس کفنی کے اوڑھنے اور پہننے میں بھی کوئی اتفاقی پھبن اور سجاوٹ پیدا نہ ہو جائے کہ وہ بھی عاشق کے شایاں نہیں یعنی اگر غیر اختیاری پھبن بھی سجاوٹ بن جائے تو وہ بھی یکسر مٹ کر رہ جائے۔ پھر ان گھومنے کے پھیروں میں گو دیوانگی تھی مگر چال ڈھال اور رفتار معمول کی مطابق تھی اس لئے اس کو بھی ختم کرو۔ صفا و مروہ پہنچو تو چال کہیں آہستہ ہو تو کہیں دوڑ بھاگ بھی ہوتا کہ چال کا انداز بھی ایک انداز پر باقی نہ رہے جیسا کہ طواف میں ہیئت بدن کا اپنا انداز مٹا دیا گیا تھا۔ غرض اسی طرح اس عاشق حق کے لباس، بدن، زینت، چال ڈھال، سیرت و صورت، کلام، آواز، رفتار، گفتار وغیرہ میں کوئی شائبہ نمائش وقار و متانت کا باقی نہ رہ جائے۔

خانہ بدوشی...... پھر اگر چہ تم نے وطن اور وطن داروں کا انس چھوڑ دیا، بلد امین میں پہنچ گئے، مگر بلد امین بھی تو بہر حال آبادی ہے جس میں اپنا نہیں تو اس شہر والوں کا سامان زینت، لذت بخش، انکی آوازیں انس افزائے سمع و گوش اور ان کی ملاقاتیں، انس افزائے دید و دل تو ہوتی ہیں جو وصال یار میں حائل ہو سکتی ہیں۔

اس لئے مکہ کی آبادی بھی ترک کرو کہ وہ پھر وطن اقامت اور مخل موافست ہے جنگل بیابان میں بسر کرو جہاں نہ گھر ہو نہ در، نہ تمدن، نہ عمارت نہ سامان معاش، نہ اسباب رفاہیت، عرفات کے ریگستان میں جتنی دوپہر میں دھوپ کے سمندر میں گزارو، کسی کپڑے، خیمہ سے اگر دھوپ سے بچاؤ ہو جائے تو فبہا ورنہ سایہ کی لذت بھی ترک کردو، تپش کو ترجیح دو اور خنکی کی راحت بھی چھوڑ دو، مسکن اور جائے سکون کی فکر میں مت رہو۔ ویرانہ نشین اور صحرا نورد ہو جاؤ۔ خانہ بدوشوں کی طرح یہ دن منیٰ میں گزار دو تو رات مزدلفہ میں بسر ہو۔ نہ وہاں پورا دن، نہ یہاں پوری رات، پھر مزدلفہ کی رات بھی اس فکر کے ساتھ گزارو۔ کہ صبح ہی یہاں سے کوچ ہے، مزدلفہ بھی طلوع آفتاب سے پہلے چھوڑ دو، گویا عرفات کے دن کی طرح یہاں کی رات بھی بے فکری سے نہ گزارے کہ عاشق کو چین اور لطف اندوزیوں سے کیا واسطہ؟ پھر مزدلفہ کی آدھی تہائی رات میں خدمت محبوب پیش نظر رہے، علاوہ طاعت وعبادت کے اس میدان کی سنگریاں بھی چنو تاکہ اس ہنگزین سے دشمن الٰہی اور خود عشاق کے پشتینی دشمن شیطان رجیم کو سنگسار کرسکو جو راہ محبوب میں حائل اور نہ صبح نادان بن کر سامنے آتا ہے۔ مزدلفہ سے منیٰ میں آؤ تو گویا وہاں دو تین شب قیام ہو، مگر اس کو بھی سفر در انجمن کا مصداق رکھو، ایک جگہ چین سے بسیرا نہ کرو۔ کبھی یہاں سے پھر در محبوب پر جاؤ۔ خانہ محبوب کے گرد پروانہ وار گھومو، واپس ہو تو روزانہ اس شیطان سے لڑائی مول لو جو راہ جاں سپاری میں حائل ہوتا ہے تاکہ صلح جوئی سے بیٹھے رہنے کا سکون و قار بھی ختم ہو جائے، اور وہ بھی رمی جمار سے تاکہ سپاہیانہ وقار کا غرور بھی مٹ جائے اور دنیا دیکھ لے تیر و تفنگ چلانے والا سپاہی آج چھوٹی چھوٹی کنکریاں مارنے پر اتر آیا ہے۔

فدیۂ جان ...... تو اب وقت آ گیا کہ سرے سے اس نفس ہی کو راہ محبوب میں نثار کردو اور خود اسی کے گلے پر چھری چلا دو، اگر سب کچھ کھو کر جان باقی رہ گئی تھی تو اس سے بھی دریغ نہ کرو، یہ الگ بات ہے کہ محبوب حقیقی محض اپنی شفقت بے پایاں سے ذبیحہ جان کا فدیہ ذبیحہ حیوان سے قبول فرمالے، ورنہ اس راہ میں یہ جان جان آفریں کے سامنے کوئی قیمت نہیں رکھتی اور وہ جب کہ اسی کو بخشی ہوئی ہو تو سودا بہت ہی ارزاں ہو جاتا ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بہر حال شکر محبوب کے ساتھ اس کی مرضی کے مطابق منحر میں پہنچ کر اپنا فدیہ ایک جان کی قربانی سے دیدو کہ یہ آخری ترک ہے تروک میں سے جس کے ذریعے وصال محبوب کی آرزو کی جاسکتی ہے۔ بہر حال شہر رمضان نے اگر یہ ہی لذات ترک کرائی تھیں تو اشہر حج نے جاہی لذات کے ترک کا پروگرام پیش کیا، جو ترک وطن، ترک مسکن اور ترک لباس، ترک زینت، ترک راحت، ترک فیشن، ترک نمائش، ترک وقار، ترک جاہ، ترک افتخار ترک نشاط اور ترک مال سے شروع ہو کر ترک جان پر ختم ہو جاتا ہے۔

ایام حج میں یاد رمضان ...... مگر ساتھ ہی ساتھ باہ کی ان لذات کے ترک سے بھی چشم پوشی نہیں کہ جو رمضان نے سکھلائی تھیں، بلکہ اشہر حج میں خاص تروک کے ساتھ رمضان کے تروک کو بروئے کار لانے کے لئے گویا

نصف ماہ رمضان کو پھر دہرایا جاتا ہے۔ یعنی چھ روزے شوال کے اور نو روزے عشرہ ذی الحجہ کے اشہر حج میں رکھ کر پندرہ روزوں کا پروگرام اشہر حج میں رکھ دیا گیا ہے، تاکہ ان مہینوں میں بھی آدمی رمضان کو فراموش نہ کر سکے، حتیٰ کہ بعض روایات میں عشرہ ذی الحجہ کے دنوں کو رمضان کے دنوں پر فوقیت اور فضیلت دی گئی ہے۔ دونوں کی لذتوں کا سلسلہ منقطع کرایا جاتا ہے، تب آدمی خانہ محبوب کی حاضر باشی اور مشاہدہ حق کے قابل بنتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ رمضان ابتدائی تروک کا مہینہ ہے۔ اور اشہر حج ان تروک کی تکمیل و انتہا کے مہینے ہیں۔

حکمتِ عید قربان...... ہاں پھر جس طرح رمضان کے تروک و افعال کی تکمیل پر یکم شوال کو دوگانہ شکر ادا کیا گیا تھا اور مالی شکریہ میں صدقہ فطر سے عیالِ محبوب (غرباء و احباب) کی خدمت کی گئی تھی، اسی طرح یہاں بھی حج کے تروک و افعال کی تکمیل پر جو نویں ذوالحجہ تک ہوتا ہے دسویں ذی الحجہ کو اسی انداز سے بجان و دل دوگانہ شکر ادا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد صدقہ اضحیہ (قربانی) سے غرباء و احباب کی خدمت کی جاتی ہے تاکہ مالی شکریہ بھی ادا ہو جائے۔

شانِ جلال و جمال کا شکریہ...... پس عیدین کے تہوار اسلام میں رنگ رلیاں منانے کے لئے نہیں رکھے گئے ہیں بلکہ رنگ رلیوں کو مٹانے اور اس قسم کے تمام مادی اور نفسانی لذتوں اور خواہشوں کو ختم کر کے روحانی قرب و وصال کے شکریہ کے طور پر قائم کئے گئے ہیں، فرق اتنا ہے کہ رمضان کے تروک کے ساتھ افعال بر کے سلسلہ میں نماز (تراویح) کا شغل رکھ لیا گیا جو حق تعالیٰ کے جلال و عظمت کے سامنے اظہار نیاز و عبودیت کے لئے ہے تاکہ اس کی علی الاطلاق آقائی اور حکمرانی کے ساتھ اپنی علی الاطلاق ذلت و نیازمندی اور محکومیت کا ثبوت پیش کیا جائے اور اشہر حج کے تروک کے ساتھ افعال بر کے سلسلہ میں مناسک حج رکھے گئے جو حق تعالیٰ کے جمال و محبوبیت کے سامنے اپنی شیفتگی اور گرویدگی اور اپنے عشق و محبت کے جذبات پیش کرنے کے لئے ہیں تاکہ اس کے علی الاطلاق جمال و خوبی کے سامنے اپنا علی الاطلاق عشق و محبت پیش کر دیا جائے۔

دوسرے رخ سے دیکھئے تو ترک کے سلسلہ میں محکوم اور غلام کو بسلسلہ حاضری ملازمت نفس کی مرغوبات اور خواہشات ترک کرنی پڑتی ہیں جس سے وہ کھانے کمانے اور اڑانے کے کام کا نہیں رہتا۔ ورنہ اسے خدمت کا وقت کیسے ملتا اور عاشق و محب کو محض خواہشات نفس ہی نہیں سرے سے نفس ہی کو تج دینا پڑتا ہے، نفس کی شخصیت اور تشخص ہی کو عشق میں گم کر دینا پڑتا ہے اس کی حیثیت عرفی اور طبعی، غرور و وقار تو دور کی چیز ہے جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ نماز تو شاہی خدمت بجالانے کے لئے سرکاری طور پر حاضری دربار شاہی ہے جس کے لئے وقت اور عیش کی قربانی کافی ہے مگر شاہی آداب بجالانے کے ساتھ اور حج عاشقی کے جوش میں حرم سرائے شاہی میں شخصی حاضری ہے جس کے لئے جان و مال دونوں کی قربانی ضروری ہے۔ مگر آداب عشق کے ساتھ جس کا حاصل خودگزاری اور خود فراموشی ہے۔

نماز میں سکون و متانت مطلوب ہے کہ دربار اور دفتر معبودیت میں حاضر ہوتی ہے اور حج سے اسی سکون

ومتانت کو مٹایا جاتا ہے کہ عاشقانہ رنگ سے در محبوب کی حاضری ہے، پس تلاوت وتراویح رمضان کے لئے تو یاہی تروک رکھے گئے جن کا تعلق عیش سے تھا سکون ومتانت سے نہ تھا، اوراس کے لئے وقت کی قربانی کافی تھی، لیکن حرم سرائے میں پہنچ کر قرب ووصال کے لئے جاہی تروک بھی ضروری ہو گئے جن کا تعلق جاہ وباہ، عیش ووقار، متانت وہیبت سب ہی سے تھا، تاکہ عاشق کی مسکنت اور خودگزاری پیدا ہو جائے تو اس کے لئے محض وقت کی قربانی کافی نہ تھی جب تک کہ عین نفس کی قربانی نہ کردی جائے۔

پس عید الفطر سے شئونِ جلال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو غلام بننا میسر آ گیا اور عید الاضحیٰ سے شئونِ جمال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو عاشق ہونا میسر آ گیا۔

اصل عبادت صرف نماز اور حج ہے ...... اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ علی الاطلاق مالک الملک اور قادر حاکم ہیں ایسے ہی وہ علی الاطلاق محبوب ومطلوب اور جمیل ومرغوب بھی ہیں اور اس لئے جہاں ایک بندہ کو ان کے شاہی دربار (مساجد) میں حلقہ بگوش دار اور نیاز مند بن کر حاضر ہونا ضروری ہے وہیں اس کے لئے انکے شاہی حرم (مسجد حرام) میں عاشق دگرویدہ بن کر بھی پہنچنا ضروری ہے یعنی اس کی بندگی تام وکامل نہیں ہوتی اگر ان میں سے ایک نوع بھی بندگی کی رہ جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اسلام میں حج نہ ہوتا اسلام ناقص رہ جاتا کہ شئونِ جمال کے تقاضے متعدم رہ جاتے پس جہاں اسلام کی تکمیل وتتمیم نماز اور حج کے بغیر ممکن نہ تھی، وہیں مسلمان کی تکمیل بھی بغیر ادائیگی نماز وحج کے ممکن نہ تھی۔

اس لئے اسلام کی دو ہی بنیادی عبادتیں اصل نکلتی ہیں، نماز اور حج، ایک جلالی عبادت ہے اور ایک جمالی، بقیہ دو عبادتیں زکوٰۃ وصوم یہ خود اصل نہیں ہیں بلکہ ان دونوں اصلی عبادتوں کے تابع اور ان کے مقدمہ وتمہید کے طور پر ہیں، زکوٰۃ مقدمہ نماز ہے جس سے نماز قائم ہوتی ہے کیونکہ نماز اور حاضری دربار میں اگر حارج ہے تو مال ومنال اور اسی کی عیش کوشیاں بھی ہوتی ہیں اس لئے اس نے اسے زکوٰۃ وصدقات کے ذریعے ترک کرا کر دل سے اس کی محبت نکال جاتی ہے تاکہ موانع مرتفع ہو کر مقصود کا جمال سامنے آ جائے۔

ادھر روزہ مقدمہ حج ہے سرائے شاہی میں حضوری اور قرب خاص سے لذت اندوزی میں اگر حارج ہے تو نفس اور نفسانیت کے تقاضے یعنی وہ جاہ واقتدار اور کبر وغرور ہوتے ہیں۔ اس لئے روزہ سے تروک کی ابتداء کی جاتی ہے اور اشہر حج پر لا کر نہیں مختتم کر دیا جاتا ہے تاکہ موانع ختم ہو کر مصوب ہو جائے اس لئے اشہر حج کو رمضان سے متصل رکھا گیا کہ ابتدائی تروک ختم ہوتے ہی انتہائی آ لگیں اور تروک کا سلسلہ متصل رہے۔

پس اسلام میں بنیادی عبادتیں دو ہیں، نماز اور حج اور عبادتیں ان کے مقدمات اور تمہید ہیں یعنی زکوٰۃ اور صوم، بنیادی عبادتوں میں اصل حصہ افعال کا ہے جو مقصود اصلی ہیں اور غیر ان سے آراستہ ہوتا ہے اور تمہیدی عبادتیں یعنی زکوٰۃ اور صیام میں اصل حصہ تروک کا ہے جو مبادی ہیں جن سے نفس کا ردائل سے صاف ہوتا ہے۔

اجتماعی دین...... اسلام چونکہ اجتماعی دین ہے اس لئے اس کی یہ اصل عبادتیں نماز اور حج تو اجتماعی رکھی گئیں چنانچہ دونوں میں اصل اجتماع ہے اور دونوں کے لئے امام و امیر ناگزیر ہے جو اجتماعی رنگ کا خاصہ لازمہ ہے اور تمہیدی عبادتیں چوں کہ محض ان اجتماعی عبادتوں کے لئے نفس کو تیار کرنے کے لئے تھیں اور نفس ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے یہ دونوں عبادتیں (صوم و زکوٰۃ) بھی انفرادی رنگ کی رکھی گئیں چنانچہ ہر ایک کا مال اور اس کی مقدار الگ الگ ہے۔ اس لئے ہر ایک کی زکوٰۃ بھی مقدار و مدت کے لحاظ سے الگ الگ ہے۔ اسی طرح ترک طعام و شہوات بھی ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے روزہ بھی ہر شخص کا اپنا اپنا الگ ہے۔ غرض اسلام کے اجتماعی دین ہونے کا مقتضی بھی یہی تھا کہ اس کی بنیادی عبادتیں تو اجتماعی ہوں اور تمہیدی عبادتوں میں اجتماعیت کی شرط نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و تربیت میں ایک مسلم کا عباداتی سال افعال و تروک اور بر و تقویٰ سے مخلوط اور ملا جلا رکھا گیا ہے اگر اس کی بنیاد عبادتوں میں سے دو عبادتیں افعال کی قسم سے رکھی گئی ہیں۔ یعنی نماز اور حج تو دو تروک کی قسم سے رکھی گئی ہیں یعنی صوم و زکوٰۃ اور اگر اس عباداتی سال کے ابتدائی مہینے (رمضان) میں افعال بر، تلاوت و تراویح وغیرہ رکھے گئے ہیں تو اسی ماہ میں تروک تقویٰ (ترک طعام و شہوات) بھی رکھے گئے۔

عباداتی سال کے درمیانی روزوں کی اہمیت...... اسی طرح اگر اس عباداتی سال کے درمیانی حصوں مثلاً اشہر حج میں بر، طواف و زیارت اور صلوٰۃ و تلاوت کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے تو ان ہی مہینوں میں جا بجا دونوں قسم کے اجتماعی تروک بھی جمع کئے گئے ہیں جن میں صیام عشرہ ذی الحجہ اور بالخصوص صوم یوم عرفہ خاص اہمیت رکھتے ہیں یا مثلاً اشہر حج کے بعد محرم میں جہاں افعال بر تلاوت و نماز اور اذکار وغیرہ معمولاً رکھے گئے ہیں۔ وہیں تروک کے سلسلہ میں یوم عاشورہ کا روزہ بھی اہمیت کے ساتھ رکھا جاتا ہے جس سے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جیسے ان درمیانی مہینوں میں بسلسلۂ افعال بر خاص فرائض ہی پر نہیں قناعت کی گئی بلکہ عام نوافل و تطوعات بھی رکھے گئے ہیں ایسے ہی بسلسلہ تروک تقویٰ محض خاص روزوں صوم یوم عرفہ اور صوم یوم عاشورہ وغیرہ ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہر ماہ میں ایام بیض کے تین روزے اور ہر ہفتہ میں پیر اور جمعرات کے روزے بھی رکھے گئے ہیں تاکہ درمیان سال کا کوئی مہینہ بھی افعال بر اور تروک تقویٰ سے خالی نہ رہے اور رمضان کی یاد فعل و ترک دونوں حیثیتوں سے تازہ ہوتی رہے، اسی طرح اسی عباداتی سال کے نقطہ اختتام یعنی شعبان میں شب برات کے افعال بر بصورت صلوٰۃ و تلاوت اور مجاہدہ و مراقبہ رکھے گئے ہیں جس سے اس رات کا احیاء ہوتا ہے۔

تو وہیں یوم برات کا روزہ بھی سنت اسلام قرار دیا گیا اور پھر بطرز سابق اس خاص فعل و ترک ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ افعال بر کے ساتھ شعبان میں زیادہ روزے رکھنے کی تھی۔ گویا شعبان افعال و تروک سے بھرپور رہتا تھا۔ جس میں شب برات کے افعال اور یوم برات کے تروک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ماہ و سال کا توازن...... بہر حال سال جس کی ابتداء میں رمضان اور اس کے افعال و تروک ہوں اور جس کے

درمیانی مہینوں میں اشہر حج اور محرم وغیرہ کے جامع ترین افعال وتروک ہوں اور جس کی انتہا میں شعبان اور اس کے مخصوص افعال وتروک ہوں تو ظاہر ہے کہ اس سال کی برکت وہدایت اور نورانیت کی کیا انتہا ہو سکتی ہے' کیونکہ جس چیز کا اول وآخر اور وسط درست وصحیح ہو وہ یقیناً محفوظ اور نجات یافتہ اور ہلاکت سے دور ہوتی ہے۔

پس جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مرحومہ کے اول وآخر اور وسط کا ذکر کر کے بحیثیت مجموعی امت کی نجات اور عدم ہلاکت کا یقین دلایا اور فرمایا: "کَیْفَ تَهْلِکُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَهْدِیُّ وَسَطُهَا وَالْمَسِیْحُ اٰخِرُهَا"...... "وہ امت کیسے ہلاک ہو سکتی ہے جس کا اول میں ہوں اور جس کے درمیان مہدی ہوں اور جس کا آخر حضرت مسیح علیہ السلام ہوں"۔ ① ایسے ہی بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ وہ مرد مومن کیسے ہلاک ہو سکتا جس کے عباداتی سال کا اول رمضان المبارک ہو اور جس کا اوسط اشہر حج اور محرم الحرام ہو اور جس کا آخر شعبان معظم ہو۔ پس جس مومن کی عمر پر اس طرح کے سال گزرتے رہیں تا آنکہ اس کی عمر پوری ہو جائے تو یقیناً اس کے دل کی زمین اس اول وآخر اور وسط کے ساتھ جاہ وباہ کے ترک کے ذریعہ نفسانی خس وخاشاک سے پاک ہوگی اور افعال طاعت وعبودیت اور بر کے ذریعہ نور و برکت سے چمک اٹھے گی، اس کے رذائل زائل ہوں گے اور اس میں فضائل داخل ہوں گے۔ وہ نار سے بچ جائے گا اور نور سے سرفراز ہوگا جو حقیقی فوز و فلاح ہے۔ ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ② "جو نار سے نکالا گیا اور جنت (نور محض) میں داخل کر دیا گیا تو وہ کامیاب ہوا۔ اور یہ دنیا کی زندگی سوائے دھوکہ کے سامان کے اور کچھ نہیں"۔

ان اوراق پریشان سے امید ہے کہ ناظرین پر رمضان عید اور مناسک حج کی حقیقتیں اور حکمتیں اور ان کے آثار و نتائج ایک حد تک واضح ہو گئے ہوں گے جو ان سطور کا مقصد اور اس زیر نظر رسالہ کا نصب العین ہے۔ زیادہ تفصیلات کے یہ صفحات متحمل نہ تھے اس لئے اسی قدر قلیل پر قناعت کی گئی۔

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقِ

حضرت عبادہ بن صامتؓ نے بیان کیا۔ جب رمضان آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ان کلمات کی تعلیم دیتے۔ "اَللّٰهُمَّ سَلِّمْنِیْ لِرَمَضَانَ وَسَلِّمْ رَمَضَانَ لِیْ وَسَلِّمْهُ لِیْ مُتَقَبَّلًا" ③ "اے میرے اللہ! مجھ کو رمضان کے لئے محفوظ کر دے اور رمضان کو میرے لئے محفوظ کر دے۔ اور اس رمضان کو بحفاظت میرے لئے قبول فرما"۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا. اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِیْنَ اٰمِیْنَ یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔

① مشکوٰۃ المصابیح، کتاب المناقب، باب تسمیة من سمی من اهل البدر ج:۳، ص:۳۷۔

② پارہ:۴، سورۃ آل عمران، الآیة:۱۸۵۔

③ کنز العمال، ج:۸ ص:۵۸۴ رقم:۲۴۲۷۷ (طب فی الدعاء والدیلمی رسندہ حسن)

فضیلتِ تقویٰ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

احوالِ واقعی..... بزرگانِ محترم! یہاں آنے کے بعد میں نے کچھ بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر بیاری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور نزلہ زکام بخار وغیرہ کی وجہ سے کچھ کمزوری پیدا ہوئی تو میں نے معذرت کر دی کہ بھائی! آج رہنے دو پھر دیکھی جاوے گی چنانچہ ہمارے بھائی رشید نے یہ بھی فرمایا کہ واپسی میں ایک دن دیا جائے اس میں کچھ بیان ہو جائے گا۔ میں نے اس پر کہا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آج میں نے سوچا کہ شاید بھول گئے ہوں گے اور یہ دیکھ کر کوئی سامان بھی جلسہ واجلاس کا نہیں بالکل مطمئن تھا مگر اب معلوم ہوا کہ سب جمع ہیں تو اچانک ایک چیز سامنے آئی اور مجمع کے احترام کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ کچھ بیان کر دیا جائے چاہے مختصر ہی ہو۔ اس لئے زیادہ وقت بھی نہ لے سکوں گا۔ مختصر طریق پر چند باتیں گزارش کروں گا۔

طریقِ سلف اور وصیتِ تقویٰ..... سلفِ صالحین یعنی حضرات صحابہؓ اور حضرات تابعینؒ کی یہ عادت رہی ہے کہ جب ایک دوسرے سے رخصت ہوتے تو کہتے تھے کہ کچھ نصیحت کیجئے چھوٹے اپنے بڑوں سے نصیحت کی فرمائش کرتے تھے اور بڑے اپنے چھوٹوں سے نصیحت طلب کرتے تھے، عام طور سے سلف کی یہ نصیحت ہوتی تھی کہ اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ. "میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں"۔

یہ سلف کا عام جواب ہوتا تھا۔ اسی مناسبت سے میں نے یہ آیت تلاوت کی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو شخص

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲، ۳۔

اللہ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ اللہ اس کے لئے مشکلات میں ایسے راستے کھولتا ہے کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔ مشکل میں پھنسا ہوا ہے ہر طرف سے راستے بند ہیں غیب سے سامان ہوتا ہے اور راہ نکل آتی ہے اور وہ مشکل سے نکل جاتا ہے۔

نتائج تقویٰ...... اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾ ① ''تقویٰ پر مرتب شدہ پہلا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشکلات میں اس کے کام آتے ہیں''۔ اور دوسرا وعدہ یہ ہے کہ ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ② ''حق تعالیٰ اس کو ایسے انداز سے رزق دیتے ہیں کہ اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ میرا رزق یہاں سے پہنچ جائے گا اور پہنچتا ہے وہیں سے''۔ تیسرا وعدہ یہ فرمایا ہے ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ﴾ ③ ''کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں''۔ اور چوتھا ثمرہ اور نتیجہ یہ بیان فرمایا ہے ﴿وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا﴾ ④ ''اللہ اس کے اجر وثواب کو بہت بڑھا دیتا ہے''۔

تو تقویٰ اختیار کرنے پر ان آیات میں چار وعدے دیئے گئے ہیں مشکلات میں راستہ کھول دینا، رزق بے شان وگمان پہنچانا، معصیت کا کفارہ کر دینا، اجر وثواب کو بڑھا دینا، تقویٰ کے ایک معنی تو لغت میں ڈرنے اور خوف کے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ''اللہ سے ڈرو اور خوف وخشیت اختیار کرو''۔ کسی حالت میں بے فکر ہو کر مت بیٹھو، خواہ دولت مند ہو خواہ مفلس ہو۔ ہر حالت میں اللہ کا ڈر انسان کو رہنا چاہئے۔

تقویٰ، امن عالم کا ضامن ہے...... اگر غور کیا جائے تو جتنے بھی جرائم اور معصیتیں ہیں وہ اللہ کے ڈر سے ہی ختم ہوتی ہیں۔ جرائم کو نہ پولیس روک سکتی ہے نہ فوج روک سکتی ہے اور نہ ہتھیار روک سکتے ہیں۔ جب تک کہ دل میں ڈر اور خوف خداوندی نہ ہوگا۔ آدمی جرائم سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگر محض پولیس اور فوج کی طاقت سے جرائم بند ہو جایا کرتے تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔ اس لئے کہ آج نہ فوجوں کی کمی ہے اور نہ پولیس کی کمی ہے اور نہ ہتھیاروں کی کمی ہے بلکہ آج کل ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں کہ دنیا نے کبھی دیکھے بھی نہ ہوں گے۔ توپیں بھی ہیں بم بھی ہیں، غرض ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں جن کے اثرات دور دور تک جاتے ہیں۔

ایک بم سے لاکھوں آدمی ختم ہو سکتے ہیں، اگر ان ذرائع سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا اور جرائم مٹ سکتے تو آج کی دنیا میں کوئی جرم باقی نہ رہتا، سب کے سب متقی اور پرہیزگار ہوتے لیکن جتنی پولیس بڑھتی جاتی ہے اور جتنی فوج اور ہتھیار بڑھائے جاتے ہیں اس سے دگنے جرائم بڑھتے جاتے ہیں اور عام طور سے دنیا میں فسق وفجور مار دھاڑ اور بدامنی، بدنظمی اور فسادات عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ارتکاب جرائم کی وجہ یہ نہیں کہ اس دور میں پولیس اور فوج کی کمی ہے، بلکہ دلوں میں اللہ کا ڈر اور خوف باقی نہیں ہے۔ اگر یہ ہو تو آدمی کو ارتکاب جرائم کی ہمت ہی

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۳۔
③ پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۵۔ ④ پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۵۔

نہیں ہوگی خواہ وہاں پولیس اور فوج ہو یا نہ ہو پھر چاہے تنہائی میں بھی ہو وہاں بھی گناہ سے بچے گا۔

تقویٰ کے بغیر قیامِ امن ناممکن ہے..... مثلاً آپ کے سامنے لاکھوں روپے کا خزانہ رکھا ہوا ہے اگر آپ اٹھا کر لے جانا چاہیں تو لے جا سکتے ہیں کیونکہ وہاں نہ پولیس ہے نہ فوج ہے مگر آپ اسے نہیں اٹھاتے! کیوں؟ اس لئے کہ اللہ کا ڈر دل میں گھر کئے ہوئے ہے کہ میں نے اگر ایسا کیا تو اللہ کے سامنے قیامت کو کیا جواب دوں گا۔ جب پوچھا جائے گا کہ تو نے غیر کے مال میں بغیر اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا تھا۔ تو سب سے بڑی پولیس جو دلوں پر بیٹھی ہوتی ہے وہ خوف خداوندی ہے۔ وہی تمام جرائم سے بچانے والی ہے اور معصیت سے روکنے والی ہے۔ ورنہ دنیا میں کوئی صورت نہیں ہے جرائم سے روکنے کی اور جرائم سے بچنے کی۔ اسلام نے آخرت کا جو عقیدہ پیش کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو ہر وقت یہ تصور رہے کہ مجھے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اور ہر شخص سے اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ زندگی کس طرح سے گزاری۔ اس کا جواب دینا پڑے گا۔ تو یہ عقیدہ ایسا ہے کہ جس سے انسان حرکاتِ ناشائستہ سے رک سکتا ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ اور ہر شخص ارتکابِ جرائم سے بچ سکتا ہے۔ اور کوئی صورت ایسی نہیں جس کے اختیار کرنے سے جرائم سے بچ سکتے۔

باطنی فساد بھی تقویٰ سے رفع ہوتا ہے..... جبلی طور پر انسان درندہ واقع ہوا ہے مارکاٹ چیر پھاڑ اس کا خاصہ ہے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا اور حضرت حواؑ بھی اتریں تو فرمایا ﴿اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ ① جاؤ تم دنیا کے اندر اور ایک دوسرے کی دشمنی تمہارے اندر ڈال دی گئی ہے۔ اس لئے انسان ایک دوسرے کا دشمن بھی ہے اور برا چاہنے والا بھی۔ اس کے قلوب میں کہیں حرص رکھی گئی ہے کہیں بغض رکھا گیا ہے کہیں حسد رکھا گیا ہے کہیں تکبر رکھا گیا ہے۔ ان اخلاقِ رذیلہ کی بناء پر جب آدمی حریص ہوگا تو دوسرے کے مال پر نگاہ ڈالے گا۔ اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا پھر اسے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ ہوگی، چوری ڈکیتی بے تحاشہ کرے گا، اس لئے کہ اس کے اندر حرص کا مادہ موجود ہے اور اگر انسان میں حسد کا مادہ موجود ہے تو وہ اپنے کسی بھائی کو بڑھتا ہوا دیکھنا نہیں چاہے گا۔ دنیا میں کوئی عزت کے اعتبار سے ذرا بڑھا تو دلوں میں حسد شروع ہو جاتا ہے کہ یہ کیوں بڑھ گیا، لوگ اس پر تو غور نہیں کرتے کہ اس نے اپنی صلاحیتیں استعمال کیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے بڑھا دیا۔ ہم بھی وہ صلاحیتیں پیدا کریں مگر یہ نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ ترقیات و مراتب اس کے پاس نہ رہیں چاہے مجھے ملیں یا نہ ملیں، یہ حسد کا خاصہ ہے کہ آدمی دوسرے کی نعمت کو زائل ہوتا دیکھ کر خوش ہو، چاہے خود بالکل محتاج اور مفلس کیوں نہ ہو۔

ایسے ہی تکبر، طمع لالچ وغیرہ ہیں۔ ان اشیاءِ رذیلہ پر اگر بریک لگانے والی کوئی چیز ہے تو وہ تقویٰ اور خوف خداوندی ہے اگر یہ نہ ہو تو سوائے مار دھاڑ کے اور ڈکیتی ڈالنے کے اور کیا کرے گا تو اس سے دنیا میں ایک عجیب

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۴۔

انا رکی پھیل جائے گی۔ یہ اخلاق عام ہیں اور یہ انسان کی جبلت ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے اپنا قانون اتارا کہ ان چیزوں سے بچ کر زندگی گزارو۔

اس لئے حکم ہے کہ حسد ختم کرو اور ایثار اختیار کرو اگر اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ دولت ملی ہے تو اس پر اتنے ہی خوش ہو جیسے کہ یہ دولت مجھے ہی مل گئی اور یہ سمجھو کہ وہ میری ہی دولت ہے اگر کسی کو عزت ملی ہے تو یہ سمجھو کہ یہ میری عزت ہے، اگر خدانخواستہ یہ ذلیل بنا تو یہ میری ذلت ہے۔ یہ جذبہ دین نے پیدا کیا ہے کہ حسد کو چھوڑ کر ایثار اختیار کرو۔ لالچ چھوڑ کر قناعت اختیار کرو کہ جتنا تمہیں اللہ نے دیا ہے اس پر خوش رہو، شکر کرتے رہو اللہ تعالیٰ اسے بڑھادے گا۔ اسی طرح کبر سے بچا کر دین نے تواضع کی تعلیم دی ہے کہ خاکساری برتو، ہر ایک کے سامنے چھوٹے بن کر پیش ہو کر تم بڑے ہو، میں چھوٹا ہوں۔ لڑائی دنگا جب بھی ہوتا ہے تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہر ایک کہتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور قاعدہ ہے کہ دو بڑے ایک جگہ نہیں سما سکتے۔ یقیناً ایک گھٹے گا ایک بڑھے گا۔ ایک ختم ہوگا ایک آگے آئے گا۔ لیکن جب ہر ایک یوں سمجھے گا کہ میں بڑا نہیں۔ بڑا تو وہ ہے۔ جو یہ کہے کہ میں بڑا نہیں یہ بڑا ہے۔ تو پھر لڑائی جھگڑا کس چیز کا ہوگا۔؟

اس لئے امن وامان کا ذریعہ تواضع اور خاکساری ہے اور لڑائی جھگڑوں کا سبب تکبر اور نخوت ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان میں موجود ہیں ان کا علاج اگر کیا ہے تو دین نے کیا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دنیا میں آ کر اس کی تعلیم دی اس کے طریقے بتلائے ہیں کہ اگر یہ طرز اختیار کرو گے تو تمہاری حرص زائل ہو جائے گی اور یہ طریقہ اختیار کرو گے تو تمہارا حسد ختم ہو جائے گا۔ یہ تمام طریقے دین کے بتلائے ہوئے ہیں۔

تقویٰ محاسبۂ آخرت سے نجات کا ذریعہ ہے ...... یہ دو بنیادی باتیں ہیں ایک دل میں اللہ کا ڈر، دوسرے آخرت کے عقیدے میں مضبوطی اور پختگی کہ جو کچھ دنیا میں کر رہا ہوں مجھے جواب دینا ہے اور حق تعالیٰ کے پاس ایک ایک چیز کا حساب ہوگا۔ حتیٰ کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سردیوں میں گرم پانی نعمت ہے اسکا بھی احسان جتلایا جائے گا کہ ہم نے سردیوں میں گرم پانی دیا تم نے اس کا کیا حق ادا کیا؟ گرمیوں میں ٹھنڈا پانی نعمت ہے اس کا حساب ہوگا کہ تم نے اس ٹھنڈے پانی کو استعمال کر کے کیا شکریہ ادا کیا۔ وہاں ایک ایک چیز کا حساب ہوگا۔ تمہیں اتنی عمر دی تھی تم نے کاہے میں صرف کی۔ تمہیں اتنی دولت دی گئی تھی تم نے اس کو کاہے میں صرف کیا۔ تو سب چیزوں کو الگ الگ پوچھا جائے گا۔

یہ نہیں کہ سارے بنی آدم سے مشترکہ طور پر سوال ہوگا اور وہ سب مل کر جواب دیں گے نہیں بلکہ ہر کسی کی پوری زندگی سامنے کر دی جائے گی اور پھر اسی کے مطابق حساب وکتاب ہوگا۔ یہ عقیدہ جب ایک مومن کے دل میں جما ہوا ہے تو وہ جرأت و ہمت نہیں کر سکتا۔ خیانت کی بددیانتی کی۔ اور جب بھی یہ حرکت کرے گا تو معلوم ہوگا کہ عقیدے میں ڈھیلا پن آ گیا ہے۔ وہ عقیدہ دل میں چھپ گیا ہے۔ سامنے نہیں رہا ہے لیکن اگر سامنے ہو تو پھر

یقیناً جرات نہیں ہوگی اور اگر کر ہی گزرے گا تو پھر جلدی سے توبہ کی توفیق ہوگی اور ندامت ہوگی کہ میں نے بہت بری حرکت کی ہے۔ اس کے پیچھے میں توبہ کرے گا، استغفار کرے گا۔ یہ ندامت توبہ واستغفار اسی وجہ سے کہ یہ دو بنیادیں ہیں اس کے ذہن میں۔

تقویٰ میں احتیاط کا پہلو..... تقویٰ کے ایک معنی ہیں ڈرنے کے کہ آدمی اللہ سے ڈرے اور یہ ہی گویا جرائم سے انسداد کا طریقہ ہے۔ تقویٰ کے دوسرے معنی ہیں احتیاط۔ کہ میں آدمی محتاط زندگی بسر کرے جس میں بڑے جرائم سے بچنے کے لئے چھوٹے جرائم کو چھوڑ دے کہ اگر میں نے مکروہ فعل کیا تو ممکن ہے کہ کل کو فعل حرام کروں اور مکروہ سے بچنے کے لئے بعض جائز چیزیں بھی ترک کرنی پڑتی ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ جائز میں گھر گھرا کر مکروہ میں مبتلا ہو جاؤں۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی کا نام سدِ ذرائع ہے یعنی ذرائع اور وسائل کو ترک کر دو تاکہ ناجائز مقاصد تک پہنچنے نہ پاؤں اور پہلے ہی رک جاؤں۔

مثلاً زنا کاری ایک فعل خبیث ہے اور حرام ہے۔ اس سے بچانے کے لئے فرمایا گیا کہ اجنبی عورت پر نگاہ بھی مت ڈالو۔ اجنبی عورت سے خلوت بھی مت اختیار کرو۔ اجنبی عورت کی آواز پر کان بھی مت لگاؤ یہ ساری چیزیں سدِ ذرائع ہیں۔ جو ان چیزوں میں پڑا تو اندیشہ ہے کہ مبتلا ہو جائے گا۔ اصل گناہ سے بچانے کے لئے شریعت نے یہاں سے روکنا شروع کیا کہ نگاہ ہی مت ڈالو کان ہی مت لگاؤ۔ اور اگر عورت خوشبو لگائے ہوئے ہو تو اپنی ناک کو موڑ لو۔ گویا ہم خوشبو نہیں سونگھ رہے ہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ خوشبو ذریعہ بنتی ہے خیال کے متوجہ ہونے کا۔ یہ ہے احتیاط جیسے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت وضو کرے اور اس کا بچا ہوا پانی لوٹے میں موجود ہے اس سے وضو مت کرو۔ دوسرا نیا پانی لو۔ اس لئے کہ اس کے بچے ہوئے پانی سے دھیان جا سکتا ہے کہ یہ فلاں عورت کا وضو ہے۔ اس خیال کو اگر متوجہ کر دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ دل کے اندر فتنہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے شریعت نے احتیاط کی رو سے حکم دیا کہ تم اس پانی کو چھوڑ دو نیا پانی الگ لو۔ کیوں اپنے خیال کو گندہ کرتے ہو۔ خیال گندہ ہوا تو ارادہ گندہ ہوگا اور ارادہ گندہ ہوگا تو فعل ناپاک ہو جائے گا۔ اس لئے شروع اور ابتداء ہی سے بچتے ہیں۔

زنا گناہ کبیرہ ہے اور یہ جو ابتدائی وسائل ہیں ان کو صغیرہ گناہ کہتے ہیں۔ اور صغیرہ گناہوں سے اس لئے بچایا گیا ہے کہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے۔ یہ احتیاط کی زندگی ہے۔ چوری کے اندر جو اصل فعل ہے اور جس کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ غیر کے مال کو بلا اس کی مرضی کے اٹھا لائے لیکن شریعت نے اس سے بچانے کے لئے ایک سلسلہ قائم کیا ہے کہ کسی کے گھر میں جاؤ تو اس کے سامان کو مت دیکھو ممکن ہے خیال پیدا ہو کہ آنکھ بچا کر اٹھا لوں یہ تاک جھانک پیش خیمہ ہے اور چوری تو انجام کار اور آخری فعل ہے جو اصل میں ممنوع ہے۔ اس سے بچانے کے لئے یہ لمبا سلسلہ قائم کیا ہے۔ ہاں اگر خود مالک ہی دکھلائے کہ مجھے اللہ نے یہ نعمت دی ہے تو آدمی شوق سے دیکھے اور دیکھ کر شکریہ ادا کرے اور خوشی کا اظہار کرے گویا کہ یہ جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے ہمیں ہی دیا ہے لیکن از خود تاک

جھانک کرنا یا یہ غور کرنا کہ کس مکان میں ہے مال اور یہ دھیان جائے کہ اگر نقب لگاؤں تو یہاں سے مناسب رہے گا یہاں سے یہ نقب لگانے کا دھیان' دور تا نک جھانک کرنا اور نگاہ ڈالنا صغیرہ گناہ ہیں۔ شریعت نے ان صغیرہ گناہوں سے روکا ہے تا کہ اصل گناہ جو کہ چوری ہے اس تک نہ جانے پائے۔ اسی کو کہتے ہیں سدِ ذرائع اور وسائل پر پابندی تا کہ اصل مقصد تک نہ پہنچنے پائے۔

درجاتِ تقویٰ...... یہی ہے وہ سدِ ذرائع کہ ابتداء میں جو ہلکی صورت ہے اسے بھی اختیار مت کرو تا کہ بڑی صورت تک نہ پہنچ سکو۔ تو شریعت اسلام نے ایک سلسلۂ کبائر کا رکھا ہے۔ کہ یہ حرام ہے مثلاً زنا کاری، چوری، بے حیائی اور کچھ اس کے دواعی واسباب ہیں ان تک کو روکا ہے تا کہ اصل مقصد تک پہنچنے نہ پائے، اب اگر تقویٰ کے لغوی معنی بھی مراد لئے جاویں۔ یعنی ڈرنے کے تو بھی اپنی جگہ درست ہیں اس لئے کہ ڈر سے معاصی چھوٹ جاتے ہیں اور اگر تقویٰ سے احتیاط کے معنی لئے جاویں تو بدرجہ اولیٰ معصیت سے حفاظت ہو جائے گی کہ بعض جائز چیزیں بھی چھوٹ جاتی ہیں۔

پھر اس کے بعد آدمی کی زندگی پاک بن جاتی ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جو دنیا کی تمام آلائشوں اور گندگیوں سے پاک ہو جاتی ہے اور آدمی کو جہنم سے ہٹا کر جنت میں ابدالاباد والی نعمتوں میں داخل کر دیتی ہے اور آدمی کو اللہ کا مقرب بنا دیتی ہے۔ مگر تقویٰ کے اس درجہ کا حصول موقوف ہے بادشاہ حقیقی کے مرتبے کے معلوم ہونے پر یہ محتاط زندگی والا تقویٰ تو بڑوں کا نصیب ہے۔ ہم اور آپ جیسے بہت مشکل سے اس کی طرف جاسکیں گے کہ ناجائز سے بچنے کے لئے جائز چیزوں کو بھی ترک کر دیں یہ تو بہت اونچا مقام ہے مگر ابتدائی درجہ ہر ایک کے بس کا ہے کہ اللہ سے ڈرے۔

حصولِ تقویٰ...... اور ڈرنے کی صورت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اقتدار اور قبضے کو تصور میں لاتا رہے کہ وہ مالک ہے جس طرح چاہے کرے۔ جب چاہے موت دیدے جب چاہے حیات دے، جب چاہے صحت دے دے، جب چاہے بیماری مسلط کر دے، جب چاہے امن دے دے اور جب چاہے بدامنی مسلط کر دے۔ اسی کی یہ قدرت ہے اور اس کی اس قدرت کا جب دھیان ہوتا ہے تو ڈر پیدا ہوتا ہے کہ میں بڑے قادر کے قبضے میں ہوں معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ تو آدمی حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کا تصور کرتا رہے اس سے ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔

جاہل مقامِ تقویٰ سے ناآشنا ہے...... اگر کوئی بالکل انجام اور جاہل محض ہے اسے کبھی بھی ڈر نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے بادشاہ کے اقتدار سے۔ ایک دیہاتی اگر بادشاہ کے دربار میں آئے تو وہ زیادہ نہیں ڈرے گا۔ اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے کہ بادشاہ کے اختیارات کیا ہیں اس کا اقتدار کیا ہے؟ بادشاہ کو یوں ہی سمجھے گا کہ مجھ جیسا ایک آدمی ہے۔ مگر وزیراعظم تھرائیگا، کپکپائے گا۔ اس لئے کہ وہ بادشاہ کے اختیار واقتدار کو جانتا ہے۔ وہ آنکھ نیچی رکھے گا۔ ادھر ادھر بھی نہیں دیکھے گا کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔ میری گردن نہ ماردی

جائے۔ تو جس کو علم اور پہچان ہوگی باری تعالیٰ کی بڑائی اور اقتدار کی اور اس کے جلال کی اُس کے دل کے اندر خوف پیدا ہوگا۔ اور جو جاہل ہے اس کے دل کے اندر کچھ بھی پیدا نہ ہوگا۔

کہتے ہیں کہ اکبر بادشاہ نے مشاعرہ کی مجلس کی کہ شعراء آئیں اور اپنا اپنا کلام سنائیں اور اعلان کیا کہ جس کی نظم عمدہ ہوگی اسے انعام دیا جائے گا۔ سینکڑوں شعراء نے نظمیں اور غزلیں لکھیں اور بہت بڑا دربار ہوا۔ گاؤں کے ایک دیہاتی نے بھی ارادہ کیا کہ میں بھی کچھ تک بندی کر کے لے جاؤں تو مجھے بھی بادشاہ انعام دے گا۔ تو چودھری صاحب بھی دربار میں کچھ لکھ کر لائے۔ وزیر اعظم نے دیہاتی آدمی سمجھ کر اسے بلایا اور پوچھا کہ تو کیا لایا ہے اسے شبہ ہوا کہ پتہ نہیں کیا اناپ شناپ لکھ کر لایا ہوگا، الٹا بادشاہ ناراض ہو کر اس کی گردن نہ مار دے۔ اس بنا پر وزیر اعظم نے دیہاتی سے کہا۔ کہ چودھری صاحب! تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی مجھے سنا دو۔ اس نے کہا اچھا سن لو۔ چودھری صاحب نے وہ قطعہ سنایا۔ قطعہ یہ تھا کہ ؎

سب درکھت ماں بجرگ بڑ ہرے ہرے پتوا میں لال لال پھل

یعنی سارے درختوں میں جو بڑا درخت ہے وہ بڑ کا درخت ہے جس کی ڈاڑھی اور چھالیں لٹکی رہتی ہیں اور اس کے سبز سبز پتے ہوتے ہیں اور سرخ سرخ پھل ہوتے ہیں۔ گویا یہ قطعہ کہا اور اس قطعہ کے اخیر میں کہا کہ ؎

اکبر بادشاہ گیدی خر

یعنی اکبر بادشاہ حرام زادہ ہے۔ یہ سن کر وزیر اعظم تو کانپ گیا کہ اس کمبخت نے خود بھی جان کوئی اور مجھے بھی پٹوائے گا، تو خیر وزیر اعظم نے کہا کہ چودھری صاحب! شعر بڑے عمدہ ہیں مگر یہ جو اخیر کا شعر ہے (اکبر بادشاہ گیدی خر) یہ نہ لکھو۔ اس نے کہا کہ اور کیا لکھوں؟ وزیر اعظم نے کہا کہ یہ لکھو کہ.....

اکبر بادشاہ بحرو بر

یعنی اکبر بحرو بر کا بادشاہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑا اونچا بادشاہ ہے۔ اس نے کہا جی اچھا کہدوں گا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ شعراء نے اپنی اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ اعلان ہوا کہ چودھری صاحب بھی ایک قطعہ پڑھیں گے۔ چودھری صاحب نے کھڑے ہو کر ایک قطعہ پڑھا کہ

سب درکھت ماں بجرگ بڑ ہرے ہرے پتوا میں لال لال پھل

اکبر بادشاہ بحرو بر

اکبر نے کہا چودھری صاحب! یہ مصرع تو بہت عمدہ ہے مگر یہ اخیر کا مصرع ہے ؎

اکبر بادشاہ بحرو بر

یہ بہت بڑا مصرع ہے۔ اکبر سمجھ گیا کہ مصرعہ اس کا نہیں ہے۔ یہ اس کو کسی نے بتایا ہے تو چودھری نے وہیں کھڑے کھڑے وزیر اعظم کو ماں کی گالی دے کر کہا کہ اس حرام زادے نے کہا تھا کہ اس طرح کہنا ورنہ میں تو یوں

لکھ کر نایا تھا۔

اکبر بادشاہ گیدی خر

اکبر بادشاہ نے کہا یہ بہت عمدہ ہے وہ ٹھیک نہیں تھا۔

چودھری صاحب نے کہا جی ہاں! میرا تو یہ ہی مصرعہ ہے پھر اس کو بادشاہ کی طرف سے بہت انعام واکرام ملا۔ اس نے یہ مصرعہ ''اکبر بادشاہ گیدی خر'' کیوں کہا تھا؟ اس لئے کہ وہ دیہاتی ہے۔ نہ اکبر کی جاہ وجلال سے واقف اور نہ اس کی عظمت واقتدار سے واقف فقط ایک دیہات کا رہنے والا ہے۔ تو دیہاتی لوگ بیچارے بالکل سادہ ہوتے ہیں۔ ان میں چھل فریب مکروفریب دغابازی دھوکہ وہی کچھ نہیں ہوتی ہے۔ سادہ زندگی ہوتی ہے جو دل میں آیا بے تکلف کہہ دیا۔

قدرِ تقویٰ بقدرِ عظمت...... اس واسطے احادیث میں آیا ہے کہ حضرات صحابہؓ انتظار میں رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آئے اور آ کر سوال کرے تا کہ علوم کھلیں اور ہم سب کو اس کی بدولت تازہ علوم حاصل ہوں۔ صحابہؓ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ وجلال کی عظمت غالب تھی اس لئے ہر ایک کو سوال کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ شانِ نبوت سے واقف تھے۔ اس لئے ان کی دل پر ہیبت تھی اور خوف تھا۔ اور دیہات والے بیچارے سادے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی جو چاہے آ کر پوچھ لیا جو چاہے آ کر کہہ دیا۔ جیسے کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے ایک دیہاتی بھی آ گیا اس کو دینے میں دیر لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوروں کو دے رہے تھے۔ اس نے کھڑے ہو کر فوراً کہا کہ ''اے محمد! یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے اس میں ہمارا بھی تو حق ہے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''چودھری صاحب تمہیں بھی ملے گا گھبراؤ مت''۔

یہ کہہ دینا کہ یہ مال تیرا نہیں اور نہ تیرے باپ کا ہے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جسے شانِ نبوت کا پتہ نہ ہو۔ اس لئے صحابہؓ منتظر رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آ جائے اور آ کے سوال کرے حضورؐ جواب دیں گے اور ہمارا علم بڑھے گا، جتنا جلال وعظمت دل میں پیدا ہوگی اور ڈر بڑھتا چلا جائے گا۔ اور عظمت خداوندی سے جتنا جاہل ہوگا اتنا ہی آزاد ہوگا جو چاہے کر گزرے۔

تقویٰ کا اعلیٰ ترین ذریعہ...... تو اس کے لئے اعلیٰ ترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل میں خوف خداوندی پیدا کریں تا کہ جرائم سے بچیں اور خوف پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ ہم تصور کریں کہ اللہ مالک الملک ہے۔ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ موت وحیات اس کے قبضے میں ہے۔ صحت وبیماری اس کے ہاتھ میں ہے۔ تونگری ومفلسی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ''جو کچھ وہ کر دے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ کیوں کیا ہے؟''۔ وہ بری ہے ان سب چیزوں سے تو جب یہ یقین وتصور ہوگا بندہ کو کہ وہ غنی مطلق ہے جو چاہے کرے، تو دل میں ہیبت پیدا ہوگی کہ میں ایک بندہ ذرہ بے مقدار ہوں اور مالک الملک کے سامنے ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی بے ادبی ہو جائے۔ تو دل میں ڈر بیٹھ جائے گا

تو پہلا درجہ یہ ہے تقویٰ کا جس کے معنی خوف کے ہیں کہ دل میں اللہ کا ڈر اختیار کرے تا کہ معصیت سے بچ جائے۔
فقر وغنا میں تقویٰ کی ضرورت ...... بہر حال خوف خدا جب دل میں ہوگا تو آدمی مالداری میں بھی گناہ سے بچے گا۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور کیسی پاک نصیحت ارشاد فرمائی ہے۔ حدیث قدسی ہے آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اپنے بندوں سے کہ ”اے بندے! تو نگری اور دولت مندی کے زمانے میں تو مجھے یاد رکھ تا کہ تیری مفلسی کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے! تو اپنی صحت کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تا کہ میں تیری بیماری کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں“۔

اس سے معلوم ہوا کہ تو نگری کی حالت میں ہو تو جب بھی خوف خدا ضروری ہے اور مفلسی کی حالت میں ہو تو جب بھی خوف خدا ضروری ہے۔ اگر تو نگری میں خوف خدا نہیں تو ڈر ہے کہ تو نگری چھن جائے اور اگر مفلسی میں خوف ہے تو ممکن ہے کہ وہ تو نگر بن جائے۔ یہ اللہ کے قبضے میں ہے جسے چاہے دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔ جس کو دینا بہتر سمجھتے ہیں اس کو دے دیتے ہیں مگر دیتے ہیں اسی حد تک جس حد تک باری تعالیٰ کی حکمت و مصلحت اجازت دیتی ہے۔ معاذ اللہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جسے چاہیں لکھ پتی بنادیں اور جسے چاہیں مفلس۔
تقسیم دولت احوالِ قلوب کے مُطابق ہے ...... اس نے جیسی خلقت بنائی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کو یہ دینا مصلحت ہے اور اس کو نہ دینا مصلحت ہے۔ اسے تو نگر بنانا حکمت ہے اور اسے مفلس بنانا مصلحت ہے۔ قلوب کی حالت کو وہی بہتر جانتا ہے جس نے خلقت بنائی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ چار پیسے ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو حقیر جاننے لگتے ہیں ایسوں کو اگر دنیا کی دولت دیدی جائے تو ظلم کا کارخانہ کھل جائے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ لاکھوں روپے آجائیں پھر بھی انسان بنے ہوئے ہیں پھر بھی ان میں وہی دینداری ہے پھر بھی ان میں وہی جذبہ ہے۔ پھر حق تعالیٰ ان کو دولت دنیا میں ترقی دیتے ہیں۔ تو باری تعالیٰ جسے دولت دیتے ہیں اسے جانتے ہیں کہ کس مصلحت کے تحت اسے دولت دی گئی ہے۔
حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ”کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا“ ① بعض دفعہ فقر و فاقہ کفر کا ذریعہ بن جاتا ہے اور آدمی اللہ کی شکایتیں کرنے لگتا ہے اور ایمان کھو بیٹھتا ہے۔ اس کو پیسے دے دیئے جائیں تا کہ ایمان محفوظ رہے اور بعض ایسے ہیں کہ چار پیسے ہاتھ میں آئے وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں انہیں مفلس رکھا جاتا ہے تا کہ وہ آپے میں رہیں۔

تو مفلس اور تو نگری من جانب اللہ ہے۔ جیسی جیسی جس کی خلقت بنائی ہے اس کی مناسبت سے اسے دیتے ہیں۔ ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ ② ہم نے ہی رزق تقسیم کیا ہے ہم نے ہی معاش تقسیم کی ہے اور ہم نے ہی درجے قائم کئے ہیں بعضوں کو اونچا بنایا بعضوں کو نیچا بنایا۔ اب اونچے کا کام یہ ہے

① شعب الایمان للبیهقی، الثالث والاربعون من شعب الایمان وهو باب فی الحث علی ترک، ج:۱ ص: ۲۱۵، مشکوة المصابیح، کتاب الآداب، باب السلام، الفصل الاول، ج:۳ ص:۴۵ رقم: ۵۰۵۱. ② پارہ: ۲۵، سورة الزخرف، الآیة: ۳۲.

کہ وہ جھکے اور شکر کرے اور نیچے کا کام یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ دعاء کرے اور مانگے۔ اس سے دونوں کا فائدہ ہوگا۔ اللہ نے دونوں کے لئے راستہ رکھ دیا ہے۔ تو نگر بھی نجات پائے اور مفلس بھی نجات پائے۔

باطنی دولت...... حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ہر ایک کے کچھ درجات ہیں، کچھ نعمتیں دولت مندوں کو بھی ملیں گی اور کچھ مفلسوں کو بھی ملیں گی یعنی مایوس نہ ہوں کہ ہمیں کچھ ملا ہی نہیں بلکہ ان کے بڑھنے کی دوسری چیزیں ان کو دے دیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے صدقات وخیرات کے فضائل بیان فرمائے کہ صدقات دیں گے، زکوٰۃ دیں گے، دین کا کام ان سے چلے گا۔ وہ بہت دین کا کام کریں گے انکا مال آخرت کا ذریعہ بنے گا، درجات کمائیں گے، ان فضائل سے مفلسوں کا دل ٹوٹنے لگا۔ کہ بھائی یہ تو نگر تو بڑے اچھے رہے کہ دنیا میں بھی انہوں نے مزے کی زندگی گزاری اور آخرت میں بھی ان کے درجات بلند ہیں اور ہم نے دنیا میں بھی مصیبت جھیلی اور آخرت میں بھی ہمارے لئے کچھ نہیں۔ یہ مالدار لوگ بڑھ گئے اور ہم رہ گئے۔ تو یہ گروہ مفلسین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ۔ "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! سَبَقَ اَهْلُ الْاَمْوَالِ الدُّثُوْرِ بِالْاَجْرِ" ۔ ① یہ مالدار تو جیت گئے ہم سے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ مالدار اپنی دولت کا حساب دیتے رہ جائیں اور تم پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہو"۔

انہوں نے کہا کہ بس یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے لئے کافی ہے۔ ہمیں دولت نہیں چاہئے تو بہت سی دولتیں مفلسوں کو بھی دی گئی ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ تو نگروں کو ہی نعمتیں دی گئی ہیں۔ نہیں بلکہ سب کو دی گئی ہیں۔ کسی کو یہاں دی گئی ہے کسی کو وہاں کیا گیا سب کو برابر۔ یہ مالک کی حکمت ہے کہ کسی کو یہاں بڑھا دیا مگر فیضان سب کے اوپر عام ہے اگر کسی کی ظاہری دولت بڑھا دی تو کسی کی باطنی بڑھا دی۔ وہ اپنے رنگ میں خوش ہے یہ اپنے رنگ میں خوش اور بسا اوقات باطنی نعمت اس سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایمان کی دولت مضبوط ہے اور توکل کی دولت مضبوط ہے تو ہزاروں مال اس کے نیچے دب جاتے ہیں اور یہ دولت سب سے اونچی ہو جاتی ہے۔

دولتِ معرفت کا تفوق...... ایک بزرگ کسی شہر میں پہنچے۔ بڑا شہر تھا اور قلعہ بند تھا۔ دیکھا کہ سارے دروازے بند ہیں۔ اور ہزاروں مال گاڑیاں ادھر رکی ہوئی کھڑی ہیں اور ہزاروں مال گاڑیاں اندر رکی ہوئی کھڑی ہیں۔ دن کا وقت ہے اور شہر میں بالکل آمدورفت نہیں ہے۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا تجارتی شہر ہے کہ کروڑوں کا بیوپار ہے اس میں اور دروازے بند ہیں۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی شہر کے دروازے کیوں بند ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ صاحب! بادشاہ کا باز گم ہو گیا ہے (باز ایک شکاری پرندہ ہوتا ہے) اس لئے بادشاہ نے کہا ہے کہ شہر کے دروازے بند کر دو کہیں باہر نہ جا سکے اور پھر ڈھونڈتے پھریں۔

بزرگ بڑی حیرت میں رہ گئے کہ بادشاہ بے وقوف ہے کہ ایک پرندہ کے لئے دروازے بند ہیں۔ بھلا وہ

① مسند الحمیدی، احادیث ابی ذرؓ ج: ۳، ص: ۲۹۷۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے السلسلة الصحيحة ج: ۳ ص: ۱۱۷۔

اڑ کر نہیں جاسکتا چھتوں کے اوپر سے؟ دل ہی دل میں کہا کہ بڑا بیوقوف ہے بادشاہ اور اللہ میاں سے عرض کیا کہ ”خدایا تیری قدرت! کہ کندہ ناتراش کو تو نے بنادیا بادشاہ جسے اتنی بھی عقل نہیں کہ جانور کو روکنے کے لئے جال ڈالنے کی ضرورت ہے یا شہر پناہ کے دروازے بند کرنے کی۔ اسے تو نے ملک دے دیا اور ہم جیسا فضل جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے جس کے اندر علم بھی ہے معرفت بھی اور کمالات بھی بھرے ہوئے ہیں ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں، ایک وقت کھالیا اور ایک وقت فاقہ ہے۔ تو جس میں یہ دولت موجود ہے وہ جوتیاں چٹخاتا پھرے اور جو ایسے احمق اور کندہ ناتراش ہیں وہ تخت سلطنت پر بیٹھ جاویں۔ آپ کی عجیب قدرت ہے“۔

یہ گویا ایک سوال اور غلیان اللہ کے سامنے پیش کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اچھا کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمہارا علم، تمہاری معرفت، تمہارا ایمان چھین کر اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی ساری سلطنت تمہیں دیدیں۔ تیار ہو؟ انہوں نے کہا نہیں اس پر تیار نہیں ہوں۔ معلوم ہوا کہ ایمان کی قوت زیادہ تھی اور توکل کی قوت زیادہ تھی دولت سے ورنہ راضی ہو جاتے کہ میں نے علم بھی دیا ایمان بھی دیا۔ لایئے مجھے تخت سلطنت دیجئے نہیں بلکہ تخت سلطنت پر لات ماردی اور ایمان وعلم اور معرفت نہیں چھوڑی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑی دولت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دونوں دولتیں دے دے کہ مال کی دولت بھی ہو اور ایمان کی قوت بھی ہو اور اللہ پر بھروسہ بھی ہو تو اس کے پاس اللہ نے دین دنیا دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے دے دے۔ تو بہرحال دولت دنیا بھی ایک نعمت ہے اور دولت دین اس سے بڑھ کر نعمت ہے اور جمع ہو جاویں تو سب نعمتوں سے بڑھ کر نعمت ہے۔

صبر وشکر کے ذریعے ترقی درجات دونوں کے بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ مالداری کے اندر آدمی غرور میں نہ پڑے اور ہر وقت شکر گزار رہے اپنے پروردگار کا اس لئے کہ جو کچھ اسے ملا ہے وہ اس کا حق نہیں تھا بلکہ محض عطاء خداوندی ہے۔ اللہ کے اوپر کسی کا حق نہیں۔ جب فضل سے ملے تو شکر واجب ہوتا ہے لہذا ملنے پر شکر ادا کرے اور جس کو مفلسی دی ہے وہ عدل سے دی۔ گویا حکمت وانصاف کا یہی تقاضا تھا کہ اس کو اس حالت میں رکھا جائے تا کہ وہ صبر کرے کیونکہ دونوں ہی راستے جنت کی طرف لے جاتے ہیں۔ صبر اپنے راستے سے جنت میں پہنچائے گا اور شکر اپنے راستے سے جنت کی طرف لے جائے گا، ہیں دونوں کامیاب اور ناجی! اور محبوب خداوندی شاکر بھی ہے اور صابر بھی۔ علماء میں ایک عالم گذرے ہیں فن نحو کے بہت بڑے امام جن کا نام ہے اشم اور انتہائی درجہ بدصورت تھے۔ جتنی بدصورتی کی علامتیں ہیں وہ سب ان میں جمع تھیں، رنگ بے حد کالا، دانت بہت چوڑے چوڑے، آنکھیں نہایت چھوٹی اور کرنجی اور آنکھوں میں چیڑے لگے ہوئے، دانتوں میں زرد رنگی لگی ہوئی غرض جتنی بدصورت کی علامتیں ہو سکتی ہیں ساری ان میں جمع تھیں اور علم وہنر کا یہ عالم کہ بہت اونچا اور بہت بلند، ان کی شادی ایک ایسی عورت سے ہوئی کہ دور دور تک اس کی نظر نہیں تھی، جب خاوند اور بیوی آمنے سامنے بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے

دھوپ چھاؤں، کہ ایک طرف دھوپ نکل رہی ہے اور ایک طرف سایہ ہے اور ایک طرف نور اور ایک طرف ظلمت۔

تو آمنے سامنے بیٹھ کر بیوی سے کہتے ہیں کہ میں بھی قطعی جنتی ہوں اور تو بھی قطعی جنتی۔ بیوی کہتی کہ کیا بات ہے۔ فرماتے کہ میں تو اس لئے جنتی کہ تجھ جیسی مجھے بیوی ملی میں رات دن شکر ادا کرتا ہوں اس شکر کے راستے سے جنت میں پہنچوں گا اور تو اس لئے جنتی کہ مجھ جیسا بدصورت خاوند تجھے ملا تو رات دن صبر کرتی ہے کہ کس بلا میں گرفتار ہوگئی۔ اسلئے تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچے گی۔ تو میں بھی جنتی اور تو بھی جنتی۔ اس بناء پر دولت مند کے لئے اللہ نے شکر کا راستہ رکھا ہے اور وعدہ ہے۔ ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ ① ''جتنا تم شکر کرو گے اتنا ہی میں اس نعمت کو بڑھاتا چلا جاؤں گا''۔ یہ صاحب دولت کے لئے ترقی درجات کا ذریعہ ہے۔

غریب اور مفلس کو حکم ہے کہ تو کسی دولت مند کی دولت پر نگاہ مت کر، صرف میرے اوپر نگاہ رکھ اور صبر اختیار کر میں نے کتنی دولت تیرے لئے جمع کر رکھی ہے۔ تجھے معلوم نہیں ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ عنقریب ملنے والی ہے۔ حدیث صحیح میں موجود ہے کہ اگر کوئی شخص دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ مجھے رزق دے دے، مجھے دولت دے دے، فاقے اتر رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ دعا پوری نہیں ہوتی مہینے گزر گئے، برس گزر گئے، حتیٰ کہ عمر گزر گئی۔ اب اس نے کہا کہ کچھ بھی میری قسمت میں نہیں ہے، مانگتے مانگتے تھک گیا نہیں ملا، قیامت میں جب میدان محشر میں پہنچے گا تو دیکھے گا کہ اجر و ثواب کے ڈھیر کے ڈھیر بھرے ہوئے ہیں، ہزاروں، لاکھوں کو وہ نعمتیں نہیں ملیں جو اس کے لئے جمع ہیں۔

عرض کرے گا کہ اے اللہ یہ نعمتیں کہاں سے آئی ہیں۔ میں نے تو کوئی عمل نہیں کیا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تو دعائیں نہیں مانگا کرتا تھا؟ اس دعا کو ہم نے پالا پرورش کیا، بڑھایا۔ یہ تیری ان دعاؤں کے ثمرات ہیں۔ وہاں دنیا میں اگر دیدیتے تو تو آپے سے باہر ہو جاتا۔ اس لئے ہم نے تیری دعا کو ذخیرہ کیا۔ اب تو ابدی طور پر عیش و آرام کر تیرے لئے انتہائی درجات ہیں۔ تو غریب کے لئے موقعہ مایوسی کا نہیں اور امیر کے لئے موقعہ کفرانِ نعمت کا نہیں۔ اس پر شکر واجب ہے، اس پر صبر واجب ہے اور دونوں کے اوپر اعتماد علی اللہ واجب ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے تو میرا کوئی حق نہیں محض اپنے فضل و کرم سے دیا ہے اسے اگر نہیں دیا تو کوئی ظلم نہیں ہے وہ عدل ہے جس کی وجہ سے نہیں دیا ہے، دونوں انشاء اللہ کامیاب ہیں۔ باقی جسے بھی جو ملتا ہے وہ ملتا ہے، فضل خداوندی سے کسی کا کوئی حق اللہ کا اوپر نہیں کہ وہ مجبور کرے بھلا اللہ پر کس کا جبر چل سکتا ہے، بہر حال تقویٰ اور اس کی فضیلت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین!

دعا کیجئے اللہ تعالیٰ اعمال صالحہ کی توفیق عطاء فرمائے۔ خاتمہ بالخیر فرمائے۔ اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے۔ (آمِيْن يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْن)

---

① پارہ:۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ:۷۔

اسلام میں عید کا تصور

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْعِیْدُ لِمَنْ خَافَ الْوَعِیْدَ لَا لِمَنْ لَبِسَ الْجَدِیْدَ (صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ)①

اجتماعیتِ عامہ!...... بزرگانِ محترم! دنیا کی ہر قوم تہوار رکھتی ہے، اور اپنی حد تک اسے شاندار طریقے سے مناتی ہے، پارسیوں میں نوروز اور مہرجان کی عیدیں ہیں، عیسائیوں میں کرسمس اور بڑے دن وغیرہ کے نام سے عید ہے، ہندوؤں میں ہولی، دیوالی وغیرہ وغیرہ سینکڑوں تہوار اور آئے دن کے میلے ٹھیلے ہیں۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے عیدین (عید الفطر اور عید قربان) کے تہوار عطاء فرمائے، فرق یہ ہے کہ اقوام عالم میں عید اور تہوار کے معنی رنگ رلیاں منانے یا اپنی قومیت کو مستحکم کرنے اور یا کسی مقتدا شخصیت کی یاد تازہ کرنے کے ہیں۔ اسلام میں عید اور تہوار کے معنی اجتماعی طور پر خدا کی یاد کرنے، اس کی طرف رجوع کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے اور اس کے نام پر غریبوں کی مدد کرنے کے ہیں۔ تاکہ اجتماعیت عامہ کا ظہور عادت اور عبادت دونوں میں ہوجائے، پس اگر مذاہب کے ناموں کے سلسلہ میں ہر مذہب کا نام اس کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے، ہندومت کے لفظ سے طنیت پر روشنی پڑتی ہے، عیسائیت کے لفظ سے ایک ہادی اعظم کی شخصیت سامنے آتی ہے، یہودیت کے لفظ سے ایک قومیت کا تصور بندھتا ہے، پارسیتا سے ایک ملک کا دھیان دلوں میں جمتا ہے جس کا حاصل حدود بندی اور محدودیت ہے تو اسلام کے لفظ سے نہ وطن سامنے آتا ہے نہ ملک، قوم نہ شخصیت بلکہ اطاعت حق میں فنائیت اور مالک الملک میں محویت کے جذبات کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اس کی طرف صاف اشارہ ہے کہ دنیا کے مذاہب نسل، قوم، وطن اور شخصیت پرستی کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکے لیکن اسلام نے اپنے سادہ عنوان

---

① مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ العیدین، وانہ قال: لیس العید لمن لبس الجدید انما العید لمن امن الوعید، ج:۵، ص:۱۴۳۔

ہی سے ان تمام حد بندیوں کو توڑ کر ایک عالمگیر تصور سامنے رکھا اور وہ اطاعت حق ہے کیوں کہ حق خود لا محدود اور وسیع ہے اس کی اطاعت کا دم بھرنے والی قوم بھی اپنے کو مسلم کہہ کر عبادت گزار بن کر اور عبادت غیر سے منقطع ہو کر گویا اعلان کرتی ہے کہ وہ ایسی ذات سے تعلق رکھتی ہے جو وسیع سے وسیع تر ہے دنیا کی پوری زمین اور اس کے رقبے اور رقبوں پر بسنے والی قومیں اپنی حد بندیوں سے اس کی لامحدود وسعتوں میں خلل انداز نہیں ہو سکتیں۔

حکمتِ دوگانہ...... ٹھیک اسی طرح تہواروں اور عیدوں کے سلسلہ میں اپنے تہواروں سے ہر قوم اگر یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ رنگ رلیوں میں منہمک ہو کر اپنی نفسیات کی پابند ہے یا کسی بڑی شخصیت کا میلاد منا کر وہ صرف اس عظمت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے جو اس کے دل میں اس شخص کو موجزن ہے گویا وہ اپنی شخصی عقیدت مندیوں کی پابند ہے یا کسی وطن اور قوم کا نام ابھار کر کے اپنے کی اس کا اسیر اور پابند دکھانا چاہتی ہے۔ تو مسلم قوم عیدوں کے تہواروں میں خدا کی جناب میں دوگانہ ادا کر کے اور اسکے نام پر قربانی دے کر حاجت مندوں پر فطرہ کا صدقہ اور قربانی کا صدقہ بانٹ کر گویا یہ بتلانا چاہتی ہے کہ ایک طرف تو وہ صرف خدائی نام لیوا ہے اور اس کی عظمتوں کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے۔

حکمتِ فطرانہ وقربانی...... اور دوسری طرف دنیا کے مفلوک الحال انسانوں کو اس خوشی کے موقع پر صدقہ اور خیرات دے کر یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ ایک عوامی اور عالمی قوم ہے جس کو نہ قبیلے تقسیم کر سکتے ہیں نہ ملکوں کی حد بندیاں بانٹ سکتی ہیں۔ نہ شخصیتوں کی عقیدت مندیاں اسے دوسری شخصیتوں کی عظمت وعقیدت سے روک سکتی ہیں۔ اور یہ ہی وہ جماعت کبریٰ ہے جسے لے کر اسلام دنیا میں آیا ہے اور جس کا اعلان اس نے اپنے نام اور اپنے کام سے قدم قدم پر کیا ہے۔

روحِ عید...... بہر حال اسلامی تہوار نفسیاتی یا قومیتی یا شخصیاتی تصورات کے آئینہ دار نہیں بلکہ اجتماعیت عامہ کے حامل ہیں اور یہ اجتماعیت عامہ وطن، قوم، نسل شخصیت کے تصور سے نہیں بن سکتی تھی بلکہ ان سب سے بالاتر اور مافوق ذات سے وابستگی سے ہی بن سکتی تھی جس کا نام پاک اللہ رب العزت ہے۔ تو ان تہواروں کی روح اسی کا نام اور اسی کی عظمت مطلقہ قرار دی گئی ہے چنانچہ عید کی نماز کے لئے جب مسلمان چلتے ہیں تو رنگ پھینکتے ہوئے۔ یا کسی شخصیت یا قومیت کے نعرے لگاتے اور جے کار کرتے ہوئے نہیں چلتے بلکہ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ.

عید الفطر میں آہستہ آہستہ اور عید قربان میں بآواز بلند تہوار کے لئے روانگی ہوتی ہے تو تکبیر یا دالٰہی عظمت خداوندی اور توحید کے اعلان کے ساتھ ہوتی ہے اس میں نہ شور ہے نہ شر نہ ہنگامہ آرائی نہ میلوں، ٹھیلوں کی شان ہے بلکہ قدوسیوں، سبوحیوں اور مقدس ملائکہ کی صفوں کی طرح تسبیح الٰہی اور تقدس ربانی کہتے ہوئے روانہ ہوتے ہیں عیدگاہ میں پہنچ کر بھی تسبیح وتہلیل جاری رہتی ہے اس کے بعد امام آگے بڑھتا ہے اس کے تکبیر تحریمہ کہتے ہیں مکبر

تکبیرات کی آوازیں بلند کرتے ہیں، تلاوت قرآن ہوتی ہے سب مقتدی سکون وخشوع کے ساتھ اسے سننے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رکوع وسجود سے اپنے مالک کے سامنے بندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور آخر کار سلام پھیر کر پھر تکبیرات کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔

عظیم اجتماعیت...... نماز سے فارغ ہوتے ہی امام خطیب کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور ممبر پر کھڑے ہوکر وعظ ونصیحت اور احکام سناتا ہے جس کو تمام مقتدی سماع عظمت وقبول سے سنتے ہیں۔ اس عبادت سے فارغ ہوکر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اس خوشی کے موقع پر جبکہ ہر طرف چہل پہل اور روحانی مسرتوں کا دلوں پر ہجوم ہوتا ہے۔ ممکن تھا کہ اس میں کسی نفسانی تفریح یا دنیاداری کے جذبات کی آمیزش ہو جائے، تو ان تہوار منانے والوں کے لئے مسنون کیا گیا کہ قبرستان میں جاکر اپنے مردہ بھائیوں کی ارواح سے ملاقات کریں۔ ان کو ثواب پہنچائیں ان سے قریب تر ہوں تاکہ ان کو آخرت کے گھرانے دیکھ کر خود بخود اپنی آخرت کی یاد تازہ ہوجائے اور دنیا میں اس خوشی کے موقع پر ادھر سے دھیان نہ ہٹ جائے۔

دوسرے لفظوں میں یہ بتلانا ہے کہ مسلمان اجتماعیت کبریٰ کو لے کر اٹھا ہے اس کا دائرہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ عالم برزخ کے اربوں کھربوں انسان بھی اس کی اجتماعیت کے ممبر ہوں اس کی بنیاد ڈالی ہے جو دنیا سے گزر کر برزخ سے گزر کر عالم حشر تک جا پہنچتی ہے جس میں دنیا کے کسی ایک قرن کے ہی انسان نہ ہوں گے۔ بلکہ آدمؑ کی ساری اولاد اور اولین وآخرین کی ساری شخصیتیں مجتمع ہوں گی۔

عوالم گیر اجتماعیت...... پس جو لوگ مسلمانوں سے ہٹ کر اجتماعیت کا نام لیتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ علمی اجتماعیت کا دم بھریں گے اور وہ بھی صرف اپنے زمانے کے ملکوں اور قوموں سے کوئی سیاسی رابطہ قائم کرلیں گے۔ لیکن حقیقتاً جو قوم اجتماعیت کے لئے دنیا میں برپا کی گئی ہے وہ عید کے وظائف کی رو سے گویا اس اجتماعیت کو پکڑ کر ایک غیر محدود اجتماعیت ظاہر کرتی ہے اور اس کا رابطہ اجتماعی دنیا سے اتر کر برزخ کے ان تمام پاکباز انسانوں سے قائم ہوتا ہے جو ایمان کے ساتھ اس عالم سے گزر کر اس عالم میں پہنچ گئے ہیں اور گویا وہ محض دنیا والے بھائی بھائی کا نعرہ لگاتے ہیں مگر اس ساری اجتماعیت کی حقیقی روح جس سے یہ عالم گیری نہیں عوالم گیر اجتماعیت بن جاتی ہے۔ خدا کا نام ہے کہ اس سے زیادہ واسع اور وسیع کوئی نہیں۔ اس لئے عید کے لئے جیسے اس دنیا میں ایمان کی قید ہے ایسے آخرت کے باشندوں کی ملاقات کے لئے بھی وہی ایمان کی شرط ہے اور ایمان کے معنی بجز اس کے دوسرے نہیں کہ اللہ رب العزت کی ذات وصفات، افعال واوامر ونواہی اور اس کے قوانین کو مانا جائے کیونکہ اس کے بغیر یہ وسعت واجتماعیت قائم ہی نہیں ہوسکتی کیونکہ اس سے زیادہ وسیع رشتہ اور معیار ہی دوسرا نہیں۔

خوش قسمت قوم...... اس لئے عید تہوار تو ہے، مگر محض لفظ ”تہوار“ کی وجہ سے اسے دنیا کی عام اقوام کے تہواروں کی نظر سے نہ دیکھا جائے، کہ اس کی غیر معمولی وسعتیں ان دوسرے ظرفوں میں کسی طرح نہیں سماسکتیں۔

پس خوش قسمت ہے وہ قوم جسے ایسے تہوار دیئے جائیں اور خوش نصیب ہیں وہ افراد، جو ان تہواروں میں ان کی شرعی حدود و شروط کے مطابق شرکت کریں، تہوار عید بندگی حق اور خدمت خلق ہے۔ نہ کہ محض نیا اور فاخرہ لباس، عطر و خوشبو اور شیریں چیزیں کھا پی لینا۔ اسی لئے حدیث نبوی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "اَلْعِیْدُ لِمَنْ خَافَ الْوَعِیْدَ لَالِمَنْ لَبِسَ الْجَدِیْدَ" ..... ترجمہ: "یہ عید اس کے لئے ہے جو خدا سے ڈرا اور اس کی طرف جھکا نہ کہ اس کی جس نے عمدہ اور نئے کپڑے پہن لئے"۔

عید کا اصلِ اصول..... بس عید کا حاصل؟ ذکر الٰہی، ذکر ربانی، خدمت خلق اللہ، روح اجتماعیت دنیا میں رہ کر آخرت کو نہ بھولنا اور زندوں کے ساتھ ہی اموات سے بھی رشتہ جوڑے رکھنا اور ان میں سے ہر چیز کی روح اور معیار ایمان کو قرار دینا نہ کہ ظاہرداری اور دنیا سازی، تا کہ خلق اللہ کے ساتھ اللہ سے وابستگی اصل اصول ثابت ہو۔

سال بھر کے لئے نورانی اثرات..... ساتھ ہی یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عبادتیں دو طرح کی ہیں ایک فعلی اور ایک ترکی، نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ فعلی ہیں جس میں کچھ افعال ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ترکی عبادت روزہ ہے جس میں ترک اکل، ترک شرب اور ترک لذات ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پورے ایک ماہ تک محبت حق میں دنیا کے اس معظم حصے کو ترک کئے رہنا کوئی معمولی مجاہدہ نہیں بلکہ نفس کی ایک عظیم قربانی ہے۔ جیسے بغیر مدد خداوندی پورا نہیں کیا جا سکتا۔ ماہ رمضان المبارک میں دن بھر اس مجاہدے سے نفس کو رگڑ کر اور مانجھ کر اس میں صفائی پیدا کی جاتی ہے لیکن کسی ظرف میں محض صفائی آ جانا اور میل کچیل دور ہو جانا کافی نہیں جب تک کہ اس میں آب نہ آ جائے اور وہ چمک نہ اٹھے ایک قلعی گر بھی برتن کو اول رگڑتا اور مانجھتا ہے، اینٹ، پتھر سے برتن کو رگڑ کر اپنے پیروں تک اسے پامال کرتا ہے تا کہ برتن کا میل صاف اور زنگ دور ہو جائے لیکن محض صفائی کے لئے برتن قلعی گر کے یہاں نہیں بھیجا جاتا بلکہ اصل مقصود اس کی آرائش اور جگمگاہٹ ہوتی ہے چنانچہ قلعی گر بھی اس صفائی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ صاف برتن کو آنچ دیتا ہے اور تپا کر جب صاف شدہ برتن پر قلعی پھیرتا ہے تو اسی دم برتن چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے اور قلعی گر کے پاس برتن بھیجنے کا مقصد اب آ کر پورا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ظرف قلب کو صاف کرنے کے لئے تو رمضان کے روزے رکھے گئے ہیں تا کہ نفس کی محبوبیت اس سے چھڑا کر اسے رگڑ دیا جائے اور غیر اللہ کی محبت والفت کی ان آلائش سے اسے صاف کیا جائے پس روزے کے یہ ترک نفس کے لئے وہی کام کرتے ہیں جو برتن مانجھنے کے لئے اینٹ، پتھر اور مٹی کام کرتی ہے۔ دن بھر جبکہ نفس کی رگڑائی ہوئی اس کا دانہ پانی بند کر کے اس کی نفسانی لذات کے دروازے بند کر دیئے گئے اور اس عمل سے اس کی روحانی آلائشوں کا میل کچیل نکال دیا گیا تو شب کو اس پر قلعی کا سامان تراویح اور تلاوت قرآن سے کیا جاتا ہے تا کہ دن بھر تپائے ہوئے نفس پر کلام خداوندی کی قلعی سے آب اور چمک پیدا کر دی جائے اور اس کی روح نور الٰہی سے جگمگا اٹھے۔ یہ تیس کے تیس دن دن بھر کی کائی رگڑائی اور منجھائی اور پھر شب بھر قلعی ایک ماہ میں انسانی

نفس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ سال بھر تک اس چمک دمک سے فائدہ اٹھاتا رہے اور میل کچیل سے مبرا رہ کر ان نورانی اثرات کو سال بھر تک استعمال کرے بشرطیکہ اس مجاہدہ کے اثرات کو سال بھر باقی رکھنے میں ساعی رہے۔

اجتماعیاتی صلاحیت کا شکرانہ...... بہرحال یہ ایک ماہ سال بھر کی نورانیت کی کفالت کرتا ہے اور بندے کے خدا سے قریب تر ہونے کے تمام موانع کو دور کر دیتا ہے تاکہ اس سے قریب ہو کر بندہ وسیع الظرف اور وسعت عامہ کا اہل ہو جائے اور اس کی ذات اسلام کی اجتماعیت کبریٰ کی طویل و عریض زنجیر کی ایک مضبوط کڑی ثابت ہو۔ پورے ایک ماہ کی اس مشقت محنت اور اس پر مرتب شدہ اجتماعیاتی صلاحیت جیسی عظیم نعمت ملنے پر جو محض خدا کی مدد اور اس کی توفیق ہی سے اسے میسر ہو سکی تھی، اتنی ہی بڑی شکرگزاری کا فریضہ بندے پر عائد ہوتا تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ادائے شکر کا طریقہ دوگانہ عید کو قرار دیا کہ ادھر رمضان کامیاب ہو کر ختم ہوا ادھر اسی دم ہلال عید آسمان سے سر نکال کر یہ اعلان کرے "اے بندو! اس عظیم کامیابی پر جو تمہیں اجتماعیت کبریٰ کی صلاحیتوں کے ملنے کی صورت میں حاصل ہوئی ہے۔ اپنے مالک کا شکر ادا کرو، یا بالفاظ دیگر رمضان میں جو صلاحیتیں تمہیں عطاء کر دی گئی ہیں ان کو عید کے میدان میں جمعیت میں لا کر ان صلاحیتوں کا عملی ثبوت دو اور اجتماعیت عامہ کی صورت اور حقیقت اجتماع عید میں توجہ الی اللہ کے ساتھ نمایاں کر کے دکھلاؤ۔

حقیقت رمضان...... پس رمضان المبارک صلاحیتیں پیدا کرنے کا مہینہ ہے اور ماہ عید اُن صلاحیتوں کے عملی آغاز کا مہینہ ہے جس کا سلسلہ سال بھر تک جاری رہتا ہے، اس درمیان میں اگر کچھ کمی یا کوتاہی راہ پاتی ہے تو اگلا رمضان پھر اگلے سال کے لئے ان کوتاہیوں کو دور کر کے ان صلاحیتوں کی تجدید کر دیتا ہے تاکہ نہ مجاہدے کا سلسلہ ختم ہو، نہ اجتماعیت کی روح مضمحل ہونے پائے اور انسانی عمر اسی مبارک سلسلہ میں ختم ہو جائے۔

فرد مسلم کا درجہ اُمت...... تاکہ جب وہ اپنے رب سے ملے تو تنہا اپنا نفس ہی ساتھ نہ لے جائے بلکہ اس کے ساتھ اجتماعی نسبتوں کی ایک عظیم کمک ہو۔ لاکھوں دعائیں ہوں جو اس اجتماع میں مل کر کی گئی تھیں۔ ہزاروں ایصال ثواب ہوں جو عید کے موقع پر اموات تک پہنچائے گئے تھے۔ کروڑوں باطنی ہمتیں ہوں جو صف بندیوں میں ایک کی دوسرے کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور دنیا و برزخ کے تعلقات کے بے شمار رشتے ہوں جو اس کے لئے جناب باری میں سفارشی اور مساعی ہوں تاکہ اس فرد پر جو اجتماعی صلاحیتوں سے ایک امت بن کر اپنے خدا کے پاس پہنچ رہا ہے۔ اللہ کی لاکھوں رحمتیں متوجہ ہوں اور وہ اسی طرح اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر کے سرخروئی کے ساتھ اپنے مالک سے جا ملے۔

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ①

① پارہ: ۴ سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۸۵۔

محبت و معیت

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّابَعْدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ وَقَالَ اللّٰہُ جَلَّ ذِکْرُہٗ: فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ۔

حقیقتِ ہر شئی ...... بزرگانِ محترم! دنیا کی ہر چیز بلکہ ہم اور آپ بھی دو چیزوں سے مرکب ہیں۔ ایک ہمارا ظاہری حصہ ہے جس کو ہم بدن کہتے ہیں یہ ہیئت و شکل ہے مثلاً آنکھ ہے جس سے ہم ایک دوسرے کی شکل و صورت دیکھ کر پہچانتے ہیں۔ یہ ظاہری حصہ اور ظاہری پیکر ہے اور ایک اس کے اندر پوشیدہ حقیقت ہے۔ وہی درحقیقت انسان ہے۔ اس صورت ظاہری کا نام انسان نہیں۔ انسان حقیقت کا نام ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے اس کے دکھلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ صورت بنادی ہے جو کہ دراصل ذریعہ تعارف ہے اصل مقصود نہیں ہے۔ پھر مقصود کہاں ہے؟ شریعت اسلام پتہ دیتی ہے کہ اندرونِ باطن ایک قلب ہے اسی میں ساری حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں اور اسی کا نام انسان ہے، اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے جب پھیلایا اور صورت و شکل دی تو قالب نمودار ہوگیا۔ شکل بن گئی۔ اب اسے دیکھ کر پہچان گئے کہ یہ فلاں ہے یہ فلاں ورنہ حقیقت میں انسان قلب ہی ہے اور اسی کے اندر سب کچھ پوشیدہ ہے۔

تائید و نکتہ چینی ...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا فرمایا اور بدن بنایا۔ ابھی اس میں روح بھی نہیں ڈالی تھی تو ملائکہ علیہم السلام اس کی زیارت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے عجیب شکل و صورت بنائی ہے اور بہت ہی عمدہ ہے اور سب کے دل میں ایک عظمت و محبت اس صورت کی بیٹھ گئی۔ ادھر ابلیس کو بھی حکم ہوا کہ تو بھی اس صورت کو جا کر دیکھ۔ اس کے دل میں عداوت چھپی ہوئی تھی، اس نے جا کر دیکھا اور حضرت آدمؑ کے پتلے کے اندر گھسا

① پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۶۵۔

اور ریزے ریزے میں سرایت کی، بعد میں اس نے کہا کہ کوئی عجیب چیز نہیں ہے اور کہا کہ نَفْسٌ لَا تَتَمَلَّكُ یہ تو اندر سے کھوکھلا ہے خود کو بھی نہیں سنبھال سکتا ہے جب تک کہ باہر سے اس کی مدد نہ ہو اور غذا، ہوا، گرمی باہر سے نہ پہنچے اس کے اندر کوئی طاقت نہیں۔ اس ابلیس نے اپنی شیطنت اور عداوت کے مطابق رپورٹ دی۔

سارے ملائکہ نے تو تائید کی اور مدحت کی اور اس کمبخت نے آ کر نکتہ چینی کی مگر یہ کہا کہ میں نے سارے بدن میں گھس کر دیکھا ہے یہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہے البتہ اس کے بیچ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی ہے اس میں سب کچھ ہوگا اگر ہوا۔ وہاں میں گھس نہ سکا۔ اشارہ تھا قلب کی طرف کہ جو کچھ حقیقت ہے وہ اس قلب میں رکھی گئی ہے اس کی حقیقت اس لعین کے سامنے نہ کھل سکی وہاں جا کر مجبور ہو گیا۔

اقلیم بدن کا بادشاہ...... چنانچہ سب سے بڑی چیز انسان میں قلب ہے۔ اور باقی جتنے اعضاء ہیں سب اس کے خدام ہیں۔ قلب میں جو جذبہ پیدا ہوتا ہے یہ سب خدام اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اگر دل میں آیا کہ کسی چیز کو دیکھوں تو دل آنکھ کو زبان سے آرڈر نہیں دیتا کہ تو دیکھ بلکہ دل میں خیال آتے ہی آنکھ اپنا کام شروع کر دیتی ہے، دل میں خیال آیا کہ میں چلوں، تو دل کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ پاؤں کو زبان سے حکم دے کہ چلو، بلکہ دل کا منشاء ہوا اور پیروں نے حرکت شروع کر دی۔ دل نے کسی چیز کو پکڑنا چاہا تو دل ہاتھوں کو لفظوں میں حکم نہیں دے گا کہ اے ہاتھو! تم پکڑو۔ بلکہ دل میں جذبہ آیا اور ہاتھوں نے اپنا کام شروع کر دیا تو انسان کے تمام اعضاء خدام ہیں۔ اصل حاکم اعلیٰ اور اس اقلیم بدن کا سلطان وہ دل ہے اور دل میں ہی سب کچھ ہے۔

قلب اصل ہے یا دماغ؟...... اس میں اطباء اور موجودہ زمانے کے ڈاکٹروں کا اختلاف ہوا ہے کہ اصل انسان میں دماغ ہے یا قلب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اصل انسان میں دماغ ہے کیونکہ اسی سے تمام چیزیں چلتی ہیں اسی میں شعور ہے، اسی میں ادراک ہے، اسی میں علم ہے، اسی میں احساس ہے اور قلب صرف ایک آلہ ہے جو خون کے ذریعے سے دماغ کو بنا دیتا ہے اور دماغ کے اندر کچھ چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہر حال وہ کہتے ہیں کہ قلب آلہ کار ہے اصل نہیں ہے۔ یہ بعض اطباء کا بھی خیال ہے اور اس زمانے کے ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ بالکل غلط ہے اور یہ بھی نہیں کہتے کہ بالکل صحیح ہے بہت سی اس میں صحت بھی ہے اور بہت سی اس میں غلطیاں بھی ہیں۔

مدارِ اعمال قلب ہے...... چنانچہ ہم بنانے والے کی طرف رجوع کریں گے کہ اس نے کس چیز کو اصل کہا ہے حق تعالیٰ خالق ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز بنائی ہے اور کس لئے بنائی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں کی اصلاح کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو علم دیا گیا ہے اس بات کا کہ دل کیا ہے اور دماغ کیا ہے اور ہاتھ پیر کیا ہیں اس لئے ہم نے رجوع کیا کہ بنانے والے سے پوچھو کہ اصل کیا چیز ہے قلب ہی اصل ہے یا دماغ اصل ہے۔ تو شریعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلب ہی اصل ہے وہی حاکم مطلق ہے اس اقلیم بدن کا۔ بدن کی ساری حکومت اسی سے چل رہی ہے۔ حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ

صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ" ① ''انسان کے بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے وہ اگر صحیح ہو تو سارا انسان صحیح ہے وہ اگر غلط ہے تو سارا انسان غلط ہے اور فرمایا کہ وہ قلب ہے''۔

تو انسان کی خوبی و خرابی کا دار و مدار قلب پر ہوتا ہے۔ دل ہی کے اندر نیت پیدا ہوتی ہے اور نیت سے سارے اعمال بنتے ہیں اور فرمایا گیا کہ ''إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" ② ''سارے اعمال کا مدار نیت پر ہے''۔ نیت اچھی ہے تو عمل بھی اچھا ہے اور نیت اگر بری ہے تو عمل بھی برا ہوگا اور نیت کا دار و مدار قلب کے اوپر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سارے کے سارے اعمال و افعال کا دار و مدار انسان کے قلب پر ٹھہر گیا اور فی الحقیقت زندگی بھی قلب ہی سے چلتی ہے۔

مدارِ حیات قلب ہے...... جیسے اعمال کا مدار قلب پر ہے ایسے ہی حیات کا مدار قلب پر ہے، کیونکہ قلب پہلے زندہ ہوتا ہے پھر حیات دماغ میں پہنچتی ہے۔ تو اس بناء پر مدارِ حیات دل کے اوپر رکھا گیا ہے اور اطباء بھی اسی کا اقرار کرتے ہیں۔ اطباء کہتے ہیں کہ آدمی جو غذا کھاتا ہے وہ اولاً معدے کے اندر پہنچتی ہے۔ معدے کے اندر خار ہوتے ہیں جو اسے پیستے ہیں اور چیں کر کر ریزہ ریزہ بنا دیتے ہیں۔ اس میں جو حصہ فضلات کا ہے وہ زائد ہے وہ انتڑیوں میں چلا جاتا ہے اور بول و براز ہو کر نکل جاتا ہے اور جو رقیق جوہر ہے اس کو قلب معدے کی طرف سے جگر کی طرف بھیجتا ہے۔ معدے کی طرف سے جگر کی طرف کو جانے والی نالیوں کی شکل کی چھوٹی چھوٹی رگیں ہیں ان کے ذریعے سے وہ غذا جگر میں پہنچتی ہے۔

جگر کو کہتے ہیں کہ وہ طباخ اور بدن کا باورچی ہے، جگر میں گرمی اور حرارت ہے وہ اس گرمی سے حریرے کو پکاتا ہے اور خوب گرمی پہنچاتا ہے جب وہ ہنڈیا پکتی ہے تو اس میں ایک حصہ ابال کا آتا ہے جھاگ کی شکل میں ایک حصہ نیچے بیٹھ جاتا ہے جسے تلچھٹ کہتے ہیں۔ ایک حصہ بیچ میں پانی میں رہتا ہے وہ کھولتا رہتا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ جو اوپر کا حصہ ہے جھاگ کا وہ بلغم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور نیچے کا حصہ جو تلچھٹ ہے سیاہ ہوتا ہے اسے سوداء کہتے ہیں اور بیچ میں جو رقیق اور پتلا حصہ ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ وہ صفراء ہے۔

تو سوداء، صفراء، بلغم۔ یہ تین حصے ہیں جن کو جگر تیار کرتا ہے اور پکاتا ہے ان تینوں چیزوں کے مجموعے سے خون بنتا ہے تو جگر کا کام ہے خون بنانا، معدہ کا کام تھا غذا کو پیسنا۔ پھر جگر اسی خون کو بھیجتا ہے قلب کی طرف۔ جگر سے قلب کی طرف جانے والی بہت باریک رگیں ہیں جن کو طب کی اصطلاح میں شرائین کہتے ہیں (شرائین جمع ہے شریان کی) ان ہی باریک رگوں سے خون قلب کے طرف پہنچتا ہے۔ اور قلب کی شکل تو مڑی کی سی ہے کہ اوپر سے پتلا، بیچ میں سے موٹا، پھر نیچے سے پتلا۔

اوپر کے حصے کو کہتے ہیں بطن عالی اور نیچے کے حصے کو بطن سافل۔ ان میں باریک اور رقیق خون پہنچتا ہے اور قلب

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ج: ١، ص: ٩٠.

② الصحيح للبخاري، كتاب بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي، ص: ١ رقم: ١.

ستھرا شہر ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ دوست کہے گا کہ خدا کے بندے آنکھیں تیری کھلی ہوئی تھیں۔ چیزیں سامنے تھیں اور تو کہتا ہے کہ نہیں دیکھیں تو جواب میں کہتا ہے کہ اوفوہ میرا دھیان دوسری طرف تھا، مجھے خبر نہیں ہوئی کہ میرے سامنے کیا چیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھیں نہیں دیکھتی بلکہ دل دیکھتا ہے اگر دل ہی دھیان نہ کریں تو آنکھوں کو کوئی چیز نظر نہیں آئے گی گھنٹے بج رہے ہیں آوازیں آرہی ہیں۔ لوگ سارے سن رہے ہیں مگر آپ کو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا لوگ کہتے ہیں کہ بہت گھنٹے بجے آوازیں آئیں، آپ کہتے ہیں کہ میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ ہم نے تو سب کچھ سنا ہے، وہ کہتا ہے کہ اوفوہ اصل میں میرا خیال دوسری طرف متوجہ تھا، مجھے سننے کا خیال ہی نہیں آیا۔

معلوم ہوا کہ کان نہیں سنتا بلکہ دل سنتا ہے۔ دل متوجہ ہو جائے تو ساری آوازیں کان میں آئیں گی اگر دل ہی متوجہ نہیں تو کوئی چیز بھی کان میں نہیں آئے گی ذائقہ ہے وہ بھی دل ہی کا کام ہے۔ اچھی سے اعلیٰ غذائیں کھائیں اور دل متوجہ ہو دوسری طرف نہ کھٹے کا پتہ چلے گا نہ میٹھے کا پتہ چلے گا۔ اگر کوئی کھٹے میٹھے کا پتہ پوچھے گا تو کہے گا کہ بھائی میرا دل تو دوسری طرف تھا مجھے کچھ خبر نہیں۔

مجھے ذائقہ پر ایک حکایت یاد آ گئی کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے ایک سالے تھے حاجی مقبول صاحب بہت نیک صالح تھے اور حضرت ہی کے یہاں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اتفاق سے چار پانچ روز تک مسلسل چنے کی دال پکتی رہی۔ اور روزانہ تو آدمی سے پلاؤ کھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے جب تک کہ غذا نہ بدلے۔ انہوں نے اپنی بہن سے کہا کہ کیا تمام دالیں مٹ مٹا کر ایک ہی چنے کی دال رہ گئی ہے ہفتہ بھر ہو گیا ہے اس ایک دال کو ہی کھاتے ہوئے اور جی بھر گیا کبھی دوسری دال بھی پکا لیا کرو۔ انہوں نے اگلے دن ماش کی دال پکائی۔ کھانے کے بعد کہنے لگے۔ آج پھر وہی چنے کی دال پکائی۔ انہوں نے کمر پر ہاتھ مار کر کہا آنکھیں ہیں کہ نہیں چنے کی دال ہے یا ماش کی؟ تو کہنے لگے کہ مجھے کچھ دھیان نہیں رہا میں سمجھ کر وہی چنے کی دال کھا رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چکھنا دل سے ہوتا ہے۔ زبان نہیں چکھتی۔ کھٹے میٹھے کا ذائقہ اس کا احساس اور اس کا ادراک یہ سب دل سے متعلق ہے۔ اس لئے اصل چیز انسان کے بدن میں دل ہے اور باقی سب اعضاء اس کے تابع ہیں۔

مرکزِ اصلاح قلب ہے ..... دماغ بہت اعلیٰ چیز ہے مگر دماغ تفصیل کرتا ہے اس علم کی جو قلب کے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ قلب اپنے اس علم اجمالی کو دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے وہ دماغ کی تلیوں میں چکر کھاتا ہے پھر نظریہ بن جاتا ہے اور نظریہ سے پروگرام بن جاتا ہے پروگرام سے اس کی اشاعت ہو کر پارٹی بن جاتی ہے۔ قلب اگر دماغ کے اندر علم نہ بھیجتا تو نہ نظریہ بنتا، نہ پارٹی وجود میں آتی۔ اسی لئے شریعت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ دل اصل ہے دماغ اس کے تابع ہے۔ ہاتھ پیر بھی اس کے تابع ہیں۔ پیٹ اور پیٹھ بھی اس کے تابع ہیں۔

اسی بناء پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اصلاح کا مرکز دل کو بنایا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ نگاہ بھی

میں گرمی جگر سے بھی زیادہ ہے اور دل پھر اس لطیف جوہر کو پکاتا ہے اور پکانے سے ایک لطیف بھاپ اٹھتی ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی وہ بھاپ رگ و پے میں سرایت کرتی ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ یہ روح حیوانی ہے اسی روح سے آدمی میں حس ہے، احساس ہے عقل ہے زندگی ہے۔ اطباء کی اصطلاح میں اس کو روح حیوانی کہتے ہیں۔

اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا نام روح نَسَمَۃٌ ہے اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ نفس کے معنے پھونکنے اور پھیلنے کے ہیں چونکہ یہ پورے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ اس بناء پر اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل پر مدار ہے۔ انسان کی زندگی کا وہی حیوانی پیدا کرتا ہے جس سے انسان کے بدن میں حس، حرارت اور احساس وغیرہ طاقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ بدن میں قلب اصل ہے دماغ اصل نہیں ہے۔ تمام اعضاء کا تعلق قلب سے ہے دماغ سے نہیں اور زندگی کا مدار بھی دل ہی پر ہے۔ عمل کا جذبہ بھی دل ہی سے ابھرتا ہے۔ محبت اور عداوت بھی دل ہی سے متعلق ہے۔ جس سے ہزاروں معاملات وابستہ ہیں۔

دماغ قلب کے تابع ہے...... تو شریعت کا منشاء یہ ہے کہ اصل چیز انسان میں قلب ہے دماغ نہیں بلکہ دماغ قلب کا تابع ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قلب میں جو علم اور شعور ہے وہ اجمالی ہے مختصر ہے اور مجمل ہے۔ دماغ میں جا کر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور پھیل کر جزئیات نکلتی ہیں۔ پھر آدمی ان سے نظریات قائم کرتا ہے۔ نظریات سے پھر پروگرام بنتے ہیں۔ تو علم اجمالی قلب میں ہے دماغ میں آ کر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور چونکہ تفصیل ہوتی ہے اجمال کیلئے اس لئے دماغ تابع ہے قلب کے برعکس نہیں۔ یہ شریعت کا منشاء ہے اس لئے شریعت اسلام کا موضوع اور مقصد یہ ہے کہ دل کی اصلاح کی جاوے، اگر دل درست ہو گیا تو دماغ بھی درست ہے۔ ہاتھ پیر بھی درست ہیں۔ اخلاق بھی درست ہیں۔ اگر انسان کا دل بگڑ جائے تو نہ زندگی ہے اور نہ عمل ہے، نہ ہنر ہے نہ کمال ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے   کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دل زندہ ہے تو سارا انسان زندہ ہے۔ دل مردہ ہے تو سارا انسان مردہ ہے تو دار و مدار حقیقت میں دل ہی کے اوپر ہے کیونکہ ہر چیز دل سے چلتی ہے، اس لئے شریعت نے دل کو اپنا موضوع بنالیا ہے اگر دل درست ہوگا تو اعمال شرعیہ بھی درست ہوں گے اور سارا بدن درست ہو جائے گا اور دماغ بھی صحیح ہو جائے گا اور اگر قلب بگڑ گیا تو دماغ بھی خراب رہے گا اور تمام اعضاء بھی خراب رہیں گے۔

مدرکِ حقیقی قلب ہے...... یہی وجہ ہے کہ آنکھیں دیکھتی ہیں اور کان سنتے ہیں۔ تو اطباء کہتے ہیں کہ یہ سارا دماغ سے ہوتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ بھی دل سے ہوتا ہے۔ مثلاً آپ بھرے بازار میں جائیں اور اچھی اچھی بلڈنگیں دیکھیں بڑے اچھے اچھے مناظر سامنے ہیں۔ جب آپ واپس آئیں گے تو آپ کا دوست کہے گا کہ بھائی! آج تو بڑی بڑی عمدہ عمدہ بلڈنگیں دیکھی ہیں۔ یہاں تو بڑے اعلیٰ اعلیٰ مناظر ہیں۔ بڑی بہترین سڑکیں ہیں، صاف

ٹھیک ہو جاتی ہے کان بھی درست، ناک بھی درست، یہ غلط ہے تو ساری چیزیں غلط ہیں۔ اگر دل میں خرابی ہے اور نیت بری ہے تو نگاہ بھی لامحالہ غلط جگہ پر پڑے گی اور دل میں تقدس، تقویٰ اور طہارت ہے تو نگاہ بھی غلط جگہ نہیں جائے گی۔ اگر دل میں صلاح تقویٰ ہے تو غلط قسم کی آوازیں باجے گاجے کبھی نہ سنے گا۔ اس طرف توجہ بھی نہ کرے گا اور اگر دل میں دیانت و تقویٰ نہیں ہے تو اس کے لئے جائز و ناجائز سب برابر ہے۔ باجے گاجے بھی سنے گا، حرام آوازیں بھی سنے گا، حلال آوازیں بھی سنے گا۔ اگر دل میں دین ہے تو راستہ درست رہے گا، اچھی چیزوں کی طرف طبیعت جائے گی بری چیزوں سے ہٹ جائے گی۔

افتائے قلب..... چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ "اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ" ① کہ جب تمہیں کوئی معاملہ درپیش ہو تو تم اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کرو، دل آدمی کا مخلص ہوتا ہے وہ بتاتا ہے کہ بات صحیح ہے کہ غلط ہے۔ آپ نے دوست کے اوپر دعویٰ کر دیا کہ یہ جائیداد میری ہے فلاں کی نہیں۔ حالانکہ دل سے جانتا ہے کہ یہ اسی کی ہے میری نہیں ہے۔ آپ نے قانونی طور پر مقدمہ بنایا تاکہ جائیداد میرے نام پر آجائے۔ اس پر وکلاء بحث کریں گے ممکن ہے آپ کامیاب بھی ہو جائیں، جائیداد آپ کی ہو جائے گی، مگر دل آپ کا ملامت کرے گا کہ کمبخت تو غیر کا حق مار رہا ہے۔ دل فتویٰ دے رہا ہے کہ زمین تیری نہیں ہے۔ اگر آدمی دل کی طرف متوجہ ہو جائے تو سارے قصے ختم ہو جائیں لیکن بات تو یہ ہے کہ لوگ مطلب کے پیچھے رہتے ہیں۔

ایک عالم نے فتویٰ دیا جو کہ مرضی کے خلاف تھا۔ اب اس سوال کا دوسرا رخ بدل کر فتویٰ بھیج دیا۔ اب اس فتوے کا دوسرا جواب آ گیا وہ بھی مرضی کے مطابق نہ تھا۔ اب پھر تیسرے مفتی کے پاس بھیج دیا تو جو فتویٰ مرضی کے مطابق ہوا اس پر عمل کر لیا اور جو مرضی کے مطابق نہ ہوا اس پر عمل نہ کیا۔ یہ کوئی شریعت کا حکم ہے؟ یہ کیا شریعت کا پیرو ہے؟ یہ تو اپنے نفس کا تابع ہے، نفس میں جو چیز آ گئی چاہتا ہے کہ اس کے مطابق فتویٰ مل جائے، اس لئے شریعت نے کہا کہ مفتیوں سے فتویٰ بعد میں لینا پہلے اپنے دل سے فتویٰ لے لو، دل انسان کا مخلص ہے وہ سچا مشورہ دے گا اور صحیح فتویٰ دے گا۔

ایمان کا محور دراصل قلب ہے..... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام نے دل کو پکڑا ہے اور اسی کا اعتبار کیا ہے کہ انسان کے ضمیر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ حق ہوتا ہے اور بحث سے اور نفسانی خواہشات سے جو بھی رائے قائم کرے دل اس کو جانتا ہے کہ وہ غلط ہے، ہاتھ چوری کرتا ہے مگر دل ملامت کرتا ہے کہ تجھے حق نہیں دوسرے کے مال چرانے کا، اگر دل کی بات مانے تو کبھی چوری نہ کرے۔ بہر حال دل انسان کا اصل ہے اس لئے شریعت نے دل کو تاکا ہے کہ اس کی اصلاح کر دو، بنیاد درست ہو جائے تو سارا انسان ہی درست ہو جاتا ہے اور بغیر اس کے انسان درست نہیں ہو سکتا۔

---

① مسند الامام احمد، حدیث وابصة بن معبد الاسدی ج: ۳۶ ص: ۳۴۳۔

شریعت نے دل کی اصلاح کے لئے ایمان رکھا ہے۔اس لحاظ سے ایمان کا محل بھی قلب انسانی ہے۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی دل کے اندر ہوتی ہے یہی محبت آدمی سے عمل کراتی ہے۔دل کے اندر جذبے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی جذبے کے مطابق انسان چلتا ہے۔ تو ایمان قلب انسان پر وارد ہوتا ہے۔ وہاں سے وہ ترقی کر کے دوسرے مقامات پر پہنچتا ہے۔اس کی تاثیر سارے بدن پر پہنچتی ہے تو پھر ہاتھ بھی مومن بن جاتا ہے اور کان بھی مومن بن جاتا ہے اور سب اعضاء میں ایمانداری پیدا ہو جاتی ہے۔اگر دل میں بے ایمانی گھسی ہوئی ہو تو ہاتھ پیر بھی بے ایمان ہوں گے اور بے ایمانی کی حرکتیں کریں گے اور دماغ بھی بے ایمان ہو جائیگا۔سوچے گا تو بے ایمانی کی باتیں سوچے گا اس لئے کہ دل کی نیت خراب ہے۔

چنانچہ دل کو اصل قرار دے کر انبیاء اسی کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے ہیں کہ اس کے اندر نور و چمک پیدا کریں تا کہ اس کے اندر علم غیب کی چیزیں روشن ہو جائیں اور یہ اسی وقت ہوگا جب کہ قلب پر ایمان وارد ہو۔ اور قلب چونکہ پاک ظرف ہے اس لئے اس میں پاک چیز یعنی ایمان داخل ہوتا ہے اور پھر عمل بھی ویسا ہی ظاہر ہوتا ہے اگر دل میں خوشی ہے تو چہرے پر بھی خوشی کے آثار ظاہر ہوں گے چونکہ خوشی درحقیقت قلب کی صفت ہے مگر چہرے سے نظر آتی ہے۔دل میں اگر غم بھرا ہوا ہے تو چہرے سے معلوم ہو جاتا ہے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آج تم بڑے غمگین نظر آتے ہو حالانکہ غم چھپی ہوئی چیز ہے وہ آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے چونکہ دل کا اثر چہرے پر پڑتا ہے تو ہر جاننے والا جان لیتا ہے کہ یہ غم زدہ ہے اور واقعی وہ غم زدہ ہوتا ہے۔تو غمی و خوشی،محبت و عداوت اور کرنا نہ کرنا یہ چیزیں انسان کے قلب سے متعلق ہیں۔اگر دل درست ہے سب چیزیں درست ہیں۔اگر دل خراب ہے تو اس کی وجہ سے سب چیزیں خراب ہیں اور اسی وجہ سے ہاتھ پیر پر اثر پڑتا ہے اور وہ اثر جو قلب پر وارد ہوتا ہے وہ متعدی ہو کر اعضاء و جوارح پر طاری ہوتا ہے،اچھا ہو یا برا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی آدمی کے انتقال کا وقت قریب آتا ہے اور ملائکہ نزع روح کرتے ہیں تو ہاتھوں اور پیروں کو سونگھتے ہیں اور دماغ کو دیگر بدن کو بھی سونگھتے ہیں اور ایمان کی خوشبو سونگھنا چاہتے ہیں۔دل میں اگر ایمان ہے تو ہاتھ پیر میں بھی اس کے اثرات رچے ہوئے ہوتے ہیں،ہاتھوں کو بھی سونگھتے ہیں کہ ان میں بھی ایمان کی خوشبو ہے یا نہیں،اصل خوشبو کا مرکز تو دل ہے مگر اعضاء پر اس کے اثرات پہنچ جاتے ہیں،جیسے خوشبو کا مخزن تو باغ ہے اور پھول ہے مگر کپڑوں سے بھی خوشبو آنے لگتی ہے اور باغ والی خوشبو کے اثرات سے جہاں جہاں ہوا پہنچے گی وہ شے معطر ہوتی چلی جائے گی۔ بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر دل اصل ہے اس کو درست کیا جائے اور درستی کی پہلی بنیاد ایمان ہے،ایمان رہتا ہے قلب کے اندر اور ان کے اثرات ہاتھ پر عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

محل اسلام.....اس سے معلوم ہوا کہ دل ایمان کی جگہ ہے اور ہاتھ پیر اسلام کی جگہ ہیں۔ایمان چھپی ہوئی شے

ہے جو دل میں رہتا ہے اور اسلام کھلی ہوئی شئے ہے جو ہاتھ اور پیروں پر آتا ہے۔ آپ نے نماز پڑھی ہاتھ پاؤں سے پڑھی۔ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ آپ نے نماز پڑھی مگر اس فعل کا سرچشمہ قلب کے اندر ہے۔ اگر اس میں جذبۂ عقیدت کا، محبت کا اور اللہ کی چاہت کا پیدا نہ ہوتا تو کبھی نماز نہ پڑھتے۔ معلوم ہوا کہ اصل میں نماز پڑھنے والا دل ہے لیکن عمل کی صورت ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتی ہے، ایمان کا محل دل ہوتا ہے اس کے اثرات جب ہاتھ پاؤں پر آتے ہیں تو وہ اسلام بنجاتے ہیں۔

چونکہ ایمان پوشیدہ شے ہے اور اسلام ظاہر شئے ہے اس لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ اَلْاِیْمَانُ سِرٌّ وَالْاِسْلَامُ عَلَانِیَۃٌ ..... کہ ایمان چھپی ہوئی چیز ہے جس کو دل لئے ہوئے ہے اور اسلام کھلی ہوئی شے ہے جو ہاتھ پاؤں پر ظاہر ہوتی ہے۔ تو وہی اندرونی شئے جب تک چھپی رہتی ہے اسے ہی ایمان کہتے ہیں اور وہی شئے جب ہاتھ پاؤں پر آتی ہے تو اسے اسلام کہتے ہیں۔

حقیقتِ ایمانیہ..... ایمان کے معنے کیا ہیں؟ اور کس طرح سے ہمارے اندر آتا ہے؟ اور اس کے آثار کیا ہیں؟ اور کیسے پہچانا جاتا ہے؟ تو سنئے! ایمان کی حقیقت ہے محبت اگر اللہ کی محبت کامل ہے تو کہیں گے کہ اس کا ایمان کامل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دل میں رچ گئی ہے تو کہیں گے کہ ایمان آ گیا۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔ ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ﴾ ① جو لوگ ایمان لائے ہیں ان میں اللہ کی محبت اور عشق سرایت کئے ہوئے ہے۔ اگر عشق ومحبت نہ ہوتا تو ایمان کبھی نہ آتا۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کے رگ وپے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بس گئی ہے اور اللہ کی محبت جم گئی ہے۔

تو محبت درحقیقت ایمان کا دوسرا نام ہے۔ ایمان نہیں محبت نہیں۔ محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ اصل چیز اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔ یہی چیز ایمان بناتی ہے یہی اعتقاد قائم کرتی ہے۔ اس کو فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ل "لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ". ② کوئی بھی تم میں مومن نہیں بنے گا جب تک قلب میں میری اتنی محبت نہ ہو کہ اس کو اتنی نہ اپنے ماں باپ سے اور نہ اولاد سے محبت ہو اور نہ کسی اور سے اتنی محبت ہو۔ بغیر حب نبی کے ایمان کامل نہیں ہوتا۔

آثارِ ایمانیہ..... علامت اس کی یہ ہے کہ ایک طرف تو ہے اولاد کی محبت ایک طرف اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، جب ٹکرا جائیں تو اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اختیار کرے اور اولاد کی محبت چھوڑ دے، یہ علامت ہوگی کہ واقعی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے اگر آدمی نے اولاد کی محبت کو اختیار کیا اور رسول کی محبت کو چھوڑ دیا تو کہا جائے گا کہ رسول سے محبت نہیں بلکہ اولاد سے محبت ہے تو ٹکراؤ سے پتہ چلتا ہے کہ کون کی محبت

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۶۵۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، ص: ۳، رقم: ۱۴۔

غالب ہے، مثلاً آپ لحاف میں آرام سے پڑے ہوئے ہیں بڑی خوشگوار نیند آ رہی ہے۔ اچانک موذن نے آواز دی: حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ. حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ...... ''دوڑو نماز کی طرف' دوڑو کامیابی کی طرف''۔ آپ نے لبیک نہیں کہا تو کہیں گے کہ نفس کی محبت غالب ہے اور اگر آرام چھوڑ کر کھڑے ہوئے اور وضو کیا اور مسجد میں گئے نماز پڑھی تو کہیں گے کہ محبت خدا اور رسول غالب ہے۔ تو ٹکراؤ کے وقت ہی آدمی جدھر مائل ہوتا ہے اسی طرف کی محبت کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم مومن نہیں بن سکتے جب تک میری محبت اولاد، ماں باپ وغیرہ سب کی محبت سے غالب نہ ہو جائے کہ جب ماں باپ کی محبت میری محبت سے ٹکرائے تو مجھے اختیار کرو، ماں باپ کو چھوڑ دو اور جب میری محبت اولاد کی محبت سے ٹکرا جائے تو مجھے اختیار کرو، اولاد کی محبت کو چھوڑ دو۔ یہی وجہ ہے حضرات صحابہ کرامؓ میں محبت نبوی اتنی غالب تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی تو صحابہؓ نے بھی اس محبت کی وجہ سے وطن چھوڑا۔ گھر بار چھوڑا۔ عزیز واقارب چھوڑے، جائیدادیں چھوڑیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو لئے مکہ میں ساری تجارتیں ترک کیں اور مدینہ میں غربت کی زندگی اختیار کی ان کو کس چیز نے مجبور کیا؟ یہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی تو تھی۔ اس محبت کی وجہ سے عیش وآرام کا سب سامان ترک کیا، مفلس وقلاش ہو کر رہنا گوارہ کیا مگر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑنا گوارہ نہیں کیا۔

مقامِ صدیقیت...... حدیث میں ایک واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ غزوہ بدر میں ۳۱۳ صحابیؓ شریک تھے۔ ان میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے بیٹے جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے بعد میں وہ ایمان لائے وہ اس غزوہ میں کفار کی طرف سے لڑنے کے لئے آئے تھے ایمان لانے کے بعد ایک روز صدیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ ابا جان غزوہ بدر کے موقع پر کئی موقعے ایسے آئے کہ آپ بالکل میری تلوار کی زد پر تھے اگر میں وار کرتا تو آپ بچ نہیں سکتے تھے۔ مگر نے سوچا میرے باپ ہیں کس طرح ان پر حملہ کروں تو میں ایک طرف ہو گیا، یہ بات بیٹے نے باپ سے کہی: ''حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اچھا یہ موقعے آئے ہیں کہ میں اور تو آمنے سامنے آ گئے تھے۔ بیٹے نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ مجھے خبر نہ ہوئی اگر تو میری زد پر آتا تو میں سب سے پہلے تجھے قتل کرتا۔ اس واسطے کہ تو دشمن تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور رسول کی محبت کے مقابلے میں اولاد کی محبت کوئی چیز نہیں ہے''۔

غلبۂ محبت...... معلوم ہوا ہے کہ ایمان جب کسی کے دل میں گھر کر جاتا ہے اور محبت غالب آ جاتی ہے تو اپنے کو اس محبت کے بدلے فروخت کر دیتا ہے۔ پھر محبوب کی ہر ادا سے محبت ہو جاتی ہے اس کے مقابل میں نہ اولاد سے محبت رہتی ہے اور نہ ماں باپ کی محبت کوئی حیثیت رکھتی ہے۔ سب کی محبتیں ختم ہو جاتی ہیں اور ایک ہی محبت غالب آتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے ہجرتیں کیں۔ جائیدادیں چھوڑیں، تجارتیں ترک کیں، یہ سب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی

محبت کا نتیجہ تھا۔ ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہ کی اس لئے کہ رسول کی محبت غالب تھی۔

تو پہلا حق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ محبت ہو۔ محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ ایمان نہیں تو پھر اسلام ہی نہیں۔ تو بنیادی چیز محبت ہے۔ اسی واسطے محبت پر زور دیا گیا ہے۔ یہی صحابہؓ کا طریق تھا اور یہی بعد میں اہل اللہ کا طریق رہا ہے۔ یہ قاعدے کی بات ہے کہ جس شخص کی محبت غالب ہوتی ہے اس کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں۔ اس کا چلنا پھرنا بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا لباس بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا ذکرا ور چرچا بھی محبوب بن جاتا ہے۔ فقط محبوب سے ہی محبت نہیں ہوتی بلکہ اس کے نام سے جو چیز منسوب ہو جاتی ہے، اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔

کسی نے مجنوں کو دیکھا کہ لیلیٰ کے مکانوں کی اینٹ اینٹ کو چومتا پھر رہا ہے کسی نے کہا۔ احمق! تو یہ کیا کر رہا ہے اینٹوں میں کیا رکھا ہوا ہے اور اینٹوں کو چومنے سے کیا فائدہ ہے؟ اس نے دو شعر میں جواب دیا۔

أَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلَى   أُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَذَا الْجِدَارَا

کہ میں لیلیٰ کے مکان پر جب گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس اینٹ کو چومتا ہوں۔ کبھی اس دہلیز کو چومتا ہوں اور کیوں چومتا ہوں ؎

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِي   وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ نَزَلَ الدِّيَارَا

مجھے ان اینٹوں سے محبت نہیں ہے وہ جو ان اینٹوں میں بیٹھی ہوئی ہے اس سے محبت ہے اس کی وجہ سے ان اینٹوں سے محبت ہو گئی ہے، اس کے کتے سے محبت ہو گئی ہے۔ اس کی بلائیں لینے کو بھی تیار ہوں۔ تو جب محبت ہوتی ہے تو ایک محبوب ہی سے محبت نہیں ہوتی بلکہ جو چیز اس کے نام سے لگ جاتی ہے وہ بھی محبوب بن جاتی ہے۔

چونکہ آپ کو محبت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو گنبد خضرا بھی محبوب ہوگا۔ اس کی زیارت کو آپ عبادت سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ایک آنکھ گنبد پر پڑ جائے تو دنیا و آخرت کی سعادت مل جائے گی۔ وہ کیوں؟ اس لئے کہ گنبد خضرا خود محبوب نہیں بلکہ اس میں جو آرام فرما ہیں اصل میں وہ محبوب ہیں۔ چونکہ اس گنبد پر نام لگ گیا ہے ان کا اس لئے وہ بھی محبوب ہو گیا گنبد تو پھر قریب ہے، مدینہ سے محبت ہے، شہر کو دیکھو تو مدینہ تو صرف ایک شہر ہے جیسے ہمارے یہاں شہر ہیں۔ یہ شہر زیادہ خوبصورت ہیں، وہ شہر اتنا خوبصورت بھی نہیں مگر پھر بھی محبت ہے اصل میں محبت ہے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وجہ سے گنبد خضرا بھی محبوب ہوا۔ اس محبت کی وجہ سے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی محبوب ہوئی اسی محبت کی وجہ سے مدینہ بھی محبوب ہوا۔ تو سلسلہ بسلسلہ ہر چیز تک محبت پہنچ جاتی ہے۔

آپ بیت اللہ شریف کی اینٹ اینٹ کو چومتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ بیت اللہ کے مقام پر تجلی ربانی اتری ہوئی ہے۔ اصل میں محبت اللہ سے ہے چونکہ بیت اللہ اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے اس لئے اس سے بھی محبت ہوئی ہے اور جب خانہ کعبہ محبوب ہوا تو پوری مسجد حرام بھی محبوب ہو گئی اور اس کی محبت ظاہر ہوئی اس طرح پر کہ آپ اس

کی عظمت کرتے ہیں۔ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، جب مسجد حرام محبوب ہوئی تو مکہ محبوب بن گیا کہ وہ شہر پناہ ہے اس مسجد حرام کا، لہٰذا وہ شہر بھی محبوب بن گیا۔ اور چونکہ حجاز میں واقع ہے تو ہم حجاز مقدس کہتے ہیں کیونکہ سارے حجاز سے محبت ہوگئی ہے۔ تو حجاز کے جتنے باشندے ہیں ان سب سے محبت ہوگئی۔ یہ پڑوسی ہے اس کا لہٰذا یہ بھی محبوب ہے تو جب آدمی کے دل میں محبت آتی ہے تو فقط ایک محبوب ہی محبوب نہیں رہتا، بلکہ محبوب کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں، چال ڈھال بھی محبوب، لباس بھی محبوب، کھانے کا طرز بھی محبوب، رہن سہن کا طرز بھی محبوب، وہ تمام چیزیں محبوب بن جاتی ہیں جو محبوب کی پسندیدہ اور محبوب ہیں۔

آثارِ محبت ..... بہر حال یہیں سے اتباعِ سنت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ یہ محبت کا اثر ہے اگر محبت ہے تو اتباعِ سنت اختیار کرے گا ورنہ نہیں۔ محبت ہی آمادہ کرتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کرنے پر کہ جس طرح آپ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اسی طرح بیٹھ کر کھانا کھایئے۔ جس طرح آپ آرام فرماتے تھے اسی ڈھنگ سے آرام ہو۔ جس ڈھنگ سے دشمنوں سے برتاؤ کرتے تھے وہی ڈھنگ تم بھی اختیار کرو۔ ان چیزوں سے اتباعِ سنت کا جذبہ غالب ہو جائے گا۔

اگر محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ غالب ہے تو بدعات سے نفرت ہو جائے گی، سنت کی پیروی سے محبت ہوگی کیونکہ محبوب کی ذات محبوب ہے اور جب ذات محبوب ہے تو ذات کی ادا بھی محبوب ہوں گی۔ آپ کا طرزِ سلام و کلام بھی محبوب ہوگا۔ ہر چیز محبت کے نیچے آتی چلی گئی اس کا نام اتباعِ سنت ہے کہ ہر شعبہ میں پیروی ہو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی اس میں خیر و برکت ہے حتیٰ کہ معاملات و معاشرت میں بھی جب پیروی کریں گے تو صدیق بن جائیں گے۔

سونے کا مسنون طریق اور قوتِ ارادی..... میں کہتا ہوں۔ مثال کے طور پر ہم سوتے ہیں اس میں بھی ہم آزاد نہیں ہیں پابند ہیں سنت کے کہ اس طرح سے سوئیں جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوتے تھے۔ سونا تو ہے لیکن حضور کے طریقے پر سوئیں گے تو عبادت بن جائے گا۔ اور آدمی چار طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر سوئے گا۔ چت لیٹ کر سوئے یا اوندھا لیٹ کر یا دائیں کروٹ یا بائیں کروٹ پر سوئے گا۔ بس یہی چار طریقے سونے کے ہیں۔ کوئی اشانگ کر تو سونے سے رہا۔ ان چار طریقوں میں ہم آزاد نہیں بنائے گئے بلکہ پابند ہیں سنت کے۔

اوندھا لیٹنے کو شریعت میں مکروہ سمجھا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ مسجد میں اوندھے لیٹے ہوئے سو رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیروں سے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ اوندھے لیٹ کر مت سوؤ اس لئے کہ یہ دوزخیوں کی ہیئت ہے کہ ان کو اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ اس لئے مومن کا کام نہیں کہ وہ جہنمیوں کی ہیئت اختیار کرنے اور جہنمیوں سے مشابہت اختیار کرے۔ اور پھر اوندھا لیٹنا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے۔ اس سے انتڑیاں الٹ پلٹ ہو جاتی ہیں ممکن ہے کہ کسی انتڑی میں گرہ لگ جائے اور

پیٹ میں درد شروع ہو جائے یا کوئی تکلیف ہو جائے اس لئے شریعت نے مکروہ سمجھا ہے۔ اگر سوتے سوتے اوندھا ہو جائے وہ دوسری بات ہے وہ اس کے اختیار سے باہر ہے اپنے ارادے سے آدمی اوندھا نہ لیٹے۔ ①

اب رہ گیا چت لیٹنا تو چت لیٹ کر سونا جائز تو ہے۔ شرعاً ممنوع نہیں حرام نہیں مگر شریعت کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس واسطے کہ چت لیٹنا بے قابو ہو جانے کی علامت ہے۔ اور جب آدمی بے بس ہو جاتا ہے تو چت لیٹ جاتا ہے اسی واسطے اگر کوئی پہلوان کسی کو پچھاڑ دے تو کہتے ہیں کہ چاروں شانے چت گرا۔ کوئی نہیں کہتا کہ چاروں شانے پٹ گرا کیونکہ جو پٹ ہوتا ہے وہ اندھا ہوتا ہے اسے کچھ قابو ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو جائے۔ مگر چت لیٹنے والا بالکل بے قابو ہوتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ضعیفوں کی ہیئت پسند نہیں کی گئی، مومن کا کام ہے مضبوط ہونا، مومن کا کام بیماروں کی طرح پڑنا نہیں ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: "اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ" ② قوی مسلمان ضعیف مسلمان سے بہتر ہے، قوت ہوگی تو جہاد کرے گا، قوت ہوگی تو مجاہدہ کرے گا اور ضعیف بیچارہ چارپائی پر بس پڑا ہوا ہے۔ نہ جہاد کے کام کا، نہ جنگ و جدل کے کام کا، نہ مجاہدے کے کام کا کسی کام کا نہیں، یہ شریعت نے پسند نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ پسند کیا ہے کہ ہر معاملہ میں بہادرانہ افعال صادر ہونے چاہئیں۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے: آدمی مریضوں اور ضعیفوں کی چال نہ چلے بلکہ اس طرح چلے بلکہ اس طرح چلے کہ دیکھنے والا دیکھے کہ اس کے بدن میں کچھ جان ہے، کچھ قوت ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار ہوتے تو رکاب میں پیر رکھ کر سوار نہیں ہوتے تھے کہ یہ بھی ایک قسم کی محتاجگی ہے کہ آدمی بغیر رکاب کے سوار نہ ہو سکے بلکہ کود اور اچھل کر سوار ہوتے تھے تاکہ شجاعت اور بہادری ظاہر ہو۔

بہرحال اسلام نے مومن کے لئے کوئی ایسی حرکت پسند نہیں کی جس سے ضعف ٹپکتا ہو۔ مجبوری ظاہر ہوتی ہے اور چونکہ چت لیٹنا بے قابو ہونے کی علامت ہے۔ ضعیفوں اور بیماروں کی علامت ہے اس لئے جائز تو ہے۔ شریعت نے اس کی ممانعت نہیں کی مگر اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ اب رہ گیا بائیں کروٹ سونا تو مخالفت تو اس کی بھی نہیں جائز ہے مگر پسندیدہ یہ بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی کہ بائیں جانب قلب ہے۔ جب بائیں کروٹ پر سوئے گا تو آدمی کے قلب کو راحت زیادہ ملے گی اور جب راحت زیادہ ملے گی تو نیند گہری آئے گی اور جب نیند گہری آئے گی تو اندیشہ ہے کہ تہجد قضا ہو جائے اور صبح کی نماز بھی قضا ہو جائے۔ اور دوسرے معمولات قضا ہو جائیں۔ اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ آدمی اتنی زیادہ راحت کرے کہ گھوڑے بیچ کر سو جائے اور مردوں سے شرط باندھ کر سو جائے۔ آدمی کو چوکنا ہو کر سونا چاہئے تاکہ جس وقت چاہے آنکھ کھلے۔ آدمی کا قلب مضبوط ہو۔

① السنن لابن ماجه، کتاب الادب، باب النهي عن الاضطجاع علی الوجه، ص: ۲۹۹، رقم: ۳۷۲۵. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف ابن ماجه ج: ۸ ص: ۲۲۳. ② السنن لابن ماجه، کتاب الزهد، باب التوکل والیقین، ص: ۳۰، رقم: ۴۱۶۸، وزاد: المؤمن القوی خیر واحب الی الله.

راحت میں غرق ہوکر بے قابو نہ ہے۔

اسی واسطے عزم پیدا کیا کہ اگر آدمی سوتے وقت یہ ارادہ کر کے سوئے کہ ہماری آنکھ صبح کو چھ بجے کھلنی چاہئے تاکہ جماعت قضا نہ ہو تو ٹھیک چھ بجے آنکھ کھلے گی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نہ کھلے۔ اٹھنا نہ اٹھنا تو آدمی کے نفس کی بات ہے۔ سستی سے نہ اٹھے مگر آنکھ ضرور کھل جائے گی۔ تو مضبوط عزم وارادہ ضرور کام کرتا ہے اس کے لئے شریعت نے طریقہ یہ بھی رکھا ہے کہ سورۂ کہف کی جو آخری آیتیں ہیں وہ پڑھ کر سویا کریں ﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴾ ① تا آخر سورۃ۔ ان آیتوں کا اثر یہ ہے کہ اگر ان آیتوں کو پڑھ کر ارادہ کرے کہ فلاں وقت اٹھنا ہے تو ضرور آنکھ کھلے گی۔ مگر پہلی چیز عزم اور عزیمت ہے کہ ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے اٹھنا ہے اور اگر ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے تو سونا ہے چاہے اٹھے نہ اٹھے تو آٹھ بجے سے پہلے آنکھ نہ کھلے گی۔ انسان کے ارادے کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قوت دی ہے، انسان کی عزیمت کو بڑی طاقت بخشی ہے۔ ارادے پر ان آیتوں کو بھی پڑھ لے تو زیادہ مدد ہوگی۔ بہرحال شریعت کا منشاء یہ ہے کہ گہری نیند مت سو کہ سارے اذکار، سارے اعمال، ساری نمازیں نیند کی نذر ہو جائیں، اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ انسان بائیں کروٹ پر سوئے اور گہری نیند سوئے۔

اب دائیں کروٹ رہ جاتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرا طریقہ ہے اور یہی سارے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔ آپ دایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر سوتے تھے۔ جب آدمی دائیں کروٹ سوئے گا تو قلب معلق رہے گا اور جب دل لٹک گیا تو زیادہ راحت نہیں ملے گی قلب چوکنا رہے گا۔ ایسی نیند نہیں آئے گی کہ جس میں آدمی غرق ہو جائے اس لئے دائیں کروٹ پر لیٹنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دیا ہے اور دوسری ہیئتوں کو ممنوع قرار تو نہیں فرمایا مگر پسندیدہ نہیں فرمایا کیونکہ دوسری ہیئتوں میں مومن کا مقصد اصلی فوت ہو جاتا ہے۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نماز روزہ تو بجائے خود عبادت ہے مگر عام زندگی میں بھی آپ آزاد نہیں پیدا کئے گئے بلکہ قانون خداوندی کے پابند بنائے گئے ہیں کہ سوتو اسی ہیئت سے سو جس ہیئت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سوتے تھے، کھانے بیٹھو تو اسی ہیئت سے کھاؤ جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر کھاتے تھے۔ جب آپ کوئی کام کریں تو اسی ہیئت سے کریں جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کو کرتے تھے۔

ابتدا بالتیمن...... چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی جیسے کہ روایت میں ہے: ''كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ'' ② آپ صلی اللہ علیہ وسلم اچھے کاموں میں ہمیشہ دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔ اگر کنگھا کرتے تو پہلے دائیں جانب پھر بائیں جانب، اگر جوتا پہنتے تو پہلے دائیں پیر میں پھر

① پارہ: ۱۶، سورۃ الکهف، الآیة: ۱۰۷. ② السنن للنسائي، کتاب الزینة، باب التيامن في الترجل، ص: ۴۲۴۳، رقم: ۵۲۳۲. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائي ج: ۱ ص: ۴۵۹.

بائیں پیر میں اگر کرتہ پہنتے تو پہلے آستین میں دایاں ہاتھ ڈالتے پھر بایاں۔ دانتوں میں اگر مسواک کرتے تو پہلے دائیں جانب لے جاتے پھر بائیں جانب۔ ہر اچھی چیز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں جانب کو پہلے اختیار فرماتے تھے۔ یہی کام مومن کا ہونا چاہئے کہ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پہلے اختیار کرے گا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں کوئی چیز آتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تقسیم فرماتے تو دائیں جانب سے شروع فرماتے۔ دائیں جانب تقسیم فرما کر پھر بائیں جانب متوجہ ہوتے۔ اور ہر بری اور خسیس ترین شئے کی ابتداء بائیں جانب سے فرماتے ناک صاف کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے استنجا کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے۔ یہ ہے سنت، اگر آپ سنت پر عمل کریں تو آپ کی ساری دنیا دین بن جائے گی، یہ کھانا پینا، رہنا سہنا اتباع سنت کی وجہ سے دین بنتا چلا جائے گا۔ اور اتباع سنت کب ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے محبت کے غلبے کی وجہ سے اگر محبت غالب نہ ہو تو آدمی کبھی بھی اتباع سنت نہ کرے بس یہ سوچے گا کہ مطلب نکل جانا چاہئے، کہاں کی محبت اور کہاں کا اتباع محبت غالب رہے گی تو قدم قدم پر خیال رہے گا۔

معیارِ عقل..... حضرت تھانوی کے ایک خلیفہ تھے وہ سہارنپور سے سوار ہوئے۔ جانا تھا ان کو کانپور، پہلے سہارنپور کے گنے بہت مشہور تھے۔ اب وہ گنا نہیں ہوتا وہ گنے بہت ملائم۔ بہت میٹھے اور بڑے ہی عمدہ ہوتے تھے، تحفے کے طور پر لوگ بہت دور دور تک لے جاتے تھے تو انہوں نے بھی گنے خریدے کہ کانپور جا کر احباب میں تحفے کے طور پر تقسیم کروں گا۔ مگر گنوں کا وزن چالیس سیر سے بھی زیادہ تھا اور ایک ٹکٹ سے اتنا وزن نہیں لے جا سکتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ زائد محصول دے دوں گا۔ بابو سے انہوں نے ذکر کیا تو بابو نے ایک نیک صورت دیکھ کر کہ بھولا بھالا ہے۔ بڑا مقدس آدمی ہے، کہا کہ آپ لے جائیں۔ کوئی محصول وغیرہ نہیں ہے۔ گویا اس نے اپنے نزدیک بڑی عقیدت سے کام لیا کہ نیک صالح آدمی ہے کیا اس سے پیسے لئے جاویں۔ اس نے کہا کہ معاف ہے آپ لے جائیں۔

انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! آپ محصول لے لیں اگر ریل میں چیکر آ گیا تو محصول بھی لے گا اور جرمانہ الگ وصول کرے گا۔ وہاں ڈبل دینا پڑے گا۔ اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہہ دیں گے وہ بھی آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! جب میں غازی آباد اسٹیشن پر دوسری گاڑی بدلوں گا تو دوسرا چیکر آئے گا، وہ جرمانہ وصول کرے گا۔ مال زیادہ ہے ٹکٹ میں اتنی گنجائش نہیں۔ سفر جتنا زیادہ لمبا ہوگا اتنا ہی جرمانہ بھی ہوگا تو وہاں مجھے چوگنا دینا پڑے گا۔ آپ مجھ سے یہیں لے لیں اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہہ دیں گے وہ اس چیکر سے کہہ دے گا۔ وہ آپ کو کچھ نہ کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا جب میں کانپور میں اتروں گا اور گیٹ سے پاس ہوں گا تو وہ گیٹ بابو کہے گا کہ بلٹی (BUILETY)؟ وہ میرے پاس ہوگی نہیں وہ مجھ سے چوگنے وصول کرے گا اتنے میری جیب میں ہوں گے بھی نہیں۔ اس بابو نے کہا کہ اس چیکر سے کہلوا دیں گے وہ اس گیٹ بابو سے کہہ دیں گے وہ آپ کو کچھ نہیں

کہیں گے۔انہوں نے کہا کہ پھر کیا ہوگا؟ بابو نے کہا پھر تمہارا گھر آ جائے گا۔انہوں نے کہا کہ گھر تو گر جائے گا۔

مگر خداوند عالم نے اگر یوں پوچھ لیا کہ ریلوے کی چوری کیوں کی تھی تو میں کیا جواب دوں گا۔تو اب وہ بے چارہ خاموش ہوا اس بابو نے کہا کہ یہ بیچارہ مجنوں معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے اس کو مجنوں ہی کہتے ہیں۔

اہل دنیا عقلمند اس کو کہتے ہیں جو بے ایمانی زیادہ کرے، چالاکیاں زیادہ کرے، دھوکہ زیادہ دے اسے کہتے ہیں کہ بڑا بھاری دانشمند ہے۔اور اگر بے چارہ بھولا بھالا سیدھا ایمانداری اور امانتداری سے پیش آئے اسے کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔پہلے زمانہ کی روح اس میں آگئی ہے مگر حقیقت میں عقلمند وہی ہے جو اپنی آخرت کو پیش نظر رکھے۔وہ عقلمند نہیں جو انجام کو بھلا دے اور بعد میں مصیبتیں اٹھائے جس کو مولانا رومیؒ نے کہا ہے کہ ۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

دیوانہ وہی ہے جو کہ دیوانہ نہ بنا اور عقلمند، وہ ہے جو عقلمند بننا نہیں چاہتا۔اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیوانگی ہی چاہتا ہے۔حقیقت میں دانشمندی وہی ہے جو شخص اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام زیادہ لے گا وہی لقب پائے گا مجنونوں کا خبطیوں کا۔اور جو شخص چالاکیاں زیادہ کرے گا وہ لقب پائے گا اہل دنیا کے نزدیک دانشمند اور عقلمند ہونے کا۔ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ”یُقَالُ لِلرَّجُلِ مَآ اَعْقَلَهٗ وَمَآ اَظْرَفَهٗ وَمَآ اَجْلَدَهٗ وَلَيْسَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْاِيْمَانِ“ ① ”ایک آدمی کو کہا جائے گا کہ کتنا بڑا دانشمند ہے اور کتنا بڑا عقلمند ہے اور کیا وسیع الظرف ہے اور کیسا دانا ہے اور کیسا مدبر ہے حالانکہ اس کے قلب میں ذرہ برابر ایمان نہ ہوگا“۔اور دنیا کہے گی کہ بڑا عقلمند ہے بڑا دانش مند ہے، مگر چونکہ اس میں ایمان کا نشان بھی نہ ہوگا جو کچھ ہوگی وہ خود غرضی ہوگی۔دنیا داری اور دنیا سازی ہوگی اس لئے وہ عقلمند نہیں ہے۔شریعت اسے عقلمند کہتی ہے جو اپنے انجام کو سوچے اور دنیا کے بارے میں خیال کرے کہ بھلی بری جیسی بھی ہوگی گزر جائے گی وہاں جو معیت ہے وہ ابدی ہے وہ ہمیشہ جھیلنی پڑے گی جو کہ قابل برداشت نہیں ہے نہ یہاں کی معیت باقی رہنے والی ہے اور نہ یہاں کی نعمت باقی رہنے والی ہے۔اس لئے جو آدمی آخرت کے مصائب کی رعایت کرکے دنیا کے مصائب کا تحمل کرے وہ عقلمند ہے۔فرمایا گیا: ﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى﴾ ② ”آخرت کا عذاب ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور شدید ہے“۔اور یہاں کی معیبت نہ شدید ہے اور نہ دیر تک باقی رہنے والی ہے۔

راستے کا رنج وراحت اور منزلِ مقصود.....اکبر نے کیا خوب بات کہی ہے اور بڑی عمدہ بات کہی ہے لقب ہی اس کا لسان العصر ہے۔اس بناء پر ان کی بات بڑی حکمت کی بات ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ ۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانة والایمان من بعض القلوب، ص: ۲۰۷، رقم: ۳۶۷.

② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیة: ۱۲۷.

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

یہ کام تمہیں بھی کرنا ہے اور مجھے بھی کرنا ہے اور سب کو کرنا ہے کیونکہ سب ہی کو جینا اور مرنا ہے۔ آگے کہتا ہے۔

رہ گئی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

رنج بھی گزر جائے گا اور راحت بھی گزر جائے گی، بڑی ہی حکیمانہ بات کہی ہے کہ راستہ کے رنج وراحت پر نظر مت رکھو اور انجام پر نظر رکھو۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اگر منزل پر پہنچ کر مصیبت میں مبتلا رہے تو وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ تو اکبرؔ نے کہا ہے کہ راستے کا رنج وراحت فقط وقت کے گزر جانے کا نام ہے۔

یہاں میرے دل میں ایک خلجان یہ پیدا ہوا کہ بات تو بڑی حکیمانہ کہی ہے راستے کے رنج وراحت کا خیال مت کرو مگر منزلِ مقصود نہیں بتلائی کہ جانا کہاں ہے۔ اسی بناء پر دو تین شعر میں نے اس میں جوڑ دیئے ہیں اپنی طرف سے اکبر نے راستہ کا پتہ دیا ہے، میں منزل کا پتہ بتا دیتا ہوں میں کوئی شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر کہنا میرا مشغلہ ہے، پھر اکبر جیسا شاعر اور اس کے شعر میں اپنا شعر ملانا ایسا ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیں۔ بس ایک تک بندی ہے جو میں نے کر دی ہے اور میں نے اکبر کے اشعار پر اضافہ کر دیا ہے۔ تو دو ان میں راستے ہی کے بارے میں ہیں ان میں ایک آخری منزل کے بارے میں۔ اکبرؔ نے تو کہا ہے کہ

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
رہ گئی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں۔

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا — یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

یعنی عزت ہم کہتے ہیں یہ فقط خیالی شئے ہے اور خیال بھی دوسرے کا۔ اگر ہمارے خیال سے ہماری عزت ہو تو چوبیس گھنٹے ہم خیال کئے بیٹھے رہیں کہ ہم سے بڑا کوئی نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ دوسرا بڑا مانیں تو عزت ہوتی ہے ہمارے خیال باندھنے سے عزت نہیں ہوتی اور دوسروں کا خیال آپ کے قبضے میں نہیں۔ اگر خیال بدل گیا بس جب ہی ذلیل ہو گئے۔ آج خیال یہ ہے کہ فلاں آدمی بہت بڑا ہے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیتے ہیں، لیڈر بن جاتے ہیں اور کل کو خیال بدل گیا تو دوسرے کے گلے میں ڈال دیا۔ پہلے کی ساری عزت ختم ہو گئی۔ بس ذلیل ہو گیا یہ صرف خیالی عزت ہے۔

اصل عزت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ① تو اصل عزت یہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مہر ثبت کر دی ہے، اس لئے میں نے کہا کہ

رہ گیا عز و جاں کا جھگڑا — یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

① پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۸۔

اور میں آگے کہتا ہوں۔

قابلِ ذکر ہی نہیں خورد نوش　　　　یہ بھی کی خو سے لڑنا ہے

کھانا پینا یہ کوئی قابلِ ذکر نہیں اس لئے کہ یہ کوئی کمال کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ چوپائے بھی کھاتے پیتے ہیں اگر آدمی نے کھالیا تو کونسا کمال کیا ہے۔ جانور کی حد سے نہیں نکلے گا۔ وہ بھی کھاتے ہیں تو کھانا کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ بہر حال تین چیزیں ہو گئیں اکبر نے کہا تھا کہ راستے کے رنج و راحت کی پرواہ مت کرو، یہ گزر جانے والی ہے، میں کہتا ہوں کہ کھانے پینے کا خیال مت کرو یہ تو جانوروں کی علامت ہے نہ عزت و ذلت کا خیال کرو کیونکہ وہ خیالی شے ہے بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کا ارادہ کرو اور کوشش کرو۔ آخری شعر میں اسی کا پتہ دیا ہے:

مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق　　　　نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

مدارِ نجات...... اصل مقصد اطاعتِ خداوندی ہے یہ مل گیا تو سب کچھ مل گیا اگر محنت کر کے دنیا کا جغرافیہ یاد کرلیا اور اس پر عبور بھی ہو گیا کہ بنگلور میں اتنے درخت ہیں، فلاں شہر ایسا ہے، آخرت میں ایک بھی نہ پوچھا جائے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کونسی سنت پر عمل کیا۔ علم دین کیا سیکھا تو آپ کہیں کہ حضور! عبادت تو نہیں کی البتہ دنیا کا جغرافیہ لے کر آیا ہوں یہ کام نہیں دے گا کیونکہ اس سے نجات نہ ہو سکے آپ کہیں گے کہ معلوم کر کے آیا ہوں کہ دنیا میں اتنے پہاڑ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تمہیں دنیا میں پہاڑ گننے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ تم کو طاعت و عبادت کے لئے بھیجا تھا۔ قانونِ خداوندی کی پابندی کے لئے بھیجا گیا تھا، وہ بتاؤ کتنی کی ہے۔ نجات کا مدار اسی پر ہے نہ جغرافیہ پر نہ سائنس پر نہ جدید تعلیم پر اس آخری شعر میں مقصد زندگی اور منزل کا پتہ دیا گیا ہے۔

محبت کی تلخیاں...... میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر محبت سے ایمان بنتا ہے پھر اس ایمان ہی کی وجہ سے اعمال ہاتھ پیر پر آتے ہیں اور انسان کی زندگی بنتی ہے۔ محبت سے ہی سارا کام چلتا ہے۔ آدمی اس محبت میں مصائب بھی جھیلتا ہے۔ تکلیفیں بھی اٹھاتا ہے، مگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب ہے تو پرواہ بھی نہیں ہوتی کسی چیز کی۔ اہل اللہ جیل خانے میں بھی گئے مگر انہیں پرواہ نہیں ہوئی کیونکہ تعلق مع اللہ قوی ہے۔ فقر و فاقہ آیا مگر انہیں پرواہ تک بھی نہیں اس لئے کہ دل میں تعلق موجود ہے۔ قلب مطمئن ہے اور اگر دل کا تعلق اللہ سے نہ ہو تو انسان ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ ہمیشہ اس پریشانی اور پراگندگی و تشتت میں ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کا سکون صرف اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے۔ کسی اور چیز میں نہیں۔

کروڑوں کا مالک ہو اس کو بھی سکون نہیں ملے گا۔ بلکہ قلب بے سکون، غیر مطمئن، پریشان، پراگندہ ہی رہے گا کہ اس کی حفاظت کیسے کروں اسے ڈاکو نہ لے جائیں کہیں پہرے دار ہیں۔ کہیں چپراسی ہیں کہ چوروں سے حفاظت کرتے ہیں، مگر قانونی چوری بھی تو ہوتی ہے اس سے کیسے حفاظت کرے گا؟

بہت سے لوگ قانون کے دائرے میں رہ کر چوری کرتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالتے ہیں مثلاً کہیں فیس کی شکل میں

رقم وکلاء کے پاس جارہی ہے۔ کہیں بیرسٹروں کے پاس جارہی ہے۔ کہیں ڈاکٹروں کے پاس جارہی ہے۔ غرض روپیہ کیا ایک وبال جان بنا ہوا ہے ہر وقت پریشانی ہی پریشانی ہے۔ نہ اس سے سکون ملتا ہے نہ بلڈنگ سے سکون ملتا ہے اگر سکون ملتا ہے تو صرف اللہ کے نام میں ملتا ہے۔ ﴿ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ ① ''اللہ ہی کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں''۔

دنیا کے ذکر سے چین نہیں ملتا وہ تو استعمال کی چیز ہے اسے کھاؤ پیو، استعمال کرو مگر مقصود مت بناؤ۔ اس سے محبت مت کرو۔ اس میں دل مت لگاؤ اس کو جائز طریق پر استعمال کرو۔ اچھا کھانا بھی کھاؤ۔ اچھے مکان میں بھی رہو۔ مگر مکان کو خدا مت سمجھو۔ لباس کو کعبہ مت بناؤ، خادم سمجھو، محبت کے لئے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اختیار کرو۔ ہماری زندگی یہ ہے'' کہ دل بیار دست بکار'' ہاتھ اور پاؤں کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور دل لگا ہوا ہے خالق و مالک کے اندر کہ دنیا میں رہو تجارت بھی کرو، زراعت بھی کرو۔ جب تک انسان دنیا میں رہے گا سب ہی کام کرے گا اور کرنے بھی چاہئیں مگر دل کی توجہ اللہ کی طرف رہنی چاہئے، اس سے تجارت بھی با برکت بنے گی۔ سب چیزیں عبادت بنتی چلی جاویں گی۔ تو اصل چیز ہے قانون کی پیروی اور وہ ہو نہیں سکتی جب تک محبت نہ ہو۔ تو محبت اصل ایمان اور اصل اسلام ہے اور

در محبت تلخہا شیریں بود

یعنی محبت میں تلخیاں بھی شیریں بن جاتی ہیں کیونکہ آدمی کا دھیان محبوب کی طرف رہتا ہے تلخیوں کی طرف نہیں رہتا، اس لئے وہ شیریں ہو جاتی ہیں۔ اور محبوب کی ہر ادا محبوب بن جاتی ہے۔

غلبۂ ادب ..... ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ جو ہماری ساری جماعت دیوبند کے شیخ طریقت ہیں اکابر اولیاء میں سے ہیں سن ۱۸۵۷ء میں انہوں نے جہاد کیا ہے پھر حضرت نے مکہ معظمہ کی طرف ہجرت فرمائی وہیں ان کی وفات ہوئی۔ مکہ معظمہ میں پہنچ کر پوری عمر کبھی سیاہ جوتا نہیں پہنا۔ لوگوں نے شروع شروع میں تو اتفاقی بات سمجھا مگر جب کالے رنگ کا جوتا لاتے تو ان سے فرماتے کہ دوسرے رنگ کا لاؤ یا سفید لاؤ یہ جوتا نہیں پہنوں گا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ حضرت کا طریقہ ہے تو پوچھا کہ حضرت! سیاہ جوتے میں کیا حرج ہے۔ فرمایا کہ بیت اللہ شریف کا غلاف سیاہ ہے ادب مانع ہوتا ہے کہ وہ رنگ میں اپنے پیروں میں استعمال کروں، حالانکہ سیاہ جوتا پہننا شرعاً جائز ہے کوئی قباحت و نقصان نہیں ہے مگر چونکہ ادب کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو آدمی بعض جائز چیزوں کو بھی ترک دیتا ہے کیونکہ اس جائز چیز کے استعمال کرنے میں ادب مانع ہوتا ہے۔ جیسے حضرت نے فرمایا کہ مجھے حیا آتی ہے۔ ہے کہ وہ رنگ جو بیت اللہ کے غلاف کا ہے اس کو پاؤں میں ڈالوں۔

تو ظاہر بات ہے کہ جائز و ناجائز کی بحث نہیں یہ تو محبت کا غلبہ ہے چونکہ محبت خداوندی اتنی غالب تھی اس

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸۔

کے مطابق محبت کعب بھی اسی قدر غالب تھی کہ اس رنگ کو پاؤں میں لانا گوارہ نہ کیا۔ کیا ادب کی انتہا تھی۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کلیر شریف جاتے تھے۔ حضرت صابر کلیریؒ کے مزار کی زیارت کرنے کے واسطے۔ کلیر، رڑکی سے پانچ میل دور ہے، نہر کی پٹری پر چلے جاتے تھے۔ اب تو سواری کا بھی انتظام ہے اس زمانے میں لوگ عموماً پیدل ہی جاتے تھے، تو حضرت جب نہر کی پٹری پر جاتے اور سامنے کلیر ہوتا تو جوتے اتار کر بغل میں دبا لیتے اور ننگے پیروں جاتے۔ تو کیا جوتے پہن کر جانا ناجائز تھا؟ نہیں بلکہ محبت کا غلبہ تھا۔ حضرت صابر کلیریؒ کی محبت دل میں جاگزیں تھی۔ ادب کا غلبہ تھا۔ جب روضہ نظر آتا تھا تو جوتا پہن کر جانا پسند نہیں کرتے تھے ننگے پیروں جاتے تھے۔ چونکہ ادب کا غلبہ تھا۔ اور ادب غالب ہوتا ہے محبت کے غلبہ سے۔

جب حضرت نانوتویؒ نے حج کیا تو بڑے بڑے اکابر ساتھ تھے۔ مثلاً حضرت گنگوہیؒ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ اور دوسرے بڑے بڑے اکابر اور بزرگوں کا ایک مجمع تھا۔ آخری منزل جس کے بعد مدینہ طیبہ بالکل سامنے آجاتا ہے اور حرم شریف کے مینارے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس آخری منزل کا نام ہے "بیئر علی" یہاں ایک پہاڑی ہے جہاں اس پر چڑھے اور حرم شریف کے مینارے سامنے آجاتے ہیں۔ تو یہ قافلہ جب "بیئر علی" پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے سامنے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ایک دم اونٹ سے اچھل کر کر زمین پر گر پڑے جوتے اتار کر رکھے اونٹ کے کجاوے میں اور ننگے پیر چلنا شروع کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب تھی اس لئے عاشقانہ اشعار پڑھتے ہوئے اور اپنے حال میں مست اور ننگے سر چلے جارہے تھے۔ عرب کی کنکریاں جو ہیں وہ نوکیلی ہیں۔ پیروں میں ایسے چبھتی ہیں جیسے کانٹے چبھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ مگر حضرت محبت وعشق کی وجہ سے اپنے حال میں مست ہیں۔

دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اونٹوں سے اتر کر پیدل چلنا شروع کر دیا تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہ احمق کیوں نیچے اتر کر چلنے لگے ان پر تو محبت اور عشق کی وجہ سے حال طاری ہے۔ یہ نقالی کہاں تک کریں گے۔ اس لئے کوئی بیس قدم پر چل کر رک گیا۔ کوئی سو قدم چل کر رک گیا کیونکہ ان کنکریوں پر چلنا مشکل ہے مگر جو اپنے حال میں مست ہے وہ معذور ہے اسے تو کچھ خبر نہیں رہتی چاہے اس پر تیر پڑیں چاہے تلواریں پڑیں۔ لیکن جن کے ہوش و حواس باقی ہیں وہ اس طریقے سے چلیں وہ پورے نہیں اتر سکتے۔ اسی لئے کوئی پچاس قدم چل کر بیٹھ گیا۔ اور کوئی سو قدم چل کر بیٹھ گیا اور حضرتؒ حرم تک پیدل چلے اور پیروں میں کنکریاں چبھ چبھ کر لہولہان اور خون خون بھی ہو گئے تو۔ در محبت تلخہا شیریں بود۔ یعنی محبت کی وجہ سے تلخیاں بھی شیریں ہو جاتی ہیں اور آدمی ان کو بخوشی جھیل لیتا ہے۔

استغراقِ محبت..... غزوۂ اُحد میں جنگ شروع ہوئی۔ اُحد کے پہاڑ کی ایک گھاٹی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر چالیس تیر اندازوں کو مقرر کیا اور حکم دیا کہ وہ یہاں بیٹھے رہیں، فتح ہو خواہ شکست ہو۔ ہر صورت میں وہاں سے بغیر اجازت نہ ہٹیں۔ چنانچہ صحابہؓ وہاں بیٹھے رہے، جنگ شروع ہو گئی۔ ان حضرات نے سوچا کہ ہم خالی

بیٹھے ہیں کچھ کام ہی کر لیں، دوسرے حضرات نے کہا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے کہ صرف بیٹھے رہیں۔ بعض نے کہا کہ ایسے بیٹھنے سے تو عبادت میں لگنا اچھا ہوگا۔ یہ سوچ کر نفلوں کی نیت باندھ لی اور نفلیں پڑھنا شروع کر دیں ترکیب یہ کی کہ چار نفلیں پڑھیں اور باقی حفاظت کریں۔ اسی طریقے سے رات گزاری اور نوافل پڑھتے رہے۔

مشرکین مکہ نے تاڑ لیا کہ یہ صحابہؓ بیٹھے ہوئے ہیں، کفار نے ان پر تیروں کی بارش کی، جو لوگ نماز میں مصروف تھے وہ سامنے تھے، اسی لئے کسی کی گردن میں لگا، کسی کے سینے میں لگا اور کسی کی پیٹھ میں لگا، بدن لہولہان ہوگئے اور کپڑے خون میں رنگ گئے مگر ان کو کچھ خبر نہیں وہ اپنی نماز میں مستغرق ہیں۔ نہ تیروں کی خبر اور نہ نیزوں کی خبر جب اخیر شب میں سلام پھیرا تو معلوم ہوا کہ کپڑے رنگے ہوئے ہے غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی تیر یہاں گھسا ہوا ہے۔ کوئی تیر سینے میں۔ کوئی تیر پشت میں، پورا بدن چھلنی ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ نے تیر مارے ہیں۔

اتنا استغراق اور غلبہ تھا محبت کا نہ انہیں تیروں کا پتا چلا اور نہ انہیں نیزوں کا پتہ چلا، نماز کے اندر غرق ہے اور حق تعالیٰ کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تو آدمی ساری تلخیاں جھیل جاتا ہے جب محبت کا غلبہ ہوتا ہے پھر نہ زخم کی پرواہ نہ تلواروں کی نہ نیزوں کی پرواہ ہوتی ہے یہی شان اہل اللہ کی بھی ہوتی ہے کہ حب محبت خداوندی اور محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم غالب آ جاتی ہے تو نہ عیش کی پرواہ نہ آرام وراحت کی پرواہ ساری چیزوں کو تج دیتے ہیں۔

ظرف محبت...... چنانچہ میں نے عرض کیا تھا کہ بنیادی چیز محبت ہے اور محبت کا ظرف دل ہے جب دل میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آ جائے گی تو ہاتھ پاؤں پر بھی اس کے اثرات ظاہر ہوں گے اور اعمال صالحہ بھی صادر ہوں گے اور اگر دل میں محبت نہیں تو نہ ایمان بنے گا اور نہ اعمال بنیں گے۔ مسلم نام کے تو ہوں گے مگر کام اسلام کے نہیں ہوں گے۔ جب دل میں ایمان ہوگا جب ہی کام اسلام کا ہوگا۔ اس لئے ہمیں نام کا مسلمان نہیں ہونا چاہئے، دل میں محبت رچی ہو اور ہاتھ پیر پر عمل ہو یہی عمل شہادت دے گا ایمان ایک چیز ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے۔

دعویٰ محبت کا ثبوت...... جب قیامت میں آدمی اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کرے گا تو اس سے دلیل طلب کی جائے گی کیونکہ کوئی دعویٰ بنا دلیل کے قابل سماعت ہوتا نہیں۔ اس بنا پر اس سے پوچھا جائے گا کہ تیرے ایمان کا ثبوت کیا ہے وہ کہے گا کہ میں نے نمازیں پڑھی ہیں، روزے رکھے ہیں، زکوٰۃ دی ہے، حج کئے ہیں، یہ ثبوت ہوگا ایمان کا پھر اسے نجات ہوگی۔ مگر آپ نے اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کیا اور دلیل طلب کی گئی مگر وہاں نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ زکوٰۃ ہے، نہ حج ہے۔ تو یہ دعویٰ بغیر دلیل کے رہ جائے گا وہاں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ اس کی گردن ناپی جائے گی اور اس کے دعوے کی تکذیب کی جائے گی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، تمہارے اندر ایمان کہاں ہے، اگر ایمان ہوتا تو اس کے آثار ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتے، حالانکہ کوئی اثر ظاہر نہیں اس لئے کہ اندر کچھ نہیں۔ لہٰذا انتہائی ذلیل ہوگا اور کہا جائے گا کہ اپنے کئے کو چکھو۔ پھر وہاں کی سزائیں دی جائیں گی۔ مصیبتوں میں مبتلا کیا جائے گا۔ اس لئے جب دعویٰ ہو تو اس کی دلیل بھی مہیا ہونی چاہئے۔ اطاعت، عبادت، اتباع سنت حضور

کی پیروی ہونی چاہئے ۔آگے قبول کرنا نہ کرنا مالک کا کام ہے مگر ہمیں ثبوت مہیا کر دینا چاہئے اور اس ثبوت پر ناز نہ ہو کہ میں نے اتنی عبادت کی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

بڑوں کی بڑی بات......حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد اولیا و کبار میں سے ہیں وہ رات دن طاعت وعبادت میں لگے رہتے ہیں لوگوں نے ان سے عرض کی کہ حضرت آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں کہ راتوں کو ذکر اللہ دن بھر ذکر اللہ۔ کیوں اتنی محنت کر رہے ہیں؟

جب ہم نے یہ سوال پڑھا تو ہم یہ سمجھے کہ حضرت نے یہ جواب دیا ہوگا کہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں اس لئے میں یہ عمل کر رہا ہوں مگر یہ جواب نہیں دیا بلکہ جواب اور ہے۔ یہ تو ہمارے فہم کی رسائی تھی حضرتؒ نے وہ جواب دیا جو ہماری فہم سے بالاتر ہے اور اپنے مرتبے کے مطابق جواب دیا کیونکہ بڑوں کی بات بڑی ہی ہوتی ہے۔ حضرتؒ نے ان پوچھنے والوں کو جواب دیا کہ میں رات دن اس لئے عمل کرتا ہوں کہ میں پیدا ہی کیا گیا ہوں عمل کرنے کی خاطر۔ یعنی مقصدِ زندگی ہی میرا یہ ہے، راضی ہونا نہ ہونا ان کا کام ہے۔ راضی ہونا یا ناراض ہونا یہ فعلِ خداوندی ہے۔ ہم کون ہیں ان کے فعل میں دخل دینے والے۔ ہمارا کام تو ہونا چاہئے جس کے لئے ہم پیدا کئے ہیں اور ہم پیدا کئے گئے ہیں طاعت وعبادت کے لئے، بس ہم اپنا کام کئے جائیں۔ اگر وہ راضی ہوں تو ان کا فضل ہے اگر وہ ناراض ہوں تو ہمارا عمل اس قابل نہیں کہ اس سے فریادی ہوں۔ تم اللہ تعالیٰ کے کاموں میں دخل مت دو۔ صرف اپنا کام کرتے رہو۔

کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن

اپنے کاموں میں لگے رہو قبول کرنا نہ کرنا اس کا کام ہے۔

محبت آمیز عمل......یحیٰ بن اکثم بہت بڑے عالم گزرے ہیں امام کے درجے کے عالم ہیں ان کی وفات ہوئی تو بعض اہل اللہ نے انہیں خواب میں دیکھا اور خواب بھی کشف جیسا تھا۔ یہ دیکھا کہ ان کی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوئی ہے۔ "حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے یحییٰ! کیا چیز لے کر آئے ہو ہمارے لئے؟ جواب دیا کہ اے اللہ تعالیٰ میں نے پچپن ۵۵ حج کئے ہیں۔ فرمایا: ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ انہوں نے کہا: باری تعالیٰ میں نے ایک سو باون ۱۵۲ قرآن ختم کیے ہیں۔ فرمایا: ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ پوری زندگی کے اعمال ذکر کئے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک بھی قبول نہیں۔ اور بتاؤ کیا لے کر آئے ہو۔ آپ عاجز ہوگئے۔ آخر میں کہا کہ اے اللہ! بس تیری رحمت کا سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ لے کر نہیں آیا۔ فرمایا کہ اب بات تو نے ٹھیک کہی ہے۔ وَجَبَتْ لَکَ رَحْمَتِی میری رحمت تیرے لئے واجب ہوگئی ہے جا تیرے لئے جنت اور مغفرت ہے" تو اس عمل کے ساتھ ساتھ رضاء خداوندی اور رحمت خداوندی کی توقع اور امید بھی ہونی چاہئے، اعمال پر گھمنڈ اور ناز نہیں ہونا چاہئے، جس عمل میں محبت کی آمیزش اور رحمت کی امید نہ ہو وہ عمل قابل قبول نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر

اس کے بعد عمل کا مرتبہ ہے۔ اور اس محبت سے ہی عمل پیدا ہوتا ہے عمل ہی محبت کی علامت ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دل میں محبت ہے یا نہیں۔

دوامِ معیتِ نبوی کی بشارت...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: "مَنْ اَحَبَّنِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ اَطَاعَنِیْ کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّةِ" ① "جو مجھ سے محبت کرے گا وہ میری اطاعت بھی کرے گا اور میری سنتوں کی پیروی بھی کرے گا اور جو میری سنتوں کی پیروی کرے گا وہ میرے ساتھ بھی جنت میں وہ میرے سے الگ نہیں رہے گا"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیاد قرار دیا ہے محبت کو۔ کہ مجھ سے محبت کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ میری اطاعت کر رہا ہے اور میری اطاعت کرنا علامت ہے اس بات کی ہے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے مگر محبت پہچاننے کی علامت اطاعت اور اتباعِ سنت ہے جب یہ ہوگی تو معلوم ہوگا کہ محبت میں سچا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ." ② "تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن کامل نہیں بن سکتا جب تک کہ میری اس آدمی کو اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی اس کی نہ اپنے ماں باپ سے ہو، نہ اپنی اولاد سے ہو، نہ اپنے سامان سے ہو، نہ اتنی محبت اس کو اپنے عزیز واقارب سے ہو"۔ جب دو محبتوں کا ٹکراؤ ہو تو ترجیح دے میری محبت کو، تو کہا جائے گا کہ یہ مومن کامل ہے کہ اصل شے محبت ہی ہے۔

محبت وخواہش کا ٹکراؤ!...... ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ" ③ "کہ تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں بن سکتا اس وقت تک جب تک کہ اس کی خواہشات نفس میرے لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں"۔ ایک طرف شریعت ہے اور ایک طرف خواہش نفس ہے۔ اگر خواہش نفس کو ترجیح دی تو معلوم ہوا کہ خواہش کا بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی مرضی کو ترجیح دی اللہ تعالیٰ کی مرضی پر اس لئے یہ خواہشات نفس اور ہوائے نفس کا تابع ہے اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی کا تابع ہوتا تو اسی کو ترجیح دیتا۔ اسی لئے فرمایا کہ وہ مومن کامل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا تابع ہونا چاہئے۔ جو کچھ کرے اتباع میں کرے، نماز پڑھے تو اتباع میں پڑھے روزہ رکھے تو اتباع سے، سوئے تو اتباع سے، جاگے تو اتباع سے، کھائے پیئے تو اتباع میں، غرض یہ کہ پوری زندگی پر اتباع چھا جائے جب ہی اس کے ایمان میں کمال آئے گا اور اس کو مومن کامل کہیں گے۔

صدورِ معصیت اور تقاضائے محبت...... اب رہی بات غلطی سے گناہ کا صادر ہونا تو بندہ بشر ہے۔ معصوم تو

---

① السنن للترمذی، ابواب العلم عن الرسول، باب ماجاء فی الاخذ بالسنة.

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ، ص: ۲۸۸، رقم: ۶۹۔

③ مشکوة المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام، ج: ۱ ص: ۳۶، رقم: ۱۶۷۔

صرف انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ ہم تو دن رات سینکڑوں گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں اور گناہ بے شک ہوتے رہتے ہیں مگر اس کا حل یہ فرمایا کہ جب گناہ ہو جائے تو توبہ کر لے پھر اتباعِ شریعت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اتباع کر رہے ہیں اور درمیان میں گناہ ہو گیا کہ یا اللہ میری توبہ پھر نہیں کرونگا۔ اللہ تعالیٰ سے عہد کیا۔ پھر اتباع میں مصروف ہو گئے۔ اتباعِ سنت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کبھی بھی غلطی نہ ہو اور گناہ نہ ہو۔ یہ شان تو انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ ہم سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور ہم گناہ کرتے بھی ہیں مگر اس کا حل یہ ہے کہ فوراً توبہ کر لے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے: اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهُ. ① گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ توبہ کرتے ہی اس کا ریکارڈ صاف ہو گیا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے گناہ کے بعد توبہ کی وہ گناہ پھر باقی نہیں رکھا جاتا۔ اسی لئے جب بھی کوئی گناہ ہو جائے فوراً توبہ کر کے پاک ہو جائے۔ یہ مومن کی شان ہے اور یہ محبت اور ایمان کی کمال ہے۔ بس دعاء کیجئے کہ اللہ رب العالمین اپنی رضا نصیب فرمائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور معیت عطا فرمائے اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان کامل پر فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ص: ۵۳۷۲ برقم: ۴۲۵۰. حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترهیب ج: ۳ ص: ۱۲۲.

تعلیم جدید

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥﴿ اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ٥ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴾① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ.

بے انتہا خوشی...... بزرگانِ محترم! خیال یہ تھا کہ اس وقت کالج کی جو جدید عمارت تیار کرائی جارہی ہے، اس کو دیکھا اس سے مستفید ہونا اور مسرور ہونا ہے۔ اسی غرض سے حاضری ہوئی تھی، جلسہ کا کوئی تصور اور اس میں بھی کسی تقریر اور خطاب کا کوئی گمان حاشیہ خیال نہیں تھا۔ بہرحال جب جلسہ کی صورت بن گئی ہے تو اس کے کچھ نہ کچھ لوازم پورے کرنے پڑیں گے اور ذمہ داروں نے اپنے محبت اور خلوص سے جو شکل پیدا کر دی ہے اس کا احترام تو کرنا ہی پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی جدید عمارت میں حاضر ہو کر غیر معمولی مسرت ہوئی اور شارم کے زندہ دل مسلمانوں کے حوصلے اور جذبات خیر سامنے آئے اس سے بھی بے انتہا خوشی ہوئی۔

تعمیر معنوی کی علامت...... ظاہر میں یہ ایک تعمیر ہے جو اینٹ اور پتھر سے کی جارہی ہے۔ اور سیمنٹ اور چونا ہی میں ڈالا جارہا ہے لیکن اگر حقیقت پر نگاہ کی جائے تو یہ علم کی بنیاد ڈالی جارہی ہے۔ یہ تعمیر دراصل علم کی ہے۔ درسگاہ کا وجود حقیقتہً علم کے لئے ہے۔ اس لئے یہ حسی تعمیر علامت ہے معنوی تعمیر کی جو اس کے اندر کی جائے گی ظاہر تعمیر سے قوالب کی ایک ہیئت بنائی جارہی ہے اور معنوی تعمیر سے قلوب کی ایک ہیئت بنائی جارہی ہے۔ اس ہیئت ظاہری میں نفسانی اخلاق و جذبات کی اصلاح کی جائے گی اس اعتبار سے یہ بہت مستحسن اقدام اور مبارک عمل ہے۔

① پارہ: ۲۲ سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷، ۲۸.

اقسامِ علم......امام شافعیؒ کا مشہور مقولہ ہے۔ اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَدْیَانِ وَعِلْمُ الْاَبْدَانِ......یعنی اللہ کی طرف سے جو علم دنیا کے اندر آئے وہ دو طرح کے ہیں ایک ادیان کا علم۔ جس کا نام شریعت ہے اور ابدان کا علم جس کا تعلق انسان کے ظواہر بدن اور اس کے عوارض بدن سے ہے لیکن حقیقت میں یہ دونوں علم جزء ہیں شریعت کے۔ شریعت اسلامی نے جس طرح سے شریعت اور دین کے علم کی طرف توجہ دلائی ہے اسی طرح سے ابدان کا علم اور ضرورت زندگی کے علوم مثلاً سائنس اور فلسفہ وغیرہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادیان کا علم اصل مقصود ہے اور ابدان کا علم اس کے لئے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے اور دونوں کا مقصد ہے معرفت خداوندی۔ حدیث شریف میں ہے رَأْسُ الْعِلْمِ مَعْرِفَةُ اللّٰهِ۔ یعنی علم کا راس المال اور خلاصہ خدا کی معرفت اور اس کی پہچان ہے۔

علمے کہ راہِ حق نہ نماید جہالت است!

جو علم حق کا راستہ نہ دکھائے وہ حقیقت میں جہالت ہے اس کو صورت علم کہا جائے گا۔ حقیقت علم نہیں کہا جا سکتا۔

علم دین کے ساتھ علم دنیا کی ضرورت......جس طرح حقائق کا علم ضروری ہے اسی طرح معاشیات و معاشرت اور کائنات کے علم کے سلسلہ میں ان علوم کی بھی ضرورت ہے جن کو آج کل علم سائنس، فلسفہ اور ریاضی وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں جو آیت ہے ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ① اس میں حصر کر دیا گیا ہے کہ علماء ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔ یعنی خوف و خشیت انہیں کے قلوب میں ہے۔ یہاں علماء سے مراد علماء فقہ ہی نہیں ہیں جو جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے مسائل سے واقف ہوں۔ بلکہ قرآن کریم کے ان نشانوں سے بھی واقف ہوں جو ضروریات زندگی کے سلسلے میں دنیوی علوم کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اس میں ستاروں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اس زمین کے مخفی عجائبات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن خلاء و فضا کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اور ان کی طرف اشارات بھی کئے گئے ہیں۔

نظامِ محکم کی شہادت......ان سب کا مقصد بھی درحقیقت معرفت الٰہی اور اللہ کو پہچاننا ہے اس کہ آثار کو دیکھ کر ہی ذی اثر کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کہیں دھواں دیکھیں گے تو پہچان جائیں گے کہ وہاں آگ موجود ہے ورنہ دھواں نہ ہوتا۔ کہیں آپ رطوبت اور ٹھنڈک محسوس کریں گے ضرور یقین کریں گے کہ قریب میں کوئی دریا موجود ہے ورنہ برودت نہ ہوتی تو آثار کو دیکھ کر موثر کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کائنات کے نظام محکم اور عجیب و غریب انتظامات کو دیکھ کر دل خود بخود شاہد ہوتا ہے اور گواہی دیتا ہے کہ کوئی بہت بڑا صانع اور حکیم ہے جس نے یہ نظام کائنات بنایا ہے اور عجائبات قدرت کو نمایاں کیا۔ یہ محض مادہ اور اس کی حرکت کا کام نہیں ہے اس لئے کہ مادہ خود اندھا اور بہرہ ہے نہ اس کو اپنی خبر اور نہ دوسرے کی خبر۔ تو ظاہر بات ہے کہ ایک اندھی بہری اور اپاہج چیز کوئی نظام محکم تیار نہیں کر سکتی۔

① پارہ: ۲۲، سورۃ فاطر، الآیۃ: ۲۸.

اور مادہ کی حرکت بھی وہ ہے کہ بغیر محرک کے وہ واقع نہیں ہوسکتی۔ حرکت ایک وصف ہے وہ اسی وقت پایا جائیگا جب اس کا موصوف موجود ہو اگر وہ ذات موجود نہ ہو جو موصوف ہے تو صفت یعنی وہ حرکت بھی نہیں پائی جائے گی۔ تو چونکہ مادہ اپاہج اور لاعقل ہے اس لئے اگر حرکت تعلق مادہ سے ہوگا تو عجائبات اور نظام علم کی نئی نئی چیزیں نہیں پیدا ہوں گی جب تک کہ علم اللہ اور قدرت الٰہی اس کے اندر شامل نہ ہو۔ بہرحال عجائب کی طرف بھی قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ روحانی عجائبات ہیں جن کو ارباب حقیقت نے کھولا ہے اور معرفت وبصیرت سے ذات خداوندی کا پتہ چلایا ہے۔

متقدمین کی بنیاد پر متاخرین کی تعمیر...... اسی طرح سے مادیات میں عجائبات رکھے ہوئے ہیں وہ تدریجاً کھلتے ہیں اور کھل رہے ہیں۔ جس طرح سے قرآن کے عجائبات دورِ نبوت میں ظاہر ہوئے وہ سب اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے عقدے صحابہؓ نے کھولے اور ان کے بعد تابعینؒ نے ان کو کھولا اور اس میں شاخیں پیدا ہوئیں۔ تابعین کے بعد تبع تابعینؒ متوجہ ہوئے اور ان عجائبات میں علمی عجائبات نکالے۔ یہاں تک کہ بے شمار تصانیف وجود میں آگئیں جن میں ان علوم کو مدون کیا گیا جتنے اندر یہ عجائبات اور حقائق الٰہیہ تھے اسی طرح سے کائنات کے سلسلے میں بھی ابتداء سادہ سادہ تحقیقات تھیں۔ ان سادہ تحقیقات پر اگلوں نے دوسری تعمیر کھڑی کی کہ اس کے اندر سے اور عجائبات نکلے یہاں تک کہ صدیاں اور قرون گزرنے کے بعد اب اس میں اتنی شاخیں پیدا ہوگئیں کہ انسان زمین میں ہی نہیں بلکہ فضا میں گھوم رہا ہے۔ فضا میں ہی نہیں آسمانوں کے قریب پہنچ رہا ہے اور چاند تک اس کی پرواز ہوچکی ہے تو فضا کے عجائبات بھی قرآن شریف کی روشنی میں سامنے ہیں یہ اتنا جو کچھ ہوا پچھلوں کی تحقیقات پر تعمیر کی گئی ہے۔ اگر پچھلے بنیاد نہ رکھتے تو اگلی تعمیریں نہیں ہوسکتی تھیں جس طرح سے حقائق الٰہیہ کے بارے میں بھی پچھلوں نے بنیادیں رکھیں اس پر بعد والوں نے تعمیریں کیں اور نئے نئے حقائق کھولے۔

اسی طرح مادی حقائق کے بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ بھی درحقیقت انہیں پچھلوں کا طفیل اور صدقہ ہے۔ اور انہیں کے فکر کا ثمرہ ہے انہوں نے بنیادیں قائم کیں اور اس سے آگے ہم نے دیواریں اٹھائیں اور دیواروں پر چھتیں ڈالیں اور پھر دومنزلہ، سہ منزلہ تعمیر کی، اگر بنیاد رکھنے والے بنیاد نہ رکھتے تو ہم آج یہ تعمیریں نہیں بنا سکتے تھے۔

دونوں علوم کا حقیقی نقطہ...... تو اس پوری گفتگو سے معلوم ہوا کہ دونوں علوم کا حقیقی نقطہ یہ ہے بنانے والے کو پہچانا جائے اور یہ تمام ثمرات وآثار دلالت کرتے ہیں اس موکر حقیقی کی معرفت پر تا کہ اس کی طرف جھکا جائے اور اس کے قانون پر چلا جائے۔ اسی لئے قرآن کریم نے دوسو کے قریب آیتیں ذکر کیں جن میں عجائبات کائنات ذکر کئے ہیں۔ کہ زمینوں سے لے کر فضاؤں اور آسمانوں تک اور زمین کی گہرائیوں میں اور آسمان کی بلندیوں میں عجائبات قدرت پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسری قسم کی آیتوں میں حقائق الٰہیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسری قسم کی آیتوں میں احکامات خداوندی کو بیان کیا گیا ہے اور چوتھی قسم کی آیت میں قصص وعبر اور امثال بیان کی گئیں ہیں تا کہ لوگ

عبرت پکڑیں نصیحت حاصل کریں۔

حقائق شریعت اور عجائبات کائنات کا باہمی تعلق..... بہر حال مقصد یہ ہے کہ کسی سکول یا کالج میں صرف ایک چیز کا ہونا کافی نہیں اس لئے کہ شریعت اسلام اور اس کے حقائق کا تعلق کائنات کے ساتھ چولی اور دامن کا ہے۔ اگر ان عجائبات قدرت کی طرف توجہ نہ کی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان دوسری آیتوں کو نہیں سمجھ سکیں گے جن میں مادی کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی اور علماء نے اس میں تحقیقات کی ہیں۔ علم ابدان اور علم ادیان میں سے ہر ایک کے مختلف گوشے ہیں۔

مثلاً مختلف ضروریات بدن ہیں جن کا ایک علم بن گیا کہ اگر بدن کو بیماری یا کوئی روگ لاحق ہو جائے اس کے علاج کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے لئے علم طب ہے تا کہ اصل بدن کی اصلاح کی جائے۔ اگر اس کی اصلاح نہ ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ بدن جو روحانیت کا سفر کر رہا ہے وہ نہیں کر سکتا۔ بدن ہی تو اس کے لئے سواری ہے۔ بدن کا یہ گھوڑا اگر چلنے والا نہ ہو تو شرعی اعمال بھی انجام نہیں پا سکتے۔ پھر طب کے سلسلے میں ہزاروں حقائق ہیں جو انسان کی تکوین سے متعلق ہیں کہ کس طرح انسان پیدا ہوا اور باری تعالیٰ نے کن عجائبات میں سے اس کو ظاہر کیا یہ چیزیں سامنے نہ ہوں تو بہت سے حقائق شریعت نہیں کھل سکتے جن کا مدار ان طبی تحقیقات کے کھلنے پر ہے تو انسان میں سب سے پہلے بدن کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ صلاح اور صحت ہے اور وہ موقوف ہے علم طب پر۔ اس بناء پر اس کے لئے علم طب ضروری ہے۔

اور علم طب انبیاء علیہم السلام پر بھی اترا ہے۔ وحی کے ذریعہ اس کے اصول آئے ہیں اور پھر تجربہ کاروں نے اس کو بڑھایا۔ اسی طرح بدن کے دوسرے عوارض ہیں مثلاً تن ڈھانپنے کا قصہ ہے اس کے لئے کپڑا اپنانا یا بنانا ہے۔ اسی طرح سے اثاث البیت ہے کہ انسان کی بہت سی ضروریات ہیں۔ کھانے پینے سے رہنے سے۔ مکان بنانے سے متعلق قرآن کریم میں ان چیزوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے اور احسانات خداوندی کے تحت مکانات کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ﴾ ① یعنی کپڑوں کے گھر اور اینٹ پتھر کے گھر اور پہاڑوں کے گھر دیئے گئے تا کہ ان میں سکونت حاصل کرو تم۔ اسی طرح قرآن کریم نے ہر چیز کی طرف توجہ فرمائی ہے خواہ لباس ہو، خواہ کھانے پینے کی شئے ہو خواہ رہن سہن اور صحت و مرض، اور تمام مستقل فن بن گئی ہیں اور ہر فن ایک مستقل موضوع پر مشتمل ہے اور ان کے احکام الگ ہیں اس کے عوارض الگ ہیں اس کے احوال الگ ہیں۔ تو کالج کے اندر جہاں اس کی ضرورت ہے کہ کائناتی اشیاء کو سمجھا جائے وہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا آخری نقطہ خدا کی معرفت ہو، اسلام نے ان چیزوں کی طرف

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۰۔

توجہ محض عیش کرنے کے لئے نہیں دلائی۔ عیش وعشرت کوئی دوامی چیز نہیں، یہ تو چند روزہ قصہ ہے۔

منزلِ مقصود اور اس کائنات کی حقیقت...... آدمی دنیا میں آیا ہے مسافر کی طرح سے اس کو ایک بڑی منزل تک جانا ہے۔ اگر وہ اصل منزل کو گنوا بیٹھا تو اس نے کائنات کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ یہ تو راستہ اور رہ گزر ہے مگر چونکہ راستے کے نشیب وفراز کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر آدمی راستہ نہیں چل سکتا اور نہ ہی آدمی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے اس دنیا کے عجائبات کا دیکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ وہی تو راستہ ہے کہ جس پر چل کر آدمی اپنے خدا کی معرفت تک پہنچتا ہے۔ تو ہماری منزل بھی آخرت ہے وہ اسی دنیا میں سے نکلتی ہے۔ یہ تصور غلط ہوگا کہ آخرت کا کوئی مکان الگ ہے اور دنیا کا مکان الگ ہے۔ بلکہ اسی دنیا میں سے آخرت نکلتی ہے۔ اور اسی میں سے وہ اعمال پیدا ہوتے ہیں کہ جس سے آدمی اپنے خدا تک پہنچتا ہے، مثلاً دولت کمائے گا تو اسی دولت کے ذریعہ وہ زکوٰۃ صدقات دے گا۔ اور دیگر کارِ خیر انجام دے گا۔ تو دولت میں سے ہی اس کی آخرت نکل رہی ہے۔ اگر دولت سامنے نہ ہوتی تو یہ آخرت کا محل کیسے تعمیر ہوتا۔ اسی طرح سے دوسری چیزیں ہیں۔ بدن کی صحت ہے اگر بدن صحیح نہ ہوگا تو آخرت کے اعمال کیسے انجام پائیں گے۔ اسی لئے دنیا کو رہ گزر فرمایا ہے اسی بناء پر راستہ کے نشیب وفراز سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ رہنے کا طریقہ جاننا بھی ضروری ہے۔

انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد...... بلڈنگ انسانوں کے لئے بنتی ہے۔ اور انسان اخلاق سے بنتا ہے۔ جب تک انسان کا کردار اور کریکٹر اچھا نہ ہو اور اونچا نہ ہو اور اس کی اخلاقی حالت بلند نہ ہو اس وقت تک وہ انسان نہیں ہے۔ انسان اچھے کپڑوں کا نام نہیں ہے۔ انسان نام ہے اچھے کردار کا اچھے کریکٹر کا اور سب سے پہلی چیز ہے انسانیت اور انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد ہے انس ومودۃ اور اخوت کا باہمی سلوک کہ تمام آدمی بھائی بھائی بن کر رہیں اور آدمی ایک دوسرے کی ہمدردی میں غرق ہو اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کے لئے مستعد ہو اس میں ایثار و قربانی کا جذبہ ہو کہ میں خود تکلیف اٹھالوں گا اپنے بھائی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کر کے خود راحت اٹھانا انسانیت نہیں اور نہ حقیقت میں راحت ہے بلکہ اس کا نام خود غرضی ہے۔

معرفتِ الٰہی...... غرض ان تمام چیزوں کا مقصد معرفتِ الٰہی ہے اور معرفتِ الٰہی نہیں ہوسکتی جب تک کہ معرفتِ نفس نہ ہو اس لئے کہ صوفیاء کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" (1) جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس کو پروردگار کی معرفت حاصل ہوگئی۔

اسی ذیل میں ایک مستقل علم وجود میں آیا جس کا نام علم النفس ہے جس سے نفس کے اتار چڑھاؤ نشیب و

---

(1) مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، ج: ۱، ص: ۳۵۰۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: قال النووی: غیر ثابت، وقال ابن السمعانی: هو من كلام يحيى بن معاذ الرازي رضي الله عنه دیکھئے: الدرر المنتثرة في الاحاديث المشتهرة حرف الميم ج: ۱ ص: ۱۸۔

فراز کو پہچانا جائے کہ کیا کیا چیزیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔ان علوم سے نفس کی کمزوریوں اور نسانی طبائع کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا حاصل کرنا مفید ہے اگر نقطۂ نظر صحیح ہو اور کسی علم وفن کی اصل بناء میں کوئی فساد نہ ہو تو اس علم کو کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان علوم کو حاصل کریں اور اصل نقطہ کو سامنے رکھ کر ان علوم کو وہاں تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں!

متاعِ مشترک...... بہرحال اس کی بہت زیادہ مسرت اور خوشی ہوئی کہ مسلمانانِ میل شارم نے اپنی حوصلہ مندی سے اور اپنے ظرف کی وسعتوں سے ایک اتنی بڑی تعمیر کھڑی کر دی۔یہ علامت ہے اس بات کی کہ وہ معنوی تعمیر کو بھی اونچا دیکھنا چاہتے ہیں۔انسانیت اور علم کی تعمیر کو بھی اونچا لے جانا چاہتے ہیں۔حق تعالیٰ شانہٗ ان کے ارادوں میں برکت دے، آمین۔اور جو جو ان کے مقاصد ہیں ان کی تکمیل فرمائے۔اس سے نہ صرف میل شارم کے لوگوں کو خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں بلکہ آس پاس کے علاقہ اور تمام لوگوں کو توفیق دے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔تعلیم گاہ درحقیقت سب کے لئے ہوتی ہے علم کسی خاص قوم کی وراثت نہیں بلکہ علم سارے انسانوں کی ایک مشترک پونجی ہے۔مسلم ہو غیر مسلم ہو۔کسی بھی ملت کا ہو علم سب کی ایک مشترک متاع ہے۔کسی کالج یا سکول کا قیام اسی لئے ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچایا جائے۔خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔تو ایک بڑی خوشی کی بات ہے کہ میل شارم میں اس قسم کا کالج قائم ہوا۔

اور جہاں تک میرے علم میں آیا اس کا فیضان عام ہے کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بلاامتیاز مذہب وملت ہر قوم کے انسان اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔اس کی ضرورت بھی ہے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے مقاصد حسنہ میں کامیاب کرے اور ان مقاصد کی تکمیل فرمائے۔آمین۔

شہ کا مصاحب..... میں آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں ذمہ داران کالج کا کہ انہوں نے مجھ جیسے ناچیز کو یاد فرمایا۔میرا تعارف اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک طالب علم ہوں۔اس کے سوا اور کچھ میری اصلیت نہیں اور نہ کوئی تعارف ہے۔اگر کوئی کام بن پڑتا ہے تو وہ درحقیقت اثر ان اکابر اور ان بزرگوں کا ہی ہے۔

بقول غالب کے علماء کے لئے ان کا ایک شعر کافی ہے۔اس نے کہا۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرا ہے اتراتا ۔۔۔ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

تو حقیقت یہ ہے کہ ہماری ذاتی اور شخصی کوئی آبرو نہیں ہے۔البتہ بڑوں کی ایک جماعت ہے۔اور وہ جماعت بین الاقوامی بزرگوں کی ہے۔ان کی شخصیتیں بہت بلند ہیں۔ان سے وابستگی اور ان سے نسبت ایک بڑی چیز ہے۔ذرے کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ہے۔

نسبت کی عظمت...... لیکن چونکہ اس کو نسبت ہے آفتاب سے اور وہ نسبت بڑی ہے اس لئے اس درجہ کی بھی بڑی حیثیت ہوتی ہے اور وہی ہم بھی کہتے ہیں۔

اگرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم

ہم تو خورد اور لاشی ہیں لیکن نسبت ایک بڑی چیز سے قائم ہے اور وہ نسبت بڑی ہے جو اس کے لپیٹ میں آ جائے گا وہ بڑا دکھائی دے گا۔ حقیقت میں بڑائی انہیں بزرگوں کی ہے۔ ہماری کوئی بڑائی نہیں۔ مخلص بزرگوں کی ایک جماعت ہے وہ بہت سچے لوگ تھے ان کی سچائی آج تک چل رہی ہے۔ اخلاص سے جو روح انہوں نے پھونکی وہ اسی شان سے قائم ہے، اسی کی چمک اور روشنی میں جو آ گیا بن گیا۔ اس کے نتیجے میں اہل علم بنے اہل فضل بنے، اہل کمال بنے۔

تو ہمارا اس سے زیادہ تعارف کچھ نہیں کہ دار العلوم دیوبند سے اور وہاں کے بزرگوں سے ایک تعلق ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی قدر دانی اور قدر افزائی فرمائی در حقیقت ان ہی کی قدر فرمائی ہے۔ میں صرف ایک واسطہ ہوں میں سمجھتا ہوں کہ یہ قدر دانی انہیں بزرگوں کی طرف جا رہی ہے۔ آپ نے جو کچھ اچھے اور اونچے کلمات فرمائے۔ در حقیقت میں واسطہ ضرور ہوں میرے ذریعہ سے یہ کلمات خیر وہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور میں اخیر میں پھر مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں آپ حضرات کا کہ یاد فرمایا اور کچھ خیالات ظاہر کرنے کا بھی موقع عنایت فرمایا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مرکزِ سعادت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!.....عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ مَنْهُوْمٌ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ وَمَنْهُوْمٌ فِي الدُّنْيَا لَا يَشْبَعُ مِنْهَا .(صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ①

فاتحۃ الکلام..... بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! آپ حضرات کی دعوت پر میں حاضر تو ہو گیا لیکن سوچتا ہوں کہ آپ کے سامنے کیا کہوں۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ کہوں گا وہ آپ جانتے ہیں۔ایسی کوئی نئی بات سمجھ میں نہیں آتی جو آپ کے علم میں نہ ہو اور میں اسے علم میں لاؤں۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں علم کی دولت سب سے بڑی دولت ہے اور علم کی روشنی سب سے بڑی روشنی ہے۔آپ کو سورج کی روشنی سب سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔پورے عالم میں پھیلی دکھائی دیتی ہے۔مگر اس کے ذریعہ صرف رنگ اور صورت کا علم ہوتا ہے۔ لیکن علم کی روشنی اسلام اور کفر کا فرق بتلاتی ہے،سنت اور بدعت میں امتیاز سکھاتی ہے۔حق و باطل کی پہچان کا ذریعہ ہوتی ہے۔یہ انبیاء علیہم السلام کا طفیل ہے۔ان کی جوتیوں کا صدقہ ہے اور ان حضرات کا لاکھ لاکھ کرم و احسان ہے کہ انہوں نے علم کی روشنی پیش کی جو ہمارے لئے اچھائی، برائی، بھلے اور برے کے درمیان تمیز کا ذریعہ بنی۔

تحصیلِ حاصل..... آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ علم تعلیم سے آتا ہے اور آپ سب ہی حضرات تعلیم میں مشغول ہیں۔اسباق میں حاضری ہے،مطالعہ ہے، آپس میں مذاکرہ ہے۔غرضیکہ رات دن آپ علم ہی کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔اس لئے اسکی نصیحت کرنا تحصیلِ حاصل ہے اور اگر عمل کے سلسلے میں کچھ کہا جائے تو آپ کہیں گے کہ سب سے بڑا عمل خود علم کا حصول ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء کے درمیان جب یہ بحث ہوئی کہ کثرتِ نوافل افضل ہے یا زیادتِ علم۔

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

تو کثرت سے فقہاء زیادت علم ہی کی افضلیت کے قائل ہوئے۔ آپ حضرات تحصیل علم میں لگے ہوئے ہیں، جو سب سے بڑا عمل ہے۔ اس کے علاوہ فرائض وغیرہ کی ادائیگی میں بھی آپ کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوتی۔ نماز کے لئے آپ جوق در جوق آتے ہیں، ہر وقت مسجد بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ دارالعلوم کی مسجد تو آپ سے پر رہتی ہی ہے۔ شہر کی مسجدیں بھی آپ لوگوں سے آباد ہیں، لہٰذا اگر عمل کے سلسلے میں کچھ عرض کروں تو بھی آپ کہیں گے کہ عمل تو ہم کر ہی رہے ہیں۔

جہاں تک آپ لوگوں کی اخلاقی حیثیت کا تعلق ہے وہ بھی درست ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اگر ہم پچھلوں کے اخلاق سے موازنہ کرتے ہیں تو کچھ کمی محسوس ہوتی ہے، لیکن اگر ہم دورِ حاضر کے دوسرے طبقوں کے اخلاق و کریکٹر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں نہ صرف یہ کہ آپ لوگوں کے اخلاق کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، بلکہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آپ حضرات ہی کا وہ طبقہ ہے جو اس اخلاقی قحط کے دور میں بھی اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کچھ کہنا فائدے سے خالی ہی ہوگا اور اصولی و نوعی طور پر یہی کچھ دائرے تھے کہ جن کے متعلق کچھ کہا جا سکتا تھا اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ ساری چیزیں آپ کو حاصل ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسی چیز آپ کے سامنے رکھی جائے جو مفید ہو۔

محروم القسمت کا حال ...... اس وقت مجھے مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ اور مقولہ یاد آیا وہ یہ کہ آپ جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت ہو کر واپس ہوئے تو کافی عرصے تک کوئی خط و کتابت نہیں کی۔ آخر کار حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا کے پاس ایک خط لکھا، کہ جملہ متوسلین کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں جس سے ان کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ایک مدت گزری آپ کی کوئی حالت معلوم نہ ہوسکی، اپنے حالات لکھئے تاکہ اندازہ ہو سکے۔ مولانا نے جواب دیا اور ابتداء اس طرح کی: ''حضرت مجھ محروم القسمت کا تو کوئی حال ہی نہیں اگر کوئی حال ہوتا تو عرض کرتا''۔ پھر اخیر میں لکھا کہ البتہ حضرت کی جوتیوں کے طفیل میں تین باتیں اپنے اندر پاتا ہوں۔ ایک یہ کہ امورِ شرعیہ امورِ طبعیہ بن گئے ہیں، گویا نماز، روزہ اور دوسری عبادات ادا کرنے کے لئے ایسا مجبور ہوں جیسے بھوک کے وقت کھانے کے لئے اور پیاس میں پانی کے لئے۔ دوسری بات یہ کہ مدح و ذم یکساں نظر آتے ہیں کوئی ہزار تعریف کرے، ہزار مذمت کرے نفس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ گویا مخلوق کچھ بھی کہتی رہے اس کی نہ کچھ پرواہ ہوتی ہے اور نہ قلب پر کوئی اثر ہوتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ نصوصِ شرعیہ میں کہیں تعارض نہیں معلوم ہوتا۔ تعارض تو کیا موزونیت اتنی معلوم ہوتی ہے کہ ہر کلی اپنی جگہ پر ٹھیک اور درست دکھائی دیتی ہے۔

مرکزِ سعادت ...... امورِ شرعیہ امورِ طبعیہ بن جائیں یہ قوتِ عملیہ سے ہوتا ہے۔ اور لوگوں کی تعریف و برائی کا یکساں معلوم ہونا قوتِ اخلاقی کا تقاضا ہے۔ قوتِ عملی کی انتہا یہ ہے کہ آدمی میں طاعت کی رغبت اس درجہ پیدا ہو جائے کہ بغیر اس کے کئے ہوئے چین ہی نہ آئے۔ قوتِ اخلاقی کی انتہا یہ ہے کہ اس درجہ غنا پیدا ہو جائے کہ

لوگوں کی تعریف اور برائی یکساں معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح قوت علمی کی انتہا یہ ہے کہ قرآن وسنت کی ہر چیز اپنی جگہ پر بالکل درست اور ٹھیک معلوم ہو اور شریعت اسلامیہ ایک گلدستہ نظر آتی ہو۔ سعادت انسانی کے لئے انہیں تین چیزوں کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ (۱) علمی قوت (۲) عملی قوت (۳) اخلاقی قوت اور آپ ایسی جگہ میں ہیں جو علمی، عملی، اخلاقی قوتوں کا مرکز ہے۔ جہاں ایسی ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جو ہر اعتبار سے کامل و مکمل تھیں۔ میں اپنی بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ ایسی باکمال شخصیتوں کی شکلیں دیکھی ہیں۔ بعض سے کچھ استفادہ کا بھی موقعہ ملا۔ استاذ محترم حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اللہ' اکبر' چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ اتباع سنت کا یہ حال کہ ان کے عمل کو دیکھ کر مسائل نکالے جاتے تھے۔ ایسے ہی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، ان تمام حضرات کی زیارت کے شرف کے ساتھ ساتھ ان سے کچھ استفادہ کا بھی موقع ملا۔ استاذ محترم حضرت تھانویؒ کی زیارت بھی نصیب ہوئی اور حسب توفیق استفادہ کا بھی شرف نصیب ہوا۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں کا ایک ایک شخص پوری پوری قوم کے برابر ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ملک کے گوشے گوشے میں مواعظ کہے اور ایک ہزار کے قریب تصانیف کیں۔ بہت سے علماء مل کر بیٹھیں تو بھی اتنا کام مشکل سے ہو سکے گا۔ حق تعالیٰ نے آپ سے ایسے کام لئے جس کا ایک قوم اور ایک جماعت سے ہونا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

جائے بزرگاں بجائے بزرگاں!...... پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان بزرگوں کے اثرات اس جگہ اور اس ادارہ میں نہ ہوں ایک پھول کپڑے کو لگ جاتا ہے تو اس پر اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے دیر تک کپڑے سے خوشبو آتی رہتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شجرۃ الرضوان کے نیچے بیٹھ کر چودہ سو صحابہؓ سے بیعت لی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تھوڑے سے قیام کی وجہ سے اس جگہ کو آپ سے ایک نسبت حاصل ہوئی تھی اور وہ جگہ مقدس و متبرک ہوگئی تھی۔ چنانچہ حضرات صحابہؓ ان برکات کو محسوس کرتے تھے، اس درخت کے نیچے بیٹھتے تھے دعائیں مانگتے تھے۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا ابھی تو خیر القرون ہے اور اس درخت کے ساتھ امت کی عقیدت کا یہ حال ہے، بہت ممکن ہے کہ کل کو ایسی نسلیں آئیں جو عقیدت میں غلو سے کام لیں اور اس کی وجہ سے شرک و بدعت کا دروازہ کھل جائے اس درخت کو کٹوا دیا۔ اس واقعہ سے آپ کو یہ بتانا تھا کہ جائے بزرگاں بجائے بزرگاں، والا مقولہ بالکل صحیح ہے۔ پس یہ ادارہ جہاں اکابر اولیاء اور اپنے وقت کے مسلم قطب اور ولی رہ چکے ہیں ان کے پاکیزہ اثرات سے اس کے در و دیوار کب خالی رہ سکتے ہیں۔

حاصل یہ کہ آپ ایک ایسے ادارے میں ہیں جسے طرح طرح کی نسبتیں اور تقدس حاصل ہے جو برکات یہاں ملتی ہے وہ دوسری جگہ نظر نہیں آتیں۔ دارالعلوم کی ایک ایک جگہ کے بارے میں اکابرین کے مکاشفات ہیں۔ نودرہ کی عمارت کے بارے میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کا مکاشفہ ہے کہ عرش سے ایک مسلسل لڑی ہے جو نودرہ کی درسگاہوں تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ تجربہ یہ ہے کہ جتنا یہاں بیٹھ کر کتابیں سمجھ میں آتی ہیں۔

دوسری جگہ نہیں آتیں۔ تو درہ کے سامنے کی جگہ جہاں جنازہ رکھا جاتا ہے اس کے متعلق مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کا مکاشفہ ہے کہ جس جنازے کی نماز یہاں ہو جائے وہ مغفور ہوتا ہے۔

الہامی درسگاہ ...... بھائی! یہ الہامی مدرسہ ہے اس کا آغاز بھی الہام سے ہوا ہے۔ اس کی تعمیر بھی الہام سے ہوئی اور طلباء کا داخلہ بھی الہام سے ہی ہوتا ہے، بلکہ بعض واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس کے اساتذہ کا تقرر اور تعیین بھی خاص زاویوں میں ہوتا ہے اور یہاں کی خدمت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس مدرسہ کا آغاز اور مدرسوں کی طرح کی رسمی مشورے سے نہیں ہوا بلکہ وقت کے اکابر و مشائخ کا ایک اجماع سا ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس کے وقت میں کسی کو کشف ہوا کہ یہاں پر ایک دینی مدرسے کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔ کسی نے خواب میں دیکھا کہ یہاں پر ایک مدرسہ کا قیام ہونا چاہئے۔ کسی پر القا ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام کا تحفظ دینی اداروں سے ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تعمیر کے وقت بنیاد کھودنے کے لئے کچھ نشانات لگا دیئے گئے۔ جتنا اب ہے اس سے آدھے پر نشان لگایا گیا تھا۔

الہامی اہتمام ...... دارالعلوم کے سب سے پہلے مہتمم حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تارک الدنیا اور نہایت ہی قوی النسبت بزرگ تھے۔ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ کتاب پڑھ سکتے تھے۔ مولانا نانوتویؒ نے انہیں بلایا اور اہتمام پیش کیا، آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نہ تو لکھنا جانتا ہوں، نہ پڑھنا، مجھے مہتمم بنا کر کیا کیجئے گا۔ حضرتؒ نے فرمایا نہیں۔ منجانب اللہ یہی مقدر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی اہتمام قبول کریں۔ چنانچہ آپ نے قبول فرمالیا۔

الہامی طلباء ...... حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ مولسری کے احاطہ میں جو کنواں ہے اس کی منڈیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور دودھ تقسیم فرمارہے ہیں۔ دودھ لینے والوں میں سے بعض کے ہاتھ میں پیالہ ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ ہاتھ پھیلا کر چلو ہی سے پی لیتا ہے۔ حضرت جب بیدار ہوئے تو مراقبہ فرمایا کہ آخر یہ کیا چیز ہے۔ کچھ دیر مراقب رہنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ دودھ صورت مثالی علم کی ہے۔ اور قاسم العلوم نبی اکریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ علم تقسیم فرمارہے ہیں اور طلباء فرق مراتب کے ساتھ علم حاصل کر رہے ہیں۔ اس واقعہ کا علم لوگوں کو اس طرح ہوا کہ ایک بار شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ احاطہ مولسری میں کھڑے تھے ایک طالب علم شوربہ کا پیالہ آپ کے سامنے لے کر آیا اور اسے پھینک کر کہنے لگا: "نہ اس میں گھی ہے اور نہ مصالحہ ہے اور شاید مفتی صاحب اس سے وضو کے جواز کا فتویٰ بھی دیدیں یہ ہے آپ کا اہتمام؟"

جب وہ طالب علم چلا گیا تو آپ نے پوچھا کیا یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالب علم ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں حضرت! یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالب علم ہے اور مطبخ سے اس کا کھانا ہے اور مطبخ کے رجسٹر میں اس کا نام درج ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں! یہ مدرسہ کا طالب علم معلوم نہیں ہوتا۔ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اسی نام کا ایک دوسرا طالب علم

ہے۔ اصل میں کھانا اس کا تھا، لیکن نام میں اشتراک کی بناء پر غلطی سے ٹکٹ اسے مل گیا تھا۔ طلبہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: حضرت! بات تو وہ ہوئی جو آپ نے فرمایا تھا۔ مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس پر آپ نے دودھ والا واقعہ بیان فرمایا اور اس کے بعد جو عجیب بات فرمائی وہ یہ کہ جب شوال میں طلباء داخل ہوتے ہیں تو میں ایک ایک کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اس مجمع میں تھا۔ اس طالب علم پر میں نے تین مرتبہ نگاہ ڈالی تو مجھے یہی معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں شریک نہیں تھا۔ بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ مدرسہ الہامی مدرسہ ہے اس کا آغاز بھی الہام سے ہوا اور طلباء کا انتخاب بھی الہام سے ہوتا ہے۔

الہامی سنگِ بنیاد...... اور اس کا سنگِ بنیاد بھی الہام ہی سے رکھا گیا۔ بنیاد کے لئے لوگوں نے جو نشان لگایا تھا اس پر ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے خواب دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ عصائے مبارک ہاتھ میں ہے اور فرماتے ہیں کہ "یہ احاطہ تنگ رہے گا کافی نہیں ہوگا"۔

چنانچہ آپ نے مولانا نصیر احمد صاحب کی درسگاہ کے پاس نشان لگایا۔ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نیند سے بیدار ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ لکیریں بالکل اسی طرح موجود ہیں۔ پھر شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بنیاد اسی پر کھودی جائے گی، اب مجھے کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حقائق و کیفیات کا فرق...... آپ حضرات ایک ایسے مقام پر ہیں کہ جسے سینکڑوں بزرگوں کی نسبتیں حاصل ہیں۔ مجموعی اور غیر شعوری طور پر وہ ساری نسبتیں کام کر رہی ہیں۔ اس لئے میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ جو علم اور جو خیر و برکت یہاں ہے دوسری جگہ نظر نہیں آتی، کتابیں وہی ہوتی ہیں، الفاظ وہی ہوتے ہیں، مگر حقائق و کیفیات میں فرق ہو جاتا ہے۔

میں نے مشکوٰۃ شریف اپنے والد مرحوم مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے پڑھی ہے۔ والد صاحبؒ جس وقت برزخ، موت، قیامت، حشر و نشر سے متعلق احادیث پر پہنچے اور تقریر شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میدان قیامت سامنے ہے، یہ قبر ہے، حساب، کتاب ہے، عذاب و ثواب ہے۔ اس انداز اور ایسی کیفیت سے تعلیم ہوتی کہ ہم محسوس کرتے کہ یہی حالات ہمارے اوپر طاری ہو رہے ہیں۔

نسبتوں کا چمن...... دارالعلوم پر ایک وقت وہ بھی گزرا ہے کہ مہتمم سے لے کر دربان تک سب اہل نسبت بزرگ تھے۔ حاجی عبداللہ صاحبؒ دربان تھے۔ نوشت و خواند کچھ نہ تھی، لیکن صاحب نسبت بزرگ تھے۔ صبح صادق پر جو دارالعلوم میں گھنٹہ بجتا ہے، اس کے بجانے کا کام انہی کے سپرد تھا۔ پہلی ضرب لگاتے تو زبان پر سبحان اللہ ہوتا، دوسری پر الحمد للہ اور تیسری پر اللہ اکبر کے ایک نعرہ کے ساتھ پھر یہ شعر زبان پر عجیب کیفیت سے لاتے ۔

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں ۔۔۔ اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

یہ منظر کچھ ایسا ہوتا کہ جو سنتا بے اختیار اس پر بکاء طاری ہو جاتا۔ حاصل یہ کہ یہ ایک مثالی جگہ ہے۔ اسے نہ جانے

کیسی کیسی نسبتیں حاصل ہیں۔ یہاں کم سے کم درجے کا طالب علم آتا ہے، اس کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے، اس جگہ پر رہ کر محروم رہنے کا کوئی سوال نہیں۔ تو بھائی اگر نسبتوں کے بارے میں کچھ بات کی جائے تو بفضلہٖ تعالیٰ وہ بھی موجود ہے۔

زیادۃ فی العلم...... مگر ہاں اسی کے ساتھ ساتھ ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ ایک تو اصل علم اور راس العلم ہے، جسے آپ حاصل کر رہے ہیں اور جو آٹھ دس سال میں حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی پر قناعت نہ کرنا چاہئے بلکہ اضافہ کی برابر کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ جس طرح اصل علم مطلوب ہے ویسے ہی زیادۃ فی العلم بھی مطلوب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے ﴿ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ ① حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ علوم دیئے گئے تھے جو ساری کائنات میں سے کسی کو نہیں دیئے گئے، چونکہ یہ انسان کی صفت نہیں ہے بلکہ اللہ کی صفت ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ساری صفات غیر محدود ہیں اس لئے آپ جتنا بھی علم حاصل کرتے جائیں گے، جہالت دور ہوتی چلی جائے گی اور آگے میدان مزید نظر آئے گا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ مرض وفات میں ہیں۔ ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ آپ مطالعہ نہ فرمایا کیجئے۔ مگر جب ڈاکٹر چلے جاتے تو آپ فوراً مطالعہ میں مشغول ہو جاتے لوگ کہتے کہ حضرت! ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ تو فرماتے بھائی! کیا کروں یہ مرض مطالعہ کا بالکل لاعلاج مرض لگا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں شاید آپ چند ساعت ہی ترک مطالعہ کرتے۔ اس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ آپ کی ولادت اولیٰ مطالعہ پر ہی تھی، حضرت کو زیادۃ فی العلم کی ایک دھن لگی ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے حفظ اتنا قوی دیا تھا کہ جو چیز ایک بار دیکھ لیتے تو عمر بھر کے لئے کافی ہو جاتی۔ خود ایک بار درس میں فرمایا کہ جو چیز نظر سے گزر جاتی ہے پھر فراموش نہیں ہوتی۔ درس میں مشہور و معروف کتب تو درکنار غیر متعارف قلمی نادر کتب کا حوالہ بقیہ صفحات وسطور اس طرح دیتے کہ محسوس ہوتا کہ شاید گذشتہ رات ہی حضرتؒ نے ان کتابوں کا مطالعہ فرمایا ہے۔ اس قدر قوت حفظ کے ہوتے ہوئے حضرتؒ نے تیرہ بار فتح الباری کا از اول تا آخر مطالعہ کیا تھا۔ بتایئے کہ جس کے ایک بار کتاب دیکھ لینے کے بعد یہ عالم ہو کہ سالہا سال کے بعد بھی مستحضر، تو تیرہ بار فتح الباری کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا عالم ہوگا۔ آپ کے یہاں حدیث کا درس ہوتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ سارے ہی فنون کا درس ہوتا تھا۔ افسوس کہ آپ کی بتائی ہوئی باتیں اور تقریر محفوظ نہ رکھ سکا۔

علم کی دھن...... تو بھائی! علم آدمی کو محنت سے ملتا ہے، دھن سے ملتا ہے۔ یہ دھن پیدا ہو جانی چاہئے کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے اور اس کو سود در سود کر کے بڑھاتے ہی چلے جانا ہے۔ جب دھن پیدا ہو جائیگی تو آپ زیادہ سے زیادہ کتب بینی کریں گے اور جب آپ کتب بینی کے عادی ہو جائیں گے، تو پھر آپ میں تفقہ پیدا ہوگا۔ اور جب تفقہ پیدا ہو جائے گا، تو آپ کسی شے کے محض حکم ہی پر قناعت نہ کریں گے بلکہ اس کی حکمت کو بھی معلوم کرنے کی

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۱۴۔

کوشش کریں گے۔ اور جب حکمت معلوم کرلیں گے تو اس سے بڑھ کر علت معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور جب علت معلوم ہوجائے گی تو آپ اسی پر قناعت نہیں کریں گے بلکہ اس وقت آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس علت کا رابطہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کس صفت سے ہے۔

علم وعمل کی سند..... ایک بات آپ حضرات سے کہہ دوں کہ جس طرح آپ علم حاصل کرنے کے لئے مجاہدہ کرتے ہیں، مشقتیں برداشت کرتے ہیں، اسی طرح آپ کی عملی اور اخلاقی قوت مضبوط نہیں ہوگی، علم کام نہیں دے گا، جب تک سلسلۂ عمل کو بھی متصل نہ کیا جائے۔ ایک عالم میں اگر کبر ہو، حسد ہو، بغض ہو، کینہ ہو، حب جاہ ہو، تو وہ خود بھی ذلیل ہوگا اور علم کو بھی ذلیل کرے گا۔ اسلاف جب علم سیکھ لیتے تھے تو اس کے بعد مستقل طور پر عمل بھی سیکھتے تھے۔ خود دارالعلوم پر نصف صدی ایسی گزری تاوقتیکہ شیخ کامل سے اجازت نہ ہوتی دارالعلوم اپنی علمی سند نہ دیتا گویہ علم وعمل کی تکمیل کا نام سند تھا۔

علم وخشیت..... میں نے آپ کے سامنے جو حدیث پڑھی تھی۔ یعنی نہ تو کوئی طالب علم کبھی سیر ہوتا ہے اور نہ طالب دنیا سیر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ کسی طالب دنیا کو کسی حد پر قناعت ہوتی ہے۔ اور نہ طالب علم کو بلکہ حرص بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اگر کسی کے پاس سو روپیہ ہے تو وہ دوسو کی خواہش میں لگا ہوتا ہے۔ اگر دوسو ہیں تو چار سو کی خواہش ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی عالم کو اگر سو مسئلے معلوم ہوگئے تو دوسو معلوم کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ جب علم کی طلب اس درجہ تک پہنچ جائے گی تو علم خود ہی عمل کو دعوت دے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ① جس قدر علم بڑھتا جائے گا خشیت بڑھتی جائے گی۔ اور جب خشیت بڑھے گی تو آپ یقیناً طاعت کی جانب مائل ہوں گے۔ اس لئے کہ علم کے لوازم میں عمل ہے۔

راہنمائی کی تیاری کا زمانہ..... اب تو آپ حضرات کا طالب علمی کا زمانہ ہے ابھی آپ دوسروں کی نگرانی میں رہتے ہیں۔ اور یہاں رہ کر آپ صالح بن رہے ہیں۔ مگر یہاں سے جانے کے بعد آپ خود نگران بنیں گے اور آپ کو مصلح بننا ہوگا پھر آپ کے سامنے مختلف قسم کے مسائل آئیں گے اور اس کے مطابق آپ کو تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی، آپ کے سامنے ملک وقوم کے حالات ہوں گے اور آپکو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت قوم میں کون سی بیماریاں ہیں؟ کیا کوتاہیاں ہیں؟ ان کے اسباب کیا ہیں؟ اور ازالہ کی تدابیر کیا ہوں گی؟

ایسے ہی یہاں سے نکلنے کے بعد آپکے سامنے شرک وبدعت کا میدان ہوگا اور عیسائیت ویہودیت سے بھی مقابلہ رہے گا۔ اگر آپ نے ان کاموں کے لئے ابھی سے تیاری نہ کی اور محنت ومشقت کر کے میدان کو ہموار نہ کر لیا تو آگے چل کر آپ کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ظاہر ہے۔

میری خواہش ہے کہ آپ یہاں سے صرف عالم اور صالح بن کر نہ نکلیں بلکہ معلم اور مصلح بن کر نکلنے کی کوشش

① پارہ: ۲۲ سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸۔

کریں۔اس لئے کہ قوم منتظر ہے کہ ہمارے نونہال دارالعلوم میں پڑھنے گئے ہیں، وہ آئیں گے ہماری اصلاح کریں گے۔ ہمیں غلط راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر لگائیں گے اور ہماری پریشانیوں کا حل ہوں گے۔لہٰذا پہلے ان چیزوں کے سلسلے میں خود بھی سوچیں۔اس کا حل نکالیں۔اپنے اساتذہ سے سوالات کریں پھر آپ کو ایسا وقت ملے گا نہ ایسے اساتذہ ملیں گے۔اور اگر آپ یہ کہیں کہ ہم یہ سب کرتے رہتے ہیں تو خیر کوئی حرج نہیں، اس لئے میں نے یہ چند باتیں آپ لوگوں سے عرض کر دیں۔

خلوص و محبت کا شکریہ...... آپ نے جس محبت وخلوص سے یاد فرمایا میں اس کا شکر گزار ہوں اور صرف شکر گزار ہی نہیں اس لئے کہ یہ تو ایک وقتی اور رسمی چیز ہوگئی ہے۔میں آپ حضرات کے لئے خلوصِ قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علمِ نافع اور عملِ صالح کی توفیق دے۔میں کیا ہوں کچھ بھی تو نہیں۔بس ایک نام ایک نسبت لگ گئی ہے، ان بزرگوں کے ساتھ جن کے طفیل میں ہم اور آپ آج یہاں موجود ہیں۔غالب نے کہا ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا ۔۔۔ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ہمارا تو جو کچھ بھی ہے انہیں بزرگوں کی وجہ سے ہے۔ہمیں تو روٹیاں بھی مل رہی ہیں۔تو انہیں بزرگوں کے طفیل میں، سپاسنامے اور تعارف میں تو اکثر مبالغے ہی سے کام لیا جاتا ہے۔اور اس میں ایران توران کی باتیں کہی جاتی ہیں۔آپ لوگوں کی جانب سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا ہے اس میں بھی مجھے ہر طرح سے اچھا اور لائق دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔مگر کیا عجب ہے کہ جب اتنے لائق لوگ ایک نالائق کو لائق کہہ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ اتنے لائقوں کی لاج رکھ لیں اور یہی میری بخشش کا ذریعہ بن جائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

امتیازِ دارالعلوم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ، فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. ①

ایک بڑی کمی...... بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز طلبا! پروگرام میں عربی تقریروں اور نظموں کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا نمبر تھا۔ افسوس ہے کہ وہ اس وقت یہاں موجود نہیں ورنہ ارشادات گرامی سے مستفیض فرماتے۔ اگر حضرت موجود ہوتے تو ہم سب کے لئے کارآمد اور مفید ہوتا۔ میں نے حضرت مولاناؒ سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ جلسہ انعام کی تاریخوں میں شرکت نہ فرما سکیں تو جلسہ کو موخر کیا جائے۔ مگر حضرت نے پسند نہ فرمایا اور وعدہ کیا کہ حتی الامکان شرکت کی سعی فرمائیں گے۔ اس وقت ہمیں ایک بڑی کمی محسوس ہو رہی ہے جلسہ کی غرض و غایت تقسیم انعام اور طلبہ کی حوصلہ افزائی ہے۔ اور جس شعبہ کے طلبہ کو یہ انعام دیا جاتا ہے اس شعبہ کے صدر حضرت مولاناؒ ہیں۔

مہمانوں کا شکریہ...... جلسہ کے واجبات کے متعلق چند ضروری باتیں بھی مجھے عرض کرنا ہیں۔ دارالعلوم کی جانب سے باہر سے تشریف لانے والے مہمانوں کا شکر گزار ہوں کہ اس سخت اور تکلیف دہ گرمی کے موسم میں انہوں نے شرکت کے لئے زحمت گوارہ فرمائی۔ بالخصوص دہلی سے آنے والے حضرات کاروباری لوگ ہیں۔ وہ اپنے کاروبار کو چھوڑ کر ہماری طلب پر تشریف لائے ہیں۔ اس لئے یہ حضرات ہمارے شکریہ کے بہت زیادہ مستحق ہیں۔ ان حضرات کا یہاں آنا کسی مالی غرض کی بناء پر نہیں ہے بلکہ در حقیقت اس کا سبب وہ محبت ہے جو انہیں دارالعلوم سے ہے۔

امسال جلسہ کے انعقاد میں کچھ موانع تھے اور خیال تھا کہ جلسہ نہ ہو سکے گا مگر ابھی چند دن ہوئے کہ یہ ارادہ ہوا۔ اس لئے بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ وقت بہت کم ہے اس لئے دعوت مختصر دی جائے۔ مجھے آپ

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۲۲۔

حضرات سے دارالعلوم کا تعارف کرانا نہیں ہے اور آج دارالعلوم کسی تعارف کا محتاج ہے۔

تاسیسِ دارالعلوم کا امتیاز ..... مگر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس دوسرے اداروں سے بالکل مختلف ہے۔ جو ادارہ قائم ہوتا ہے اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ چند اہل الرائے ایک جگہ جمع ہو کر باہمی مشورہ سے سوچ کر ایک چیز طے کرتے ہیں۔ مگر دارالعلوم کی تاسیس اس سے مختلف ہے۔ دارالعلوم الہام غیب اور اہل اللہ کے قلوب پر انکشاف واردات کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے تواتر کے ساتھ سنا ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر اہل اللہ اور بزرگ تھے ان سب کے قلوب پر یہ منکشف ہوا۔ غرض یہ کہ اس طور پر ان حضرات میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے انکشاف اور منجانب اللہ الہام کا اظہار فرمایا۔ اس طرح پر یہ ادارہ قائم ہوا ہے۔ دارالعلوم کی بنا الہامی طور پر ہے رسمی اور حسی طور پر نہیں ہے۔ دارالعلوم کے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ تھے جو اگرچہ امی محض تھے مگر نہایت باکمال اور صاحب حال بزرگ تھے۔ دارالعلوم کے لئے جب بنیادیں کھودی گئیں تو وہ احاطہ جو اس کے لئے مخصوص کیا گیا تھا بہت مختصر تھا۔ رات کو حضرت مولانا خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے۔ یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ کا طویل وعریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔ مولانا نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے۔ بلا کسی مشورہ کے ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر کا کام شروع کرا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جس ادارہ کی بنیاد الہامات پر قائم ہوا اس کی کیفیت یقیناً دوسرے اداروں سے مختلف ہوگی۔

طلباءِ کرام کا امتیاز ..... یہاں سے جو طلباء فارغ ہو کر جاتے ہیں ان کا تعین بھی منجانب اللہ ہوتا ہے اور جو طلباء یہاں پڑھتے ہیں وہ بھی منجانب اللہ منتخب ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک طالب علم مطبخ سے کھانا لیکر آیا اور شوربہ کا پیالہ مولانا کے سامنے دندھا کر کے کہنے لگا کہ "یہ شوربا کھانے کے لئے ہے یا وضو کے لئے؟" اس طرح تند و تیز باتیں کر کے چلا گیا۔ مولاناؒ نے دریافت فرمایا یہ کون تھا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں طالب علم ہے۔ مولاناؒ نے وثوق کے لہجے میں فرمایا کہ یہ طالب علم نہیں ہے اور نہ یہ طالب علم ہو سکتا ہے چنانچہ تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ اس شخص نے فرضی طالب علم ظاہر کر کے دھوکہ سے کسی طرح مطبخ کے رجسٹر میں اپنا نام لکھوا لیا ہے اور فی الحقیقت طالب علم نہیں ہے۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ نے وثوق کے ساتھ کس طرح اس کے طالب علم ہونے سے انکار کیا تھا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ یہاں جس قدر طالب علم پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان سب کی شکلیں مجھے دکھلا دی گئی ہیں۔ چنانچہ جب میں نے اس شخص کو بغور دیکھا تو دکھلائی ہوئی شکلوں میں اس صورت کا کوئی شخص نہیں تھا۔ اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ہرگز طالب علم نہیں ہے۔

حصولِ علم کا امتیاز ..... احاطہ مولسری میں جو کنواں ہے اس کے متعلق مولاناؒ نے خواب میں دیکھا کہ کنواں

دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیالہ سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ بعض کے پاس چھوٹے برتن ہیں اور بعض کے پاس بڑے بڑے برتن ہیں۔ ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کر لے جاتا ہے۔ مولاناؒ نے برتنوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی تعبیر یہ فرمائی کہ اس سے ہر شخص کا ظرف علم مراد ہے۔ جس شخص کا جس قدر ظرف ہے اس مقدار میں علم اس کے نصیب وحصہ میں آئے گا۔

دارالعلوم کے انتظام وانصرام کا امتیاز...... اس ادارہ کے اصول وفروع بھی الہامی طور پر واقع ہوئے ہیں۔ مجھے اپنے ۲۵۔۲۶ سال کے زمانہ اہتمام کا تجربہ ہے۔ اس دوران یہ چیز نہایت شدت سے محسوس ہوتی رہی ہے کہ کوئی غیبی طاقت ہے جو اس ادارہ کو چلا رہی ہے اور اس کا دارومدار ظاہری جدوجہد سے بالاتر کوئی باطنی قوت ہے جو اس کو تھامے ہوئے ہے، ہمارے اندر بہت سی خامیاں ہیں مگر اکابر کا فیض ہے کہ کام برابر چل رہا ہے ورنہ آج کے دور میں علوم دینیہ کا ذوق رکھنا ایسا ہی ہے جیسے پہلے زمانہ میں ملاسیہ فرقہ تھا۔ اسی طرح آج جس کو ملامت سننی ہو وہ مولوی ہو جائے۔ عدم اعتناء دین کے اس دور میں جب کہ علوم دینیہ سے شدید بعد پیدا ہو چکا ہے۔ اس دارالعلوم کا قائم رہنا اور ترقی کرتے رہنا یہ اس کی علامت ہے کہ یہ منجانب اللہ قائم ہے۔ چنانچہ جب کبھی مخالفین کی جانب سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اس سال نسبتاً زیادہ آیا اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دورِ فتن میں دارالعلوم کا قائم رہنا اسباب کے درجہ میں نہیں ہے بلکہ غیبی امداد واعانت ہے جو اس کو چلا رہی ہے۔

غالباً سن ۴۹ ہجری کا واقعہ ہے اور یہ پہلا سال ہے میرے اہتمام کا، مولوی گل محمد خان صاحبؒ جو خزانہ کے تحویلدار اور تقسیم تنخواہ کے ذمہ دار تھے۔ رجب کی آخری تاریخ میں میرے پاس آئے اور بتلایا کہ خزانہ میں ایک پائی نہیں ہے اور کل پرسوں کو ڈھائی ہزار روپیہ تنخواہ کی صورت میں تقسیم کرنا ہے۔ میں نے کہا فکر کی کیا بات ہے جس کا کام ہے وہ خود چلائے گا۔ ان کو رخصت کر کے حضرات مدرسین کو میں نے کوٹھی پر بلا کر دریافت کیا کہ آپ دارالعلوم میں کیوں پڑے ہوئے ہیں اور کیا مقصد ہے؟ آیا دین کی خدمت مقصود ہے یا تنخواہ حاصل کرنا۔

مدرسین کرام کا امتیاز...... سب نے بیک زبان ہو کر جواب دیا کہ ہمارا مقصد اس مقدس امانت کی خدمت ہے جو اکابر نے ہمیں سونپی ہے۔ حاشا وکلا تنخواہ پر کبھی ہماری نظر نہیں رہی۔ میں نے کہا اگر تنخواہ نہ ملے تو آپ کیا کریں گے؟ جواب دیا کہ فاقہ کریں گے اور پڑھائیں گے۔ میں نے کہا الحمد للہ اب آپ مطمئن رہیں۔ دارالعلوم بھی انشاء اللہ چلے گا اور آپ کی تنخواہیں بھی ملتی رہیں گی خزانہ میں اس وقت ایک پیسہ نہیں ہے۔ دعاء کیجئے کہ اکابر کی اس امانت کے باقی رکھنے میں اللہ تعالیٰ ہمیں رسوائی سے بچائے۔ سب نے مل کر خشوع خضوع کے ساتھ دعا کی جس کا اگلے دن یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ ابھی تنخواہ کا وقت نہ آیا کہ حق تعالیٰ نے ڈھائی ہزار روپیہ بھیج دیئے۔ دو ہزار روپے کلکتہ کے ایک تاجر کی طرف سے تھے اور پانچ سو میرٹھ کے مشہور رئیس خان صاحب شیخ رشید خان صاحب آرمی کنٹرکٹر کے جو اتفاقیہ دہرہ دون جاتے ہوئے دیوبند تشریف لائے اور پانچ سو کا عطیہ دے گئے۔ غرض یہ کہ

دارالعلوم کی بناء بھی غیبی امور کے اوپر ہے اور کاموں کا انصرام بھی منجانب اللہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور اس طرح اپنی ترقیات کے ساتھ روز بروز دارالعلوم آگے بڑھ رہا ہے۔ عرصہ سے یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ جلسہ انعام عظیم الشان پیمانہ پر کیا جائے اور ملک کے تمام بہی خواہوں کو دعوت دی جائے اور قدیم طلبہ کو بھی بلایا جائے۔ مگر ملک کے ہنگامی موانع نے ہمیں باز رہنے پر مجبور رکھا۔ بہت ممکن ہے کہ سال آئندہ ہم اس میں کامیاب ہو جائیں۔

روحِ دارالعلوم...... تعلیمی اداروں کی اصل قابلِ اعتناء چیز روح ہے عمارات نہیں ہیں۔ یہاں کی اصل روح تعلیم ہے۔ اگر دارالعلوم تعلیمی مقاصد میں کامیاب ہے تو اس نے اپنے مقصد کو پورا کر دیا اور اس روپیہ کو ٹھکانے لگا دیا جو قوم نے اس کو دیا تھا۔ اس کا اندازہ امتحانات کے نتائج سے ہو سکے گا جو ابھی آپ کے سامنے بیان کئے جانے والے ہیں۔ اس سال دارالعلوم میں تین مزید شعبوں کا اضافہ ہوا ہے۔ ایک شعبہ صنائع کا ہے جو طلبہ کو صنائع سکھلائے گا۔ عام طور پر علماء کا نفقہ قوم پر ہے۔ جو لوگ فی سبیل اللہ کارِ خیر میں محبوس ہیں قوم کا فرض ہے کہ وہ ان کی امداد کرے۔ مگر حالات کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کو ان کی معاش سے مطمئن کر دیا جائے۔ اس شعبہ میں ۷ افراد کام کر رہے ہیں۔ اس کا دوسرا جزء فنِ کتابت ہے۔ اس کی بنیاد سن ۶۴ ہجری میں ڈالدی گئی تھی۔ اس شعبہ میں اس وقت ۴ آدمی کتابت کا فن سکھلا رہے ہیں۔

دوسرا شعبہ ورزش کا ہے روحانی غذا کے ساتھ جسمانی غذا کے لئے شعبہ ورزش کھولا گیا اس شعبہ میں دو استاد کام کر رہے ہیں۔ آج صبح اس شعبہ کے معائنہ میں دہلی کے حاجی محمد یوسف صاحب نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے تیس روپے بطور انعام کے طلبہ کو دیئے ہیں۔

تیسرا شعبہ جمعیت الطلبہ کا ہے۔ یہ سلسلہ تو بہت قدیم ہے مگر اس سال اس کو باضابطہ بنا دیا گیا ہے۔ سال آئندہ اس کی کارگذاری تفصیل کے ساتھ معائنہ کرائی جا سکے گی۔ اس کے چار شعبے ہیں۔ (1) عربی تحریر (2) اردو تحریر (3) عربی تقریر (4) اردو تقریر

طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے اب انعام تقسیم کیا جائے گا۔ تا کہ کامیاب طلبہ میں شوق اور ترغیب پیدا ہو اور جو لوگ ناکام رہے وہ شرمندہ اور خجل ہو کر آئندہ محنت سے تعلیمی امور میں منہمک ہوں۔ اگرچہ یہ سلسلہ نہایت غیر دلچسپ اور خشک ہے مگر اصل میں یہی تعلیم کے نتائج کا نچوڑ اور معیار ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ پوری توجہ سے اسے ملاحظہ فرمائیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

آزادیِ ہند کا خاموش راہنما

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ !

آزادی کی خوشی کی تکمیل...... آج ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء ہے جو ہندوستان کا یوم آزادی ہے۔ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشیاں منا رہا ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ آزادی سے بڑھ کر خوشی منانے کی اور کوئی چیز ہو بھی نہیں سکتی، جبکہ آزادی ہی ہر خوشی کا سرچشمہ ہے لیکن یہ آزادی ہمیں اچانک نہیں مل گئی۔ اور آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی، بلکہ کتنے ہی صبر آزما دنوں مہینوں اور سالوں، کتنے ہی دار ورسن کے ہنگاموں اور قید و بند کے ہیبت ناک کٹہروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر گزر کر یہ آزادی کی دولت ہم تک پہنچی ہے۔ گو آج کی تاریخ میں آزادی کا پارسل سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہنچا، کتنے طوفانوں میں سے نکلا اور کتنی خطرناک خلیجیں اس کی راہ میں حائل ہوئیں جن کا آہنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا۔ ایسے اہم سوالات ہیں جن سے ہماری تاریخ وابستہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے آزادی کی خوشی کے ساتھ اگر ان غموں کی اور غم سہنے والی عظیم المرتبت شخصیتوں کی داستان سامنے نہ لائی جائے جو آزادی کے اولین علم بردار تھے تو نہ آزادی کی خوشی ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ اور نہ یوم آزادی کوئی روشن دن ہی بن سکتا ہے کیونکہ ہماری خوشی کی تعمیر ان ہی کے غموں اور غم خواریوں کی اساس پر کھڑی ہوئی ہے۔ اگر وہ قید و بند اور دار ورسن کا غم نہ کھاتے تو یہ آزادی کی خوشبو ہمارے دماغ تک نہ پہنچتی۔ اس لئے ہماری خوشی ان کی آزادی خواہانہ دھنوں کا تذکرہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

آزادی کا ہیرو...... ایسی بلند پایہ شخصیتیں کافی تعداد رکھتی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے موقعہ پر سرفروشی کے جوہر دکھلائے اور ایثار و قربانی سے گو اپنے کو ختم کر لیا۔ مگر آنے والی نسلوں کے لئے آزادی کی خوشیاں منانے کی فضائیں ہموار کر گئے۔ ان میں متعدد شخصیتیں آزادی کے ہیرو کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے تذکروں سے تاریخ کا دامن بھرپور ہے۔ میں اس موقعہ پر اس نامور اور عظیم القدر شخصیت اور اس کی اُصولی شاہراہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف ذاتی طور پر حصہ ہی لیا اور نہ صرف ایک ہیرو بلکہ امیر لشکر و سپہ سالار فوج

کی حیثیت سے شاملی کے میدان جنگ میں پیش قدمی کی کہ اس میں اور شخصیتیں بھی پیچھے نظر نہیں آتیں بلکہ جنگ کی فتح وشکست کو آنکھوں میں رکھ کر آزادی پسندی اور آزادی خواہی کی ایک ایسی اصولی شاہراہ ڈال دی جس سے جماعتیں آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ زبان وقلم اور آزادیٔ ملک وملت کے جذبات کی اساس راہ پر پڑ گئیں اور جو فتح شاملی کا میدان کارزار تیغ وسناں سے نہیں پاسکا تھا' وہ ان اصولوں کے ہتھیاروں سے قلم وزبان کے میدان میں نظر آگئی اور نظر بازوں سے ہمکنار ہوگئی۔

میری مراد اس سے حضرت اقدس حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ بانی دارالعلوم دیوبند کی ذات گرامی ہے۔ جو اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ کے دل ودماغ کے علماً وعملاً امداد الٰہی لسان کی حیثیت سے اولاً شاملی کے ۵۷ء کے میدان میں سامنے آئے اور اس ہنگامہ رست وخیز کے خاتمہ پر انہوں نے علم کی رہنمائیوں کے لئے دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی۔

شاملی کے میدان کی تلافی..... گویا شاملی کا میدان اور دارالعلوم کی زمین ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے۔ فرق تیغ وسناں اور قلم وزبان کا تھا۔ وہاں تشدد کے ساتھ آزادیٔ ملک وملت اور آزادیٔ مذہب ودین کا نصب العین سامنے تھا۔ اور یہاں عدم تشدد کے ساتھ علمی اخلاقی اور آئینی رنگ میں وہی منصوبہ پیش نظر تھا وہاں اس نصب العین کے لئے افراد استعمال کئے جارہے تھے۔ اور یہاں اس کے افراد بنائے جانے لگے۔ وہاں نام میدان جنگ کا تھا اور یہاں نام مدرسہ، مکتب امن وصلح کا تھا۔ وہاں قلب ودماغ کے اشاروں پر ہاتھ پیر کام کررہے تھے اور یہاں براہ راست دل ودماغ نے خود اپنے تصرفات دکھلائے۔ غرض حضرت والا نے میدان شاملی کے نتائج پیش نظر رکھ کر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی اور اس کے اصول اور نظام کار کو ایسے انداز میں اٹھایا کہ شاملی کے میدان کی تلافی ہو اور جو منصوبہ اس وقت کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکا تھا وہ اب ہوجائے۔

سیاسی محکومیت کے ازالہ کی واحد تدبیر..... حضرت والا نے دارالعلوم دیوبند بلکہ ۵۷ کے بعد تمام دینی مدارس کے لئے آٹھ اصول کا ایک دستور اساسی مرتب فرمایا۔ جو دارالعلوم کی معنوی تاسیس تھی۔ اس کی ہشت گانہ دفعات میں اپنے ذہن کا وہ جمہوری نظام جس کو آپ وقت کی پکار سمجھ رہے تھے۔ جو ایک طرف اگر علاقہ کے خواص پر مشتمل تھا تو دوسری طرف اس کی روح رابطہ عوام سے تھی، ذہن سے نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔ حضرت والا ان اصول کے راستہ سے قوم کو حکومت وقت اور امراءِ عصر سے بے نیاز کر کے حق خود ارادیت اور حق خود اختیاری کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے، کیونکہ جو قوم خود اپنی قدرت سے قادر نہ ہو وہ ہمیشہ دوسروں کے رحم وکرم پر جیتی ہے۔ اور وہ جینا زندگی نہیں، موت بصورت حیات ہے۔

حضرت نے ۱۸۵۷ء کے بعد بھانپ لیا تھا کہ اگر قوم میں ملک وسیاست کے ساتھ علم واخلاق اور ذہن وفکر میں بھی حق خود ارادیت باقی نہ رہا' تو اس قوم کی بنیاد ہی منہدم ہوجائے گی۔ اور وہ کبھی بھی اجتماعی طور پر خود اختیار

بنا کر نہ ابھر سکے گی۔ اس لئے حضرت والا کے نزدیک قوم کی سیاسی محکومی اور اجتماعی غلامی کے ازالہ کی واحد تدبیر ہی یہ تھی اور واقعۃً یہی تھی کہ قوم کو علم و دین کے راستے سے اجتماعیت کی لائنوں پر ڈال دیا جائے۔ اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ تعلیم و تربیت کے نظام کو شخصیاتی لائن کے بجائے جماعتی اصول پر قائم کیا جائے تاکہ ایک طرف تو عوام کی قوت اس کے ساتھ ہو جائے۔ اور دوسری طرف اس تعلیم اور نظامِ تعلیم کے پروردوں میں دینی حدود کے ساتھ جمہوری تنظیم کا مذاق پیدا ہو جائے۔

حضرت والا دل کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کہ زمانہ عوام کو ابھارنے والا ہے۔ حکمرانی کی قوتیں عوام کی طرف منتقل ہونے والی ہیں۔ اگر یہ صورتِ حال خود رو طریق پر ہوئی تو اس عوامیت میں لادینی کے جراثیم کارفرما ہو جائیں گے جس سے اس دین شعار قوم کی حقیقی بنیادیں ہی ختم ہو جائیں گی۔ اور اس کا قومی وجود ہی سرے سے باقی نہ رہے گا۔ اس لئے آپ نے اس ادارہ میں تعلیم تو خالص دین کی جاری فرمائی۔ اور نظامِ تعلیم یعنی نظم ادارہ کے اصول اجتماعی اور جمہوری رنگ کے رکھے، تاکہ دین اور نظم دونوں کے مجموعہ سے قوم میں دینی خود اختیاری قوت پیدا ہو جائے کہ اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْاَمَانِ (ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں) ایک سے دوسرا جدا نہیں ہو سکتا۔

جہادِ شاملی کے رُخ کی تبدیلی ...... حضرت والا کے ان اصولِ ہشت گانہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصول لکھتے وقت آپ گویا شاملی کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ قوم کی ہزیمت و شکست کا منظر آپ کے سامنے ہے۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومتِ متسلطہ شکست خوردہ قوم کے حقوقِ آزادی کو کچل رہی ہے۔ اور اس کے بنیادی تشخص اور حق خود ارادیت کو ساتھ ہی اس کے مذہب اور قومی بنیادوں کو جن پر اس کی قومی شخصیت کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی جن کا سلسلہ ۱۸۵۷ء سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔

حضرت والا نے ۵۷ء کی شکست کے بعد محسوس کیا کہ اب تلوار سے مقابلے کا وقت نہیں ہے۔ تو آپ لوہے کی تلوار میان میں کر لیتے ہیں۔ اور تعلیمی لائن کے ہتھیار میان سے نکال کر میدانِ مقابلہ میں آ جاتے ہیں، گویا شاملی کا جہاد ابھی ختم نہیں ہوا صرف رخ بدلا ہے۔ اور ہتھیاروں کی نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔ اس ٹھنڈے مقابلہ کا پہلا قدم قوم کی سنبھال اور رکھوالی تھی، جبکہ اسے ناتربیتی اور لاتعلیمی ہی کی وجہ سے شکست اور ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس لئے اس جدید اقدام میں تعلیم و تربیت کے راستے سے قدیم ناتربیتی اور لاتعلیمی کے اثرات زائل کرنے تھے، احساسِ کمتری کو دلوں سے دور رکھنا تھا تاکہ حوصلوں میں فرق نہ آ جائے۔

آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ ...... دوسرا قدم دین کی اخلاقی تربیت پاکیزگیٔ نفس اور جذباتِ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سے قوم کی تعمیر تھی تاکہ آزادیٔ ضمیر کی روح اس میں مستحکم ہو جائے۔ تیسرا قدم علم و عمل اور اخلاق کے ان سانچوں میں حریتِ نفس اور آزادیٔ ملک و ملت کے ایسے جذبات کا رنگ بھرنا تھا جن میں فکر و بصیرت کے ساتھ اخلاص و ایثار اور قوم پروری کی روح دوڑ رہی ہو۔

دارالعلوم کے یہ بنیادی اصول اجتماعی روح کے ساتھ حضرت نے اس وقت وضع فرمائے، جبکہ تسلط و اقتدار کے زیر اثر سربرآوردگانِ ملک عوام کے جذبات سے الگ ہو کر حاکم متسلط کی گود میں اپنے کو ڈال رہے تھے "حریت کاری" کے بجائے "وفاداری" کا خمار خود سروں کے سروں میں بھر چکا تھا۔ اور قومی رشتے حکومتی رشتوں پر بھینٹ چڑھائے جا رہے تھے۔ حضرت نے اس وقت ان آٹھ اصولوں کے راستے سے استغنائی رنگ میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی۔ اور اس علمی تنظیم سے خواص کے ذریعہ عوام کو ابھارنے اور مضبوط بنانے کی پرواز ڈالا۔ اور ملک کے اونچے طبقے سے ہٹ کر جو حکومت کی گود کی طرف بڑھ رہا تھا ایک آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ ان اصول کے راستہ سے کر لیا۔ ان اصول اور ان کے بنائے ہوئے علمی اداروں یعنی دارالعلوم دیوبند اور اس کی فروعات سے ملک کی علمی اور دینی خدمات کیا ہوئیں؟ اور ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے ایک ایک کونے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں علم اور اخلاق اور قال اللہ وقال الرسول کی روشنی کس حد تک پہنچی اور پھیلی؟ اس تحریر میں میرا موضوع بحث نہیں۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ اس کے علاوہ اجتماعی رجحانات اور ان کے عملی نتائج کس حد تک ظاہر ہوئے؟

خاموش راہنمائی کے آٹھ اُصول.... سوان کا اجمالی خاکہ سامنے لانے کے لئے پہلے ان اُصول ہشت گانہ کا متن پڑھئے اور پھر ان کے پیدا کردہ ذوق اور ذوق سے پیدا شدہ عملی آثار کو دیکھئے! اُصول کا متن جو حضرت والا کے قلم کا لکھا ہوا خزانہ دارالعلوم میں محفوظ ہے۔ حسب ذیل عنوان سے شروع ہوتا ہے: وہ اُصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس عنوان کے نیچے حسب ذیل آٹھ اُصول قلم بند فرمائے گئے ہیں۔

1 ......اصل اوّل یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

2 ......ابقاءِ طعام طلبہ بلکہ افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی تر رہیں۔

3 ......مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا پر تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کی پس پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے۔ سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہماری مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے۔ اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امورِ مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں۔ یا کوئی وارد صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔ اور اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش

نہ ہو کہ مجھ کو کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

4 ...... یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں۔ اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

5 ...... خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے۔ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

6 ...... اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع إلی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

7 ...... سرکار کی شرکت اور اُمرا کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

8 ...... تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے۔ جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

جمہور کا ادارہ اور عوام سے رابطہ...... ان اصول ہشت گانہ کی رو سے حضرت والا نے: 1 سب سے پہلے اس ادارہ کو عوامی اور جمہوری قرار دیا اور اس کی کفالت کا بار عوامی چندوں پر رکھا تا کہ یہ ادارہ سرکاری یا کسی مخصوص پارٹی کا کہلانے کی بجائے جمہوری اور عوامی کہلائے۔ پھر اس کی ضروریات کی اپیل بھی براہ راست عوام ہی سے رکھی۔ جس کا سلسلہ واسطہ بلا واسطہ قائم رکھنے کی ہدایت فرمائی تا کہ کسی وقت بھی ادارہ عوام اور جمہور سے مستغنی نہ ہو اور عوام کی توجہ کسی آن ادارہ سے ہٹنے نہ پائے۔ ساتھ ہی تکثیر چندہ کی مساعی جاری رکھنے کی بھی تلقین فرمائی، جس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تا کہ جس رفتار سے چندہ بڑھے اسی رفتار سے ادارہ کا حلقہ اثر بھی وسیع ہوتا چلا جائے اور زیادہ سے زیادہ عوام کا رابطہ اس سے قائم ہوتا رہے۔

چنانچہ اسی اصول کی روشنی میں اس ادارہ کی مجلس شوریٰ کو (جو اس نظم و نسق کی ذمہ دار ہے) وکیل اہل چندہ اور مالیات میں نمائندہ عوام قرار دیا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ عوام نہ صرف چندہ بلکہ بواسطہ مجلس شوریٰ اس کے مالی مصارف کے نگران اور مجوز بھی ہیں اور اول سے آخر تک ادارہ میں انہی کا عمل دخل ہے۔

آج کی دنیا میں سیاسی انقلاب لانے والی یا حکومت چلانے والی جماعتوں کا بنیادی اصول کیا اس سے مختلف ہے؟ ان کے یہاں آج کے جمہوری دور میں انقلاب لانے کا بنیادی اصول رابطہ عوام کے سوا اور کیا ہے؟ اور اس رابطہ کی صورت آخر اس کے سوا کیا باقی ہے کہ عوام کو مرکز سے وابستہ کر کے ان کی قوت سے کام لیا جائے۔ اور انہی کے حصہ رسد سرمایہ سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو اس نے بھی عوام کو ممبر بنا کر رکنیت کی فیس رکھ

دی کانگریس کیٹی رونما ہوئی تو اس نے بھی عوام کی ۴ ۱۰۰ ممبری سے کام چلایا۔ دوسری سیاسی پارٹیاں ابھریں تو انہوں نے بھی عوامی ممبر سازی اور رکنیت کی فیس رکھ کر ہی عوام سے رابطہ قائم کیا جس سے انقلابی کام آگے بڑھا۔

حضرت والا نے آج سے سو برس پہلے جب کہ رابطۂ عوام کا سسٹم عام نگاہوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ عوام کا ادارہ قائم کر کے عوام کو فیس رکنیت کے عنوان کی بجائے عوامی چندہ کے نام پر ادارہ سے وابستہ کیا۔ کیا اسی طریق کار کو بعد کے بصروں نے مدارس کے بجائے انجمنوں اور کمیٹیوں کی صورت سے نہیں اپنایا، فرق یہ رہا کہ سیاسی انجمنوں کا مقصد کوری سیاست تھی۔ اور اس ادارہ کا مقصد سیاست اور دیانت کا مرکب نصب العین تھا۔ سیاسی کمیٹیوں نے سیاسی عنوان سے کام کیا اور اس ادارہ نے اپنی سیاست کو تعلیمی لائنوں سے آگے بڑھایا۔ جس میں آزادیٔ وطن کے ساتھ آزادیٔ مذہب وملت کی روح بھی قائم کردی۔

بہرحال اس اولین اصول کی روح اس عوامی چندہ کی جدوجہد سے ملک کے عوام اور غرباء سے زیادہ سے زیادہ رابطہ کرنا تھا۔ تاکہ ادھر تو عوام اس ادارہ کو اپنی چیز سمجھیں اور ادھر اس علمی ادارہ سے وابستگی کے راستہ سے ان میں علمی شعور پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ جب ہر قوم میں اکثریت عوام اور غرباء ہی کی ہوتی ہے اور وہی قوم کی قوت اور ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ہر اجتماعی کام کا مدار اس رائے عامہ پر ہوتا ہے۔ اس لئے اصول مذکور کی رو سے عوام یا رائے عامہ کو پشت پر لے کر در حقیقت آزادیٔ ملک وملت کی ایک بنیادی قسط حاصل کر لی گئی۔ اور یہ اجتماعیت کی لائن کا پہلا قدم تھا جو اس ادارہ نے جنم لیتے ہی اٹھایا۔

سرکاری امداد کا بدل...... **2** اسی کے ساتھ دوسرے اُصول میں قوم کے غریب بچوں یعنی طلبہ کی امداد طعام وغیرہ اور اس کی افزائش وتکثیر ضروری قرار دی تاکہ ان کی دلجمعی اور وابستگی کے واسطہ سے قوم اور ملک کی اس ادارہ سے وابستگی روز بروز بڑھتی رہے گویا پہلا اُصول اگر رابطۂ عوام کا رکھنا مقرر کیا جو پچاس برس بعد کے انقلاب اور جمہوری حکمرانیوں کی اساس بننے والا تھا۔ تو دوسرے اُصول میں عوام کو خود بھی ادارہ کی طرف بڑھنے کا موقع دیا۔ تاکہ اس دوطرفہ رابطہ سے اتحاد باہمی کی بنیادیں مضبوط تر ہوتی رہیں۔

گو اس دور کے سرکاری لائنوں کے افراد کی طرف اس عوامی چندہ کی تحصیل ووصول اور غریب طلبہ کی امداد کو بھیک مانگنے اور بھک منگے تیار کرنے سے تعبیر کیا گیا، کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے لئے چندہ کے ادارہ کا قیام ایک نئی چیز تھی۔ اور سب سے پہلا چندہ کا مدرسہ دارالعلوم ہی تھا جو ۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ۶۷ء میں قائم ہوا۔ لیکن حضرت والا اپنے نورِ فراست سے محسوس کر چکے تھے کہ سرکاری ایڈ کے ساتھ قومی روح کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اور اس سرکاری امداد کا بدل بجز قومی چندہ کے دوسرا فاصلہ نہیں اس لئے ان مطاعن کی پرواہ کئے بغیر آپ نے انگریزی سرکار کے علی الرغم ادارہ کو اس لائن سے آگے بڑھایا مگر زمانہ کی رفتار نے بہت جلد اس رابطۂ عوام کی ضرورت واہمیت سمجھا دی۔ اور بھیک مانگنے اور بھک منگے بنانے کا سسٹم بلا تفریق ہر قوم پرور کو اختیار کرنا پڑا۔ اس لئے

کہا جاسکتا ہے کہ اس بارہ میں دار العلوم نے ملک کی قیادت کی اور قومی اداروں کے قیام کی لائن سے حریت طلبی کا یہ اولین اصول عملی طور پر دنیا کے سامنے لا رکھا۔

تالیفِ خواص...... ۳ رابطۂ عوام کے ساتھ اجتماعی لائنوں میں علاقہ خواص بھی ناگزیر تھا۔ تو حضرت والا نے تیسرا اصول تالیفِ خواص کا رکھا۔ جس کی رو سے اس ادارہ کو شخصیاتی یا انفرادی رکھنے کی بجائے شورائی قرار دیا۔ تا کہ اس کے کام شخصی ہونے کے بجائے جماعتی رنگ سے انجام پائیں، کیونکہ شخصیتوں پر مبنی کام شخصیتوں کے اٹھ جانے سے ختم ہو جاتے ہیں لیکن جماعتی کام افراد کے اٹھتے رہنے کے باوجود بقا پذیر رہتا ہے۔ساتھ ہی ان مخصوص افراد کے رد و قبول کا معیار بھی کھول دیا کہ شورائی ارکان مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ صداقت وایثار لئے ہوئے ہوں۔ اجتماعیت کا مذاق رکھتے ہوں۔ بات کی پچ اور سخن پروری کی خو نہ ہو کہ اگر کسی کی شخصی رائے نہ چلے تو اس میں واک آوٹ کا جذبہ ابھر آئے بلکہ حق پسندی کا جذبہ رکھتے ہوں، کہ اپنی رائے کے اظہار میں بھی حق نظر آئے تو گردن جھکا دیں۔

پس آزادی ضمیر تو ایسی ہو کہ اپنی سچی رائے کے اظہار میں جھجک محسوس نہ کریں۔ اور حق پسندی یہ ہو کہ دوسرے کی رائے سمجھ میں آجانے کے بعد مان لینے میں تامل تک نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس آزادی ضمیر کے ساتھ آزادانہ دستوری فرائض ادا کرنے والوں سے آزاد فضا پیدا ہو سکتی ہے اور ایسی آزاد فضا میں تعلیم بھی ہوگی تو آزاد نظم ونسق بھی ہوگا تو آزاد۔ اور اس سے تربیت پا کر نکلنے والے بھی ہوں گے تو آزاد ضمیر، جو آزادی کا ماحول پیدا کر دینے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں گے۔

پس اس اصول سے حضرت والا نے ذہنی آزادی کی بنیاد ڈال دی، جو خارجی آزادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اس طرح گویا آزادی کی ایک اور قسط حاصل ہوگئی۔ پھر اس تالیفِ خواص کا دائرہ بھی محدود یا تنگ نہیں رکھا بلکہ رائے اور مشورہ کا دروازہ ہر وارد وصادر، ہر ذی عقل اور فہیم آدمی کے لئے کھلا رکھا جو اس قسم کے تعلیمی اداروں اور ان کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہو۔ گویا علاقہ خواص میں رابطۂ عوام کو فکری حد تک بھی نہیں چھوڑا گیا، تا کہ ادارہ چند مخصوص اہل الرائے کی آراء میں محدود ہو کر ملک کے عام ذی رائے اور زیرک طبقہ کی فکری اعانتوں سے محروم اور منقطع نہ ہو جائے جو انجام کار کاموں کے نقصان اور جماعتی نظم میں ضعف واختلال کا سبب ہوتا ہے۔ اور بالآخر نظم میں محدودیت واستبداد پیدا ہو کر جماعتی تعصب اور گروہ بندی کے جراثیم رونما ہو جاتے ہیں جو آزادی کے حق میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ پس اس اصول سے راہِ آزادی کا ایک بھاری پتھر ہٹا دیا گیا جو صوفی آزادی کی ایک اہم قسط ہے۔

اتحادِ مشرب...... ۴ مرکز میں مربیوں کا کارکنوں کا اتحادِ مشرب لازمی قرار دیا تا کہ اتحادِ خیال سے جماعت کا نظم متحد اور مستحکم رہے ورنہ بصورت اختلاف مشرب تقابل باہمی پھر اس سے خود بینی وخود ستائی اور اس سے دوسروں کی توہین وآزار رسانی کے جراثیم ابھر کر جماعتی نظم اور داخلی دلجمعی اور جماؤ کو تہ وبالا کر دیتے ہیں، انتظامات کی پارٹی فلینگ شروع ہو جاتی ہے جو انجام کار غلامی کی جڑوں کو زیادہ مستحکم کر دیتی ہے جو ایک آزادی پسند اور

حریت طلب جماعت کے لئے سم قاتل ہے۔ اس لئے حضرت والا نے اس غلامی شکن اصول سے آزادی کا ایک اور مانع مرتفع فرما دیا یا جماعتی آزادی کے پروگرام کی ایک اور اہم قسط حاصل کر لی۔ جس سے آزادی کی منزل قریب اور یقینی ہو جاتی ہے۔

ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد...... 5 تجویز نصاب، مقدار خواندگی اور انداز تعلیم کو اس اصول کی رو سے نہ تو شخصی محض رکھا جس میں وسعت نہ ہو اور نہ عامۃ الناس کے عامیانہ آراء و قیاسیات کے تابع کیا جو عقلی تقاضوں اور مقتضیات وقت سے معرّیٰ ہو۔ بلکہ مشورۂ خاص اور انہی اہل علم اور اہل تجربہ کی رائے پر مبنی رکھا جو شکل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے آزار نہ ہوں تا کہ تعلیم آزاد بھی رہے اور اس میں عامۂ مسلمین کے حالات اور وقت کے تقاضوں کی رعایت بھی ملحوظ نظر رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی آزاد مگر مطابق حالات مقتضیات تعلیم سے دل و دماغ بھی آزاد مگر پابند حدود ہی پیدا ہو سکتے تھے جو اور ایسے ہی معتدل افراد سے ایک ایسے درمیانی قسم کے انقلاب کی توقع باندھی جا سکتی تھی ملک کی ساری قوموں کے لئے قابلِ قبول اور اپنے اپنے دائرہ میں نفع بخش ہو۔ جو نہ بے قید قسم کے انسانوں سے ممکن تھا، نہ غلامی پسند اور محدود الخیال افراد سے متوقع تھا۔

پس اس پانچویں اصول سے عمومی آزادی اور ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد پیدا کر دی گئی جس سے آزادی کی منزل قریب سے قریب تر لائی گئی۔ یہ اس سے کچھ مختلف نہیں ہے کہ ہر انقلاب پسند ادارہ اپنے مطلوبہ رنگ کے انقلاب کے مطابق ہی کانسٹی ٹیوشن بنا کر افراد تیار کرتا ہے۔ تنگ دل طبقہ تنگ دلانہ لٹریچر دماغوں میں ٹھونستا ہے۔ اور متعصب آمیز کورس سے دل و دماغ کو تنگ نظر بناتا ہے۔ انجام کار جو طبقہ بھی انقلاب میں غالب آ جاتا ہے، انقلاب و تعمیر میں تعصب و تنگ دلی کے مظاہرے ہونے لگتے ہیں اور فرقہ پرستی کے۔ اس لئے حضرت والاؒ نے نصاب کو کوری آزادی و بے باکی اور خالص بستگی و غلامی دونوں ذہنیتوں سے الگ رکھ کر درمیان میں رکھا جو دل و دماغ میں ہر طبقہ کے لئے گنجائش اور وسعت پیدا کر سکے کہ اسی سے درمیانی قسم کا انقلاب پیدا ہو سکتا تھا۔

روحانیت و اخلاق کے ذریعہ سے آزادی کی منزل...... 6 عطیات اور چندوں کے سلسلہ میں اُمراء پر نظر اور ان کے وعدوں یا جاگیروں یا کارخانہ ہائے تجارت وغیرہ کے مستقل ذرائع آمدنی پر بھروسہ رکھنے سے اس چھٹے اصول میں کافی طور پر ڈرایا گیا ہے، تا کہ مرعوبیت اور اسیری دل و دماغ کے جراثیم پرورش نہ پاسکیں اور اداروں یا خود غرض سرمایہ داروں کی نفسانی اغراض کی آمیزش سے پاک رہے، جو ذہنی ہی نہیں خارجی آزادی کے حق میں بھی زبردست رکاوٹ ہیں۔

کیا آج کے دور میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے ختم کرنے کے دعووں سے فضاء عالم گونج نہیں رہی ہے؟ اور کیا ہر انقلابی پارٹی سرمایہ داروں کو راہ سے ہٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی نہیں ہے جب کہ وہ دیکھتی ہے کہ مطلوبہ انقلاب میں یہی سرمایہ دار طبقہ اپنے سرمایہ اور عیش پسندانہ وسائل کی حفاظت کی خاطر انقلاب میں حارج

ہوتی ہے۔ حضرت والاؒ نے اسے اس وقت محسوس کیا جب مزدور اور سرمایہ دار کا کوئی رکی سوال دنیا میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر پیدا ہونے والا تھا۔ حضرت والاؒ اپنے نورِ فراست اور اپنے مذہب کے اصول کی روشنی میں دیکھ رہے تھے کہ انقلاب لانا کبھی سرمایہ داروں کا کام نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ جفاکش مزدور قسم ہی کے لوگ اس میدان میں آگے آئے ہیں اور اب بھی وہی آگے آئیں گے، اس لئے آپ نے اپنے غریب اور متوکل طبقہ کو جس کو اس ادارہ میں تیار کرنا چاہتے تھے سرمایہ دار طبقہ سے بے نیاز بنا کر الگ کر دیا تا کہ ادھر تو یہ غریب طبقہ اس بیماری سے محفوظ اور ادھر وہ روگ زدہ طبقہ بھی کسی حد تک شفا پا جائے، کیونکہ ایک صورت تو اسے بدکا کر اور اس سے رقیبانہ تقابل ڈال کر اسے ختم کرانے کی تھی اور ایک صورت اس سے مستغنی بن کر اسے مفلوج کر دینے کی تھی جس سے وہ خود ہی اپنے روگ کو پہچان کر اسے زائل کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صورت میں کامیابی موہوم اور فساد یقینی تھا۔ اور دوسری صورت میں کامیابی یقینی اور امن واصلاح کے ساتھ نیز پہلی صورت میں شور وشر اور ڈھونگ زیادہ ہے اور عمل کم۔ اور دوسری صورت میں اس کے برعکس کام اور کار برآری زیادہ ہے۔ اور دعووں کا شور کم۔ نیز پہلی صورت میں سرمایہ داروں کو چونکانا اور مقابلہ کی دعوت دینا ہے۔ اور دوسری صورت میں اسے ایک طرف چھوڑ کر خاموشی سے اس کی راہیں مسدود کر دینا ہے۔ حضرت والاؒ نے اس اصول میں دوسری صورت اختیار فرمائی جو امن وسلامتی کے ساتھ سرمایہ داری کا جنازہ سامنے لے آتی ہے کیونکہ اس میں استغنائی رنگ سے سرمایہ داری کے جذبات کی حقارت دل میں اُتاری گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ استغناء سے سرمایہ داری کو مٹانے والا خود سرمایہ دار بننے کی کبھی آرزو نہیں کر سکتا۔ لیکن سرمایہ کی محبت سے سرمایہ داری کو مٹانے کا خواہش مند درحقیقت سرمایہ کا خواہش مند ہے جو اپنے رقیب کو راستہ سے ہٹا کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے جس سے سرمایہ دار تو مٹ سکتا ہے مگر سرمایہ داری نہیں مٹ سکتی، ظاہر ہے کہ جب ملک کی اکثریت (جو غیر سرمایہ دار غرباء ہی کی ہوتی ہے) سرمایہ داری سے بے نیاز ہوگی تو قوم کی اکثریت سے سرمایہ دارانہ جذبات ختم ہو گئے۔ اور غنی کے آگے محتاج خود ہی جھک جاتا ہے۔

اس لئے حضرت والاؒ نے ادارہ کی "مدنی تعمیر اور دوسرے کاموں میں ایک گونہ بے سروسامانی توکل اور استغناء کا اصول رکھ کر ادارہ کو غریبانہ اور متوکلانہ انداز میں چلانا چاہا ہے تا کہ کارکنوں میں تو سرمایہ اور سرمایہ کا غرور پیدا نہ ہونے پائے اور جن کو یہ روگ لگا ہوا ہے وہ ادھر جھک جائیں جس سے ان کے غرور میں کمی آ جائے اور اس طرح یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔ اور ان میں رقابتوں کے جوش سے باہمی نزاعات نہ پیدا ہوں جس سے اولاً ذہنی آزادی اور ضمیر کی حریت ختم ہو جائے۔ اور پھر خارجی آزادی کے امکانات بعید سے بعید ہو جائیں۔ پس حضرت والاؒ نے اس اصول کے ذریعہ حصول آزادی کی ایک اور منزل قریب کر دی۔ مگر مادیت کے راستہ سے نہیں بلکہ روحانیت واخلاق کے راستہ سے۔

سرکاری امداد سے اِحتراز کی حکمت...... 7 ادارہ کے لئے گورنمنٹ کی امداد کو مضر بتلا کر اس سے بچتے رہنے کی ہدایت فرمائی۔ اور اس طرح ادارہ کو سرکار کی مداخلت سے بچا کر تعلیمی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے، جو حقیقی آزادی کی اصلی منزل ہے کیونکہ اقتصادی غلامی ہی بالآخر سیاسی اور انتظامی غلامی پر منتج ہوتی ہے۔ اس لئے اس ساتویں اصول سے اقتصادی آزادی حاصل کی گئی ہے۔

کیا اسی کو ترک موالات نہیں کہتے؟ جس کو سیاسی پارٹیاں مختلف اندازوں سے استعمال کرتی ہیں ۱۹۲۰ء میں بسلسلہ تحریک خلافت اور پھر بسلسلہ تحریک آزادی وطن کھدر پوشی کو رواج دے کر بدیشی کپڑے کا نکاس بند نہیں کیا گیا۔ جس سے مانچسٹر وغیرہ کے کارخانے کافی متاثر ہوئے۔ نیز دیسی صنعتوں کو رواج دے کر بدیشی کپڑے سامانوں کا عملاً بائیکاٹ نہیں کیا گیا؟ اور کیا آج بھی ملکی اور قومی حکومتیں غیر ملکی سامانوں کی درآمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر کے ان کا نکاس نہیں روک رہی ہیں؟ تا کہ خود اپنے ملک کی تجارت وصنعت ترقی پائے اور ملک ہر سامان میں غیر ملکوں کا اقتصادی محتاج وغلام رہنے کے بجائے خود کفیل ہو جائے کہ اس کے بغیر ملک کی اپنی بنیادیں مستحکم نہیں ہوتیں۔ ٹھیک اسی طرح اس اصول کی رو سے اس اجنبی حکومت کی درآمد بند رکھی گئی جو ملک کی آزادی کی پامال کنندہ تھی تا کہ یہ قومی رنگ کے سرمایہ کا دستِ نگر بن کر اقتصادی غلامی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ جس سے وہ ہمیشہ سرکاری مداخلتوں کا نشانہ بنا رہا ہے۔ بہر حال جو مالی عدم تعاون کھدر پوشی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ میں مضمر تھا وہی اس سرکاری ایڈ سے احتراز اور قومی سرمایہ میں محدود رہنے میں مختفی تھا۔ صرف صورت اور مالی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ اس لئے حضرت والا کی دوربین آنکھ سو سال پہلے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو دوسروں کی آنکھوں نے بہت بعد میں دیکھا اور پھر بھی پورا نہیں دیکھا۔

سرمایہ داری پر ضربِ کاری...... 8 اس آٹھویں اُصول میں کارکنانِ اِدارہ کو غریب منش رہنے اور سرمایہ دار بننے سے روکا گیا ہے۔ جیسا کہ چھٹے اُصول میں سرمایہ داری کے خاتمہ کی تدبیر بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ اس دفعہ کا حاصل یہ ہے کہ ادارہ کے سلسلہ میں غرباء کے تعاون اور سوالات کو اصل رکھا جائے اور انہیں کے انداز پر غریبانہ انداز میں کام چلایا جائے کہ ادارہ کے لئے یہی پائیداری اور پختگی کا سامان ہے۔ گویا اس دفعہ کا مفاد تعلیمی لائن سے غیر سرمایہ داروں کی ایک مستقل برادری کا قیام ہے مگر غیر رسمی طور پر بلا انداز تقابل ورقابت جو ظاہر ہے کہ سرمایہ داروں کے مقابلہ میں اقلیت ہی میں رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ان سے بعد اور تنفر کی ہوتی ہے کہ وہ اکثریت کو ضرورت کی حد تک بھی سرمایہ سے محروم کئے رہتے ہیں۔ اس کا ثمرہ یہ نکل سکتا ہے کہ جب اکثریت اپنے کمال قناعت وتوکل سے سرمایہ داروں سے مستغنی ہو جائے تو قدرتہً سرمایہ دار اس کے محتاج ہو جائیں گے اور بشوق ورغبت اپنا سرمایہ ایسے انسانوں اور کاسوں پر نثار کرنے کے آرزومند ہو جائیں گے جس سے سرمایہ داروں کا سرمایہ خود بخود دبا ہوا آ جائے اور غیر سرمایہ داروں کے حقوق قدرتی طور پر وصول ہوتے رہیں۔ اس طرح یہ دفعہ سرمایہ داری کے سر پر ایک ضربِ کاری ہے مگر

"موافقت اور مدارات کے پیرایہ میں جس سے ان دو طبقوں میں منافرت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ آزادی کی راہ کی دراڑ بنے۔ اس لئے اس دفعہ سے بھی اقتصادی آزادی کا ایک اہم مورچہ فتح ہو جاتا ہے۔

تنظیم مدارس آزادی کی حیثیتِ اوّل...... 9 یہ حضرتؒ کے آٹھ حکیمانہ اُصول کی تشریح تھی لیکن غور کیا جائے تو ایک نواں اُصول ان کے عنوان سے نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ تنظیم مدارس کا اصول ہے کیونکہ عنوان بالا میں دارالعلوم اور دوسرے مدارس چندہ کو ان ہی اصول ہشت گانہ کے نیچے جمع کر کے انہیں ایک دوسرے کا شریک ٹھہرایا گیا ہے جو رابطہ مدارس کی ایک معقول اور موثر صورت ہے اور ظاہر ہے کہ مدارس کا رابطہ مدارس کے فضلاء کا قدرتی رابطہ ہے اس لئے اس اصول میں تنظیم مدارس کے راستہ سے علمی فضلا اور ان کے حلقہ ارادت کی تنظیم کر دی گئی ہے۔ جو انقلاب اور آزادی کے لئے حیثیت اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

پھر حضرت والاؒ نے صرف نظری ہی طور پر یہ اصول نہیں بتلا دیا بلکہ عملی طور پر ان ہی اصول ہشت گانہ کی روشنی میں بہت سے مدارس خود قائم فرمائے اور بہت سے مدارس اپنے متوسلین کے ذریعہ قائم کرائے۔ گویا ۵۷ء کے بعد آپ کی مستقل سیاست ہی یہ تھی کہ جگہ جگہ آزاد قومی مدارس قائم کئے جائیں اور ان میں آزاد ضمیر نوجوان تیار کئے جائیں۔ اگر لارڈ میکالے یہ دعویٰ لے کر اٹھے کہ: "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرزِ فکر کے لحاظ سے انگلستانی ہوں"۔ تو ان مدارس سے عملی طور پر یہ صدا بلند ہو کہ: "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نونہال تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرزِ فکر کے لحاظ سے عربستانی اور ہندوستانی ہوں"۔

چنانچہ ایسے ہی نوجوان تیار کرنے کے لئے اگر دیوبند میں دارالعلوم قائم فرمایا۔ تو مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا، سنبھل میں مدرسہ عربیہ الگ قائم کیا امروہہ میں مدرسہ جامع مسجد قائم فرمایا۔ گلاوٹھی میں مدرسہ قائم فرمایا۔ انبہٹہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسہ قائم فرمایا۔ غرض جہاں جہاں حضرت والاؒ خود پہنچے وہاں خود اور جہاں ان کے خدام اور متوسلین پہنچے وہاں ان کے واسطے سے بتاکید تمام آزاد مدرسے قائم فرمائے جس سے اطراف میں بکثرت مدارس قائم ہوئے پھر ان مدارس کے نقشِ قدم پر اور سینکڑوں مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں، جس سے آپ صرف بانی دارالعلوم دیوبند ہی ثابت نہیں ہوتے بلکہ اس نوعیت خاص کے لحاظ سے بانی مدارس ثابت ہوتے ہیں۔ اور پھر آپ نے ان مدارس کو ان ہی اصولِ ہشت گانہ سے وابستہ کر کے جن کی صراحت عنوان بالا میں ہے ان مدارس کی روحانی تنظیم بھی فرمائی جس سے ان کے پروردہ افراد خود ہی منظم ہو گئے اور ایک تنظیمی مذاق لے کر ابھرے۔

جمعیت علماء کا پس منظر...... چنانچہ آزادی کی تحریکات شروع ہوتے ہی یہ مدارس کی بے شمار جماعتیں رسمی طور پر بھی منظم ہو گئیں۔ اور انہوں نے جمعیت العلماء کے نام سے جنگ آزادی میں حصہ لے کر ملک کی جو شاندار سیاسی خدمات انجام دیں اور جو جو بے نظیر قربانیاں پیش کیں تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی۔ جمعیت العلماء کے افراد پر

شخصی حیثیت سے نکتہ چینی ہر وقت ممکن ہے۔ لیکن اس کے اصول ومقاصد اور اس کے تحت مجموعی حیثیت سے اس تنظیم مدارس کی لائن سے میدان میں نہ آتی تو عوام کا اس طرح جوق در جوق آوازۂ آزادی کا خیر مقدم کرنا قدرے مشکل تھا۔

اس ملک کا مزاج ہی مذہبی ہے اور اس کے لئے مذہبی آواز ہی میں جذب وکشش ہے۔ وہ کوری سیاسی آواز پر گوش بر آواز نہیں ہوتا۔ اسی لئے علماء کے میدان میں آنے سے پہلے یہاں کے عوام سے میدان خالی تھا۔ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی صدا بلند ہوتے ہی عوام سے میدان پٹ پڑے اور یہ ظاہر ہے کہ مذہبی صدا مذہبی حلقوں ہی سے اٹھی جو مدارس کی صورت میں اس وقت منظم تھے جب عوام اس قسم کی رسمی تنظیموں کے تصورات سے خالی تھے۔ **ملت کا وقار بازیافت کرنے کے اُصول**...... یہ غیر رسمی مگر رسمی سے زیادہ پائیدار تنظیم حضرت والا ؒ کے ان اصول ہشت گانہ اور طرزِ عمل سے ہوئی جس میں سیاسی مقاصد کے ساتھ دینی اور مذہبی جذبات بنیاد بنے ہوئے تھے اور جوں ہی اس مداری تنظیم کو رسمی انداز میں لایا گیا یعنی جمعیت کے پلیٹ فارم جگہ جگہ کھولے گئے وہیں عوام سے سیاسی میدان بھر گئے اور جوش وخروش کے حیرت ناک منظر سامنے آگئے جس کی شہادت تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادیٔ وطن دے سکتی ہے۔ بہر حال حضرت والا ؒ نے ۱۸۵۷ء کی شکست پر میدان شاملی میں مسلمانوں کی ہر جہتی آزادی مٹ جانے کے جو مظاہر اپنی آنکھوں سے دیکھے ان کا تیر بہدف علاج آزادی کے انہی بنیادی اصولوں اور ان کی عملی تشکیل سے ہوسکتا تھا جو بنام مدارس اور تعلیمی نظام کی لائن سے بروئے کار لائی گئی۔

سوانح مخطوطہ ① عبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف آج ہی اس نظام کے نتائج کا مشاہدہ کرنے والے اس کے قائل اور اس سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اس ابتدائی دور کے لوگ بھی حتیٰ کہ مخالفین تک بھی اس وقت جب کہ یہ نظام ایک مخالف ماحول میں قائم کیا جارہا تھا۔ اس کے اعتراف پر مجبور تھے کہ ملت کے گئے ہوئے وقار کی بازیابی کے لئے ان اصول سے بہتر تیر بہدف نسخہ دوسرا نہیں ہوسکتا جن کے سامنے دلی کی ویرانی اور اس کے مرکزی حیثیت کے تباہ ہوجانے سے پورے ملک کے حال ومال کی تباہی عیاں تھی، صاحب سوانح مخطوطہ نظام مدرسہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”اور جو فوائد معاش ومعاد کے مسلمانوں کو اس سے (ان اساسی اصول کے نظام تعلیم سے) حاصل ہوئے اور ہوں گے وہ مثل آفتاب کے روشن ہیں یہاں تک کہ مخالفین بھی مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لئے اور غیر قوموں پر غالب ہونے کے لئے (جنہوں نے انہیں مغلوب کیا) اس سے بہتر اور

① سوانح مخطوطہ کے مولف جناب حاجی فضل حق صاحب مرحوم ہیں جو دار العلوم کے اولین طبقہ میں ممبری کی حیثیت سے مجلس کے رکن رہے پھر ایک زمانہ تک دار العلوم کے مہتمم بھی رہے۔ ممدوح دیوبند کے باشندہ اور حضرت نانوتوی قدس سرہ کے معتقدین خاص میں سے تھے۔ آپ نے حضرت والا کی سوانح مرتب کی جو زمانہ کی دست برد سے ضائع ہوگئی۔ اس کے کچھ بچے کھچے اور پھٹے ہوئے اوراق پرانے کاغذات میں دستیاب ہوئے جن سے کافی معلومات بہم پہنچیں اور سوانح قاسمی میں ان سے کافی مدد ملی۔ اس مضمون میں جہاں سوانح مخطوطہ کا لفظ آئے اس سے یہی سوانح قاسمی مراد ہوگی۔

مجرب نسخہ کوئی نہیں''۔ گویا اس دور میں بھی جبکہ حکومت حاکمانہ رنگ سے چلتی اور ملّی تحریک محض حکیمانہ رنگ سے انقلاب لانے کے ڈھنگوں سے دنیا ناواقف تھی، ان اصولوں کی معنویت اور نتیجہ خیزی کو تسلیم کی جا چکا تھا اور مخالفین تک کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ آج اجتماعی مسائل کے سلسلہ میں نصف صدی کے پیہم تجربات کے بعد ملک جن اصول تک پہنچا ہے اور جن پر چل کر اس نے بدیشی غلامی سے نجات پائی۔ وہ سر مو ان اصول سے متجاوز نہیں ہیں جو حضرت والاؒ تقریباً ایک صدی پیشتر ۱۸۵۷ء کے بعد اجراء مدرسہ کے وقت اپنے قلم سے لکھ چکے تھے۔ اور عین اس وقت جبکہ ملک اور قوم کے بارسوخ افراد و طبقات اپنی زندگی حکومت متسلطہ کے رحم و کرم پر ڈال دینے اور اس کی حمایت و وفاداری ہی کو سب سے بڑی ترقی اور معراج کمال سمجھے ہوئے تھے اور اس میں سرگرم عمل تھے۔

عوامی قوت کا پرواز ...... پھر حضرت والاؒ نے ان اصول پر اس وقت اس ادارہ (دارالعلوم) کی بنیاد رکھی جبکہ ملک کے بارسوخ طبقات، بہت سے معاشرتی اور معاشی اداروں کی بنیاد نہ صرف منشاء حکومت کی تکمیل اس کی پوری پوری وفاداری اور اشتراک عمل کے اصول ہی پر رکھ رہے تھے بلکہ ان بنیادوں میں ان مجاہد و سربکف علماء و مفکرین کے ساتھ تحقیر و تمسخر کا برتاؤ اور عوام کو ان سے نفرت دلانے کا جذبہ بھی پیوست کیا جا رہا تھا۔

گویا ''اینٹی ملا ازم'' کا پروانہ بھی ساتھ ہی ساتھ ڈالا جا رہا تھا لیکن حضرت والا کے ان اساسی اصول پر قائم شدہ نظام میں جہاں بدیشی اقتدار کی شکست و ریخت کے نتائج مخفی تھے وہیں ان میں اس تحقیر و تمسخر کے اکھاڑ پھینکنے کی قوت بھی مضمر تھی کیونکہ ان اصول کا حاصل رابطہ حکومت نہ تھا بلکہ رابطہ عوام کا استحکام تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد متسلطہ اقتدار کے خلاف مشینی قوت کی بجائے عوامی قوت ہی موثر ثابت ہو سکتی جسے حضرت والاؒ نے پرکھ لیا تھا۔ جس کو اس زمانہ ہی میں مخالفین تک بھی مان چکے تھے اور جب کہ یہ عوامی قوت براہ راست انہیں علماء کے ہاتھ میں تھی اور ہے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ عوامی قوت کی بیداری کے وقت ہر طبقہ ان لوگوں کی طرف نہ جھکتا جو اس عوامی قوت پر قابض اور جائز طریق پر استعمال کرنے کے ڈھنگ سے واقف تھے۔

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا بھی چاہئے تھا کہ جن علماء کو نکما اور بیکار یا قوم پر ناحق بار یاور کرایا جا رہا تھا جونہی عوامی تحریکات شروع ہوئیں یا عوام کی قوت سے حکومت متسلطہ کے اقتدار کے خلاف عصبیتی جنگ کا آغاز ہوا۔ تو وہی ''اینٹی ملا ازم'' والے طبقات ان مردوں کی طرف جھکنے پر مجبور نظر آنے لگے۔ اور انہیں پر وہی تمسخر و نفرت اظہار عقیدت و نیاز میں تبدیل ہونے لگے۔

یہی علماء جو ۱۸۵۷ء کے بعد ان اصول کے زیر سایہ مدارس کی خلوت گاہوں میں برائے چندے خاموش بیٹھ گئے تھے وہ بالآخر انہیں کی جلوت گاہوں میں اس شان سے اچانک نمایاں ہوئے کہ چار و ناچار ان کے کارآمد ہونے کو تسلیم کر لیا گیا اور پھر عوامی تحریکات اکثر و بیشتر انہی کی قوت کے ہاتھوں چلیں اور آگے بڑھیں۔

عدم تشدد کے راستہ سے انقلاب کا ذہنی خاکہ ..... ان اصول کے زیر اثر تربیت پانے والے علماء بالآخر

آزادی ملک کا جھنڈا لے کر سب سے پہلے سامنے آئے اور جو کام شاملی کے میدان میں تلواروں سے پورا نہ ہوسکا تھا وہ امن کی زبان وقلم سے پورا ہوگیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس اول دارالعلوم دیوبند نے جو مسجد چھتہ کے عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر تھے حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس خلجان کے ذکر پر کہ ”اب ہندوستان کی حکومت انگریزوں جیسی مدبر اور قوی قوم کے ہاتھ میں آگئی ہے اور ان کے پنجے ایسے جم گئے ہیں کہ اب وطن کا استخلاص بظاہر ممکن نظر نہیں آتا“۔ ارشاد فرمایا۔ ”حاجی صاحب! آپ کیا فرمار ہے ہیں؟ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ لوگ سوئیں گے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگیں گے دوسری حکومت میں“۔

یعنی تشدد اور تلوار کے راستہ سے نہیں جو حکومتوں کے لوٹنے کا متعارف اور واحد طریقہ سمجھا جاتا ہے بلکہ امن اور عدم تشدد کے راستہ سے یہ لوٹ پوٹ عمل میں آئے گی جس سے واضح ہے کہ یہ بزرگ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے عدم تشدد کی راہ سے انقلاب کا خاکہ ذہنوں میں لئے ہوئے تھے اور حضرت نانوتویؒ نے اس خاکہ کو ان اصول ہشتگانہ کی دفعات کے تعینی رنگ سے بھر دیا۔ جس کو اس وقت کے ماحول میں اپنے سمجھے ہوئے تھے اور بقول صاحب سوانح مخطوطہ مخالف بھی معقول اور موثر تسلیم کر چکے تھے۔

یورپ کے مشاہدات میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کی قدر وقیمت...... اس مختصر مضمون کی حد تک میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ ملک کی آزادی میں ان علمائے آخرت کا کتنا اور کیا حصہ تھا؟ اسے پوری بالغ نظری کیساتھ مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ناظم جمعیت علماء ہند نے اپنی مشہور تصنیف ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ میں تاریخی حوالوں سے کھول دیا ہے۔ نیز دوسرے اہل قلم بھی اس موضوع پر کافی تحریری سرمایہ فراہم کر چکے ہیں۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ ملک کے استخلاص اور آزادی کا یہ نیا نقشہ انہی مجاہدین شاملی نے بنایا اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے پیشرو حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ تھے جن میں یہ جوش امتیازی شان سے ابھرا ہوا تھا اور انہوں نے اپنے اس جوش کو ہوش کی شکل دے کر آئینی رنگ سے ان اصول ہشت گانہ کے اساسی نظام میں بھر دیا تھا۔ جو اس اقامتی تربیت گاہ ”دارالعلوم دیو بند“ کے لئے آپ نے وضع فرمائے۔ دارالعلوم کے ان فضلاء کے ذریعہ جنہوں نے ان اصول کے زیر سایہ تربیت پائی یہ رنگ ملک میں پھیلنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ملک کے ایک بڑے طبقہ کا جو عوام پر اثر رکھتا تھا ذہن ہی یہ بن گیا اور عوامی رابطہ کی وہ عمومیت یا جمہوریت جو ان اصول میں پنہاں تھی ان تربیت یافتوں کے راستہ سے سو برس پہلے کی ہنڈیا کا ابال چھلکا تو چولہے کے گرد وپیش چاروں ہی سمتوں کو تر کر کے رہا۔

مولانا عبید اللہ مرحوم سندھی فرمایا کرتے تھے جس کو احقر نے خود بلاواسطہ سنا کہ ”میں نے حضرت نانوتویؒ کے اصول کی قدر وقیمت یورپ جا کر سمجھی، بالخصوص یورپ وایشیا کے متعدد انقلابات کی بنیادوں کو میں صرف انہی اصول کی روشنی میں پاسکا ہوں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں ان اصول کی شرح لکھنے بیٹھ جاؤں تو دو ضخیم جلدیں تیار کر دوں گا“۔

رئیس الاحرار کا غایت تأثر...... رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۲۳ء میں جب بسلسلۂ تحریک خلافت دیوبند تشریف لائے اور احقر ہی کے مکان پر حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے تو حضرت کے ان اصولِ ہشت گانہ کو دیکھ کر جو دارالعلوم کا سنگ بنیاد ہیں رو پڑے۔ اور غایت تأثر سے بیساختہ فرمایا کہ "یہ اصول تو الہامی معلوم ہوتے ہیں ان کا عقل محض سے کیا واسطہ"؟ چنانچہ ان اصول کی دفعات میں نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نانوتوی کے قلم سے بھی باوجود ذوقِ اخفاء کے جگہ جگہ یہ الفاظ نکل نکل گئے ہیں کہ "یوں معلوم ہوتا ہے" اور "یوں نظر آتا ہے" اور "ایسا ہو جائے گا" وغیرہ جو ان اصول کے الہامی ہونے کی گویا خود صاحب اصول کی طرف سے بھی شہادت ہے۔

انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولین ہیرو...... بہر حال ان اصول کی روشنی میں جو کچھ ہوا اس پر ۱۹۴۷ء شاہد ہے۔ اور اس انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولین ہیرو قدرتاً وہی سمجھے جا سکتے ہیں جو ۱۸۵۷ء میں بھی اسی اسٹیج پر تھے۔ جس پر آزادی خواہ، طبقے بعد میں آئے اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اپنے اساسی اصول و عمل کی راہ سے اسی اسٹیج پر رہے۔

بہر حال حضرت نانوتویؒ نے اگر ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لئے یہ دارالعلوم قائم کیا تھا۔ جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ اس بارہ میں معروف ہے اور رسالہ دارالعلوم میں شائع ہو چکا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اس ادارہ اور اس کے اصول تربیت نے یہ تلافی کر دکھائی اور زیادہ نہیں صرف نوے سال کی مدت میں جو ایک ملک کی نہیں بلکہ ایک فرد کی عمر ہوتی ہے ایک عظیم ترین طاقت کو جو ۱۸۵۷ء میں ایک ملک کے جائز حقدار کو پامال کر چکی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں مسکینانہ ضعف اور مظلومانہ فروتنی سے نیچا دکھایا۔ صف کی طرح ہندوستان لوٹ گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں لوگ سوئے انگریزوں کی حکومت میں صبح کو جاگے تو قومی حکومت میں اور اسی طرح ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی گئی۔ گو متسلط طاقت نے جاتے جاتے بھی آزادی کے نقشہ کو بگاڑ دینے کے کافی سامان فراہم کر دیئے جن کا بگاڑ کافی نمایاں ہوا۔ اور ابھی تک ہے لیکن جن اصول کی صداقت نے اصل نصب العین کو رونما کیا تھا انہیں اصول کی صداقت اس بگاڑ کے دفعیہ کی بھی کفیل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان اصول پر اسی سابقہ رنگ سے عمل کیا جائے۔

پھر اصول ہی نہیں مدرسہ کے عملی پروگرام کی تشکیل میں بھی حضرت والاؒ نے وہی تلافی والا نصب العین پیش نظر رکھا۔ آپ نے ایک طرف فن سپہ گری کی مشق کا شعبہ طلبہ کے لئے بہ تقاضائے وقت ضروری سمجھا۔ جس سے طلبہ میں جہاد کی قوت قائم رہے۔ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ پائیدار ہوتا رہے۔ اس میں بعض لوگوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ یہ مدرسہ عربیہ کیا ہوا۔ مدرسہ حربیہ ہو گیا تو حضرت والاؒ نے بقول صاحب سوانح مخطوطہ اس پر مبسوط تقریر فرمائی اور عصری اور شرعی تقاضوں کو جواب میں پیش کیا۔

عدالت شرعیہ کا قیام...... دوسری طرف قومی محکمہ قضا قائم فرمایا تاکہ متعلقین مدرسہ اپنے متعلقین اور حلقۂ اثر میں عدل و قسط اور انصاف پسندی قائم رکھنے کے ساتھ ان میں اپنے باہمی جھگڑوں کو خود نمٹانے اور شرعی اصول کو ہر معاملہ

میں حکم بنانے کا سلیقہ اور جذبہ ابھرا ہے چنانچہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس تحریری معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے جس میں اہل دیو بند سے آپ نے مختلف معاشرتی امور کے بارہ میں عہد کرایا۔ ایک دفعہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ ''کوئی مقدمہ جس میں فریقین مسلمان ہوں سرکاری کچہری میں نہ جاوے۔ اور اس کے حاکم مولانا محمد قاسمؒ صاحب تھے''۔

چنانچہ سینکڑوں مقدمات جو برسہا برس سے کچہریوں کی دفتری طوالتوں میں الجھے پڑے تھے۔ منٹوں میں فیصل ہونے لگے۔ یہ شرعی کچہری چھتہ کی مسجد میں قائم ہوئی۔ معاملات اور مقدمات کی تعداد جب زیادہ ہونے لگی تو فصل خصومات کا یہ کام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صدر مدرس دارالعلوم کے سپرد فرمایا گیا۔ اور انہیں کو مستقل قومی قاضی قرار دیا گیا۔ جب اس سلسلہ کا کام بڑھا تو اسی نسبت سے دیو بند کی سرکاری منصفی کی رونق گھٹنی شروع ہوگئی۔ اور یہی مقصد بھی تھا کہ متسلط قوت کا اثر ورسوخ ہر سمت سے کم اور کمزور ہوتا چلا جائے۔

دارالعلوم میں صنعت وحرفت کے شعبہ کا مقصد...... اسی کے ساتھ حضرت والاؒ نے دارالعلوم میں صنعت وحرفت کا شعبہ بھی قائم فرمایا جیسا کہ سوانح مخطوطہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تاکہ ادارہ کے فضلا معاشی ضروریات میں خود کفیل بننا سیکھیں۔

بظاہر یہ مقابلہ تھا اس ردکا کہ اس وقت کی تعلیم کا انتہائی نقطۂ نظر ملازمت تھا اور وہ بھی سرکاری جس کا مال اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا تھا کہ اسکولی اور کالجی تعلیم سے لوگ سرکاری ملازمت کرنا سیکھیں اور اس ملازمت سے اپنی غلامی کی جڑوں کو مضبوط بنائیں۔ اس کا ردعمل صحیح معنی میں یہی ہوسکتا تھا کہ لوگ اس غلامی امور تعلیم سے ہٹ کر اس تعلیم میں لگیں جو غناء واستغناء کا جوہر پیدا کرے اور جہاں تک معاش کا تعلق ہے سرکاری ملازمتوں سے الگ رہ کر صنعت وحرفت یا قومی ملازمت سے اپنے گزر بسر کا سامان کریں۔

دارالعلوم کے ذریعے ''ہندو مسلم'' کا پرواز...... ایک طرف دارالعلوم کے چندوں کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا کہ ان میں غیر مسلم بھی شریک ہوسکیں۔ چنانچہ دارالعلوم کی ابتدائی روداد میں بہت سے ہندوؤں کے چندے بھی لکھے ہوئے ہیں۔ حضرت والاؒ کی تجویز پر یہ بھی تحریک کی گئی کہ ملک کے تمام مطابع اور پریس بلا تفریق مذہب وملت اپنی مطبوعات کا ایک ایک نسخہ کتب خانہ دارالعلوم کو عنایت کریں۔

چنانچہ سب سے پہلے اس صدا پر لبیک کہنے والی شخصیت ایک ہندو کی تھی، اور وہ منشی نول کشور مالک مطبع نول کشور لکھنو تھے جنہوں نے اپنے پریس کی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ دارالعلوم میں بھیجا۔ جس پر دارالعلوم کی جانب سے ان کے حق میں شکریہ ودعا کا ہدیہ پیش کرنے کے لئے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس میں حضرت نانوتوی قدس سرہ بھی شریک تھے اور شکریہ کی ایک مستقل تجویز پاس کر کے ان کے پاس بھیجی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس ادارہ کو عوامی نہیں بلکہ ایسا ہمہ گیر ادارہ بنانا چاہتے تھے جس میں غیر اقوام کی ہمدردیاں بھی شامل رہیں۔ گویا ہندو مسلم اتفاق کا پرواز بھی ڈال دیا گیا۔

دارالعلوم میں بین الاقوامیت کا عنصر...... بلکہ سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس دارالعلومی تحریک کو نہ صرف ملک گیر ہی بنانا چاہتے تھے جس میں اس ملک کی ہر قوم کی ہمدردیاں اس ادارہ اور اس کی تحریک کے لئے حاصل ہوں بلکہ اسے عالمگیر بھی دیکھنا چاہتے تھے اور اس کی حلقہ کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں اور ان کی حکومتوں سے بھی جوڑنا چاہتے تھے چنانچہ ترکی کی خلافت جو اس وقت پورے عالم اسلامی پر اثر رکھتی تھی سے انتہائی شدومد سے اپنے تعلقات کو دینی اور علمی حیثیت سے وابستہ فرمایا۔ سلطان عبدالحمید خان والی ترکی کی جنگ روس سے ہوئی تو حضرت والاؒ نے ترکی کے لئے چندہ شروع کیا اور اپنے گھر کا سارا اثاثہ اپنی اہلیہ محترمہ کا تمام جہیز، کپڑا، زیور برتن سب کچھ ترکوں کی حمایت کے لئے قربان کر دیا۔

تنظیم ملت کا نیا خاکہ...... اس سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس دارالعلوم کی تحریک کا مرکب نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی، غلامی شکنی، اسلامی اتحاد، وطنی اتحاد، قومی خود مختاری، حق خود ارادیت، معاشی استغناء، وسائل قوت کی فراہمی، رابطہ عوام، تالیف خواص وغیرہ کے ملے جلے جذبات کارفرما تھے۔ اور دارالعلوم کی تاسیس ایک خاص مکتب فکر کی تاسیس تھی جیسا کہ حضرت والاؒ کے اصول ہشت گانہ اور جاری کردہ نظام کار سے واضح ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ کے کارکنوں اور پروردوں میں استغناء کی روح پھونکتے ہوئے انہیں حکومت وقت سے بے پرواہ اور قوم کے غریب افراد اور عوام سے زیادہ سے زیادہ مربوط فرمانے کی راہ ڈال رہے تھے ورنہ تکثیر چندہ اور وہ بھی زیادہ تر غرباء سے پھر افزائش طعام طلبہ کی سعی جو قوم کے غریب بچے ہی ہو سکتے تھے اور ادھر حکومت وقت کی امداد سے کلی استغناء بلکہ ممانعت اور امراء اور جاگیرداروں پر تکیہ کر کے ان کے فخرانہ عطیات سے اعراض کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ کہ حکومت وقت کے علی الرغم رابطہ عوام کو مستحکم اور مضبوط کیا جائے تاکہ ملک کے عوام اس مدرسہ کو اپنی چیز سمجھیں اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو کر اپنی عوامی طاقت سے انہیں آگے بڑھائیں ورنہ محض درس و تدریس کی حد تک تنظیم ملت کے اس نئے خاکہ کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟

پھر اگر محض مذہبی تعلیم و تعلم ہی نصب العین کی آخری حد تھی تو مدرسہ میں فن سپہ گری کے شعبہ کے قیام کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟ جسے حضرت والاؒ نے اہتمام کے ساتھ خود قائم فرمایا۔ نیز محض مذہبی تعلیم ہی پیش نظر ہوتی تو حضرت والاؒ صنعت و حرفت کا شعبہ اس مدرسہ میں قائم نہ فرماتے؟ جو خالص معاشی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اگر یہ محض ایک مذہبی مکتب تھا تو حضرت والاؒ شرعی محکمہ قضا قائم فرما کر اعضاء مدرسہ کو اس کا جج مقرر نہ فرماتے جو خالص ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ اسی طرح صرف مذہبی تعلیم ہی کا خاکہ مدرسے کے کاروبار کی آخری حد ہوتی تو مدرسہ کے چندہ دہندوں میں غیر مذہب کے لوگوں کے عطیات شامل کئے جانے کا کوئی تصور سامنے نہ آنا چاہئے۔ نہ ہندو مسلمانوں کے بلاتخصیص مذہب و ملت چندے قبول کئے جاتے اور نہ ہندو چندہ دہندگان کی دعا و شکریہ سے

ہمت افزائی کی جاتی۔ پھر اگر کاروبار مدرسہ کی انتہائی غرض محض کتابی درس وتدریس تھی تو حضرت والاؒ اس مدرسہ کے سرپرست اور ہمہ اوست ہوتے ہوئے سلطانی چندہ کی بنیاد ڈال کر اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان والی ترکی کی مدح میں قصائد لکھ کر خلافت ترکی سے رشتہ ارتباط قائم کرنے کی صورتیں پیدا نہ فرماتے۔ گویا آپ نہ صرف ملک کی اندرونی اقوام ہی سے رشتہ یگانگت قائم فرمانے کے داعی تھے بلکہ بیرون ملک سے بھی رشتہ اتحاد کا سلسلہ پھیلانا چاہتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدرسہ محض کتب درسی کی تعلیم کا مدرسہ نہ تھا بلکہ حضرات سے ایک ملی جلی تحریک کے مرکز کی حیثیت سے قائم فرمارہے تھے جن کے نظام کار میں علم وعمل، معاش ومعاد، قوم ووطن اور دین ومذہب کی حمایت ونصرت کے ملے جلے جذبات ایک دم پیش نظر تھے جو حضرت والاؒ کے وسیع اور ہمہ گیر ذہن سے نکل کر اس مدرسہ کی بنیادوں میں پیوست ہوئے اور اس کے اثرات تعلیمی راہوں سے اس ادارہ کے تربیت یافتہ فضلا متوسلین میں حسب استعداد وقابلیت نفوذ پذیر ہوتے رہے۔

قیام دار العلوم کا بنیادی محرک!...... بہرحال دار العلوم کے یہ اساسی اصول اور اس کا نظام کار اس ہمہ گیر حکمت عملی اور وسیع نظام کی غمازی کر رہا ہے جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد شاملی کے میدان سے لیکر آئے اور اس کی ناکامی کی تلافی کے لئے بقول حضرت شیخ الہندؒ یہ مدرسہ قائم فرمایا۔ غور کیا جائے تو یہ اس امانت کی ادائیگی تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ سے حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ میں اور ان سے بواسطہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمہ اللہ، حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ تک منتقل ہوئی اور حاجی صاحبؒ کے لوگوں میں بلا آخر پوری قوت کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے قلب ودماغ کا جوہر بن گئی جنہیں حاجی صاحبؒ نے اپنی زبان اور اپنے مقاصد کا ترجمان فرمایا تھا جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے ترجمان خاص ہی سے ان جذبات کے بقاء ترویج اور اظہار واعلان کی توقع ہوسکتی تھی اور وہی ایسے ہمہ گیر ادارہ کے اصول ونظم کا تصور باندھ سکتے تھے۔

اصول آزادی کی امین شخصیت...... بہرحال ان اصول ہشت گانہ کے مرکب نصب العین کی یہی وہ اصولی اور عملی خصوصیات ہیں جن کی مادی اور معنوی شکل کا نام دار العلوم دیوبند ہے اور جس نے بالآخر ۱۸۵۷ء کی پسپائی کی تلافی کر دکھائی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بالآخر دنیا اس کے نصب العین پر آ کر رہی اور آزادی ملک وملت کے لئے جو خاموش راہنمائی اس نے کی وہ اشتہاروں، پوسٹروں، رسالوں اور اخباروں اور عمومی پروپگنڈوں کے شور محشر میں نظر نہیں آتی۔

اس لئے اس یوم آزادی کے موقع پر جب کہ دنیا مختلف اندازوں سے اس کی یاد منا رہی ہے اور مختلف انداز کی یادگاریں قائم کرنے کے مشورے دیئے جارہے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھ کر ان اصول کے تذکرہ سے یاد منائیں جن پر چل کر دنیا، آزادی کی منزل پر پہنچی اور اس شخصیت کا ذکر خیر کریں جن کا وسیع اور ہمہ گیر ذہن ان دواعی آزادی کا نہ صرف جذبات بلکہ اصول کے درجہ میں بھی امین تھا اور جو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو ہو

کر ملک کا ذہن آزادی پسند اور حریت طلب بناتے رہے تا آنکہ آزادی سامنے آکھڑی ہوئی اور آج ہر ایک کو اس کی خوشی منانے کا موقعہ ملا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محمد طیب غفرلہ

مدیر دارالعلوم دیوبند (۱۵ اگست ۱۹۵۸ء)

اکابر دیوبند اور آزادیٔ ہند

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

شیریں ثمر کے حصول پر تبریک...... بزرگانِ ملت! علمائے کرام اور عزیز طلبائے دارالعلوم! یہ آج کا مبارک ① دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ایک عظیم الشان سلطنت جس کے متعلق مسلم تھا کہ اس میں کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں خود اس سلطنت کے ایک مغرور اور متکبر نمائندہ گلیڈ سٹون نے اپنے ایامِ زندگی میں کہا تھا کہ ہماری سلطنت آج اس قدر طاقت ور ہے کہ اگر آسمان بھی اس پر گرنا چاہے تو ہم اسے بھی اپنی سنگینوں کی نوک پر روک لیں گے اور وہ ہماری سلطنت کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ وہی سلطنت آسمان کے گرنے سے نہیں محض زمین کے چند ذروں کے اڑنے سے اس سہولت سے ختم ہو رہی ہے۔ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ ہم اس انقلاب پر پورے ملک کو مبارکباد دیتے ہیں۔ پورا ملک عموماً اور خصوصیت سے وہ جوا، بوڑھے اس مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی قربانی اور مساعی نے یہ شیریں ثمر ہندوستان کے سامنے لا رکھا۔

اکابرِ ملت اور جہادِ آزادی...... ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر ہم ان اکابرِ ملت کی مساعی کا تذکرہ نہ کریں جنہوں نے حقیقتاً اس آزادی کا سنگِ بنیاد رکھا اور اس وقت رکھا جب کہ آزادی کے تصور سے بھی اس ملک کے دل و دماغ خالی تھے وہ شاہ ولی اللہ کے جانباز شاگردوں کی جماعت ہے جو دو سو برس سے اس سعی میں نہ صرف قلم اور روشنائی سے بلکہ شمشیر اور خون سے اس کی راہ نوردی کر رہے تھے۔ آخر میں ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزی اقتدار مکمل ہو کر پوری طرح اس ملک پر چھا گیا تو صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو اس ملک میں زندہ رکھا اور بالآخر اسی تصور کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا۔

۱۸۵۷ء میں بانیٔ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ بقول مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اس تصور کے سب سے بڑے حامل اور اس جوش کے سب سے بڑے امین تھے۔ انہوں نے اپنے شیخ حضرت امداد اللہ

① ہندوستان کی آزادی کے موقع پر ۱۴/۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب میں نماز تراویح کے بعد علماء و طلباء دارالعلوم اور اہلِ شہر سے خطاب۔

قدس سرہ کی قیادت میں تلوار اٹھائی اور آزادی کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں آ گئے۔ لیکن وقت مقررہ نہیں آ پہنچا تھا اس لئے فتح کا سلسلہ شاملی کی فصیل تک رہ گیا اور دہلی کے تخت تک نہ پہنچ سکا۔ ملک آزاد نہ ہوا۔ لیکن یہ جماعت اپنے تصور سے الگ نہ ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی دنیا وفاداری کے جذبہ سے سرشار تھی۔ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قرآن سے آیات جہاد کو خارج کر دینے کے مشورے اور منصوبے قائم کئے جا رہے تھے۔ دیو بند کے بیج کرتے والے مولویوں کو باغی کا نام رکھ کر مطعون کیا جا رہا تھا لیکن یہ جماعت اپنی دھن میں مگن تھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اس دنیا سے گئے تو ان کے صحیح اور سچے جانشین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے جوان کے علم اور نظریات کے جائز وارث تھے۔ اس پوری جماعت کی سرپرستی کے ساتھ تحریک آزادی اس وقت جاری رکھی جب کہ انگریزوں کی مخالفت کا تصور بھی گھروں کے کونوں تک میں نہ تھا۔ نہ صرف قلم یا زبان کی حد تک بلکہ عمل کے پردوں میں اور عمل بھی معمولی نہیں بلکہ ایسے ہمہ گیر عمل کے ساتھ جس کی لپیٹ میں ہندوستان کی متعدد ریاستیں، اسلامی ممالک، متعدد فرماں روا اور انگریزی فوجوں کے کتنے ہی افسر بھی آ گئے اس عمل کا جال ہندوستان سے گزر کر روس کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ مدینہ کے گورنر جمال پاشا کے قول کے مطابق "شیخ الہند کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جثہ میں کیا حرارت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا"۔

بہر حال ان بزرگوں کا جذبہ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف نہ جاہ و منصب کے لئے تھا نہ وزارت کی کرسیوں کے لئے تھا نہ کسی ایک پارٹی کے اقتدار کے لئے تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ ایک جابر قوم کی گرفت سے مظلوم ملک کو نکالا جائے اور حقِ اقتدار کے طور پر جس کی امانت ہو اسے سپرد کیا جائے۔

شیخ الحدیث دارالعلوم کی پیشین گوئی...... ان بزرگوں کا ہر وقت یہی ذکر تھا اور یہی فکر، اس کے بارے میں پیشین گوئیاں اور مکاشفات تھے اور اسی کے بارے میں عام نظم اور انتظام چھتہ کی مسجد میں یہ سب بزرگ جمع تھے اور انگریزوں کے تسلط اور غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں نے گہرے پنجے جمائے ہیں دیکھئے کس طرح اکھڑیں گے؟

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دارالعلوم دیو بند کے سب سے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔ فرمایا "حاجی صاحب آپ کس خیال میں ہیں؟ وہ وقت دور نہیں جب کہ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ کوئی جنگ نہ ہوگی بلکہ بدلت امن و سکون یہ ملک صف کی طرح پلٹ جائے گا اور انقلاب ہو جائے گا۔ رات کو سوئیں گے ان کی عملداری میں اور صبح کریں گے دوسری عملداری میں!"۔

لیکن آج دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پندرہ اگست کی رات لوگ حسب معمول دس گیارہ بجے سوئے تو انگریزوں کی عملداری میں تھے۔ اور جب پندرہ اگست کی تاریخ شروع ہوئی تو ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر دوسری

عملداری تھی۔ سوئے ایک عملداری میں اور جاگے دوسری عملداری میں۔

آزادی ہند کی جدوجہد کی ابتداء صرف مسلمانوں نے کی..... میں آج کے جانبازوں کی ناقدری نہیں کرتا لیکن اس سے کسی حالت میں بھی نہیں ہٹ سکتا کہ آج کی آزادی کی تمام مساعی ایک عمارت ہے جس کی بنیاد یہ بزرگ رکھ گئے تھے اور اس لئے میں بہانگ دہل کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کی یہ جدوجہد صرف مسلمانوں نے شروع کی انہوں نے اسے پروان چڑھایا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا کہ "ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا"۔ حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی نے اس فتویٰ کو استعمال کیا اور اس نسخہ شفا کو خاص ترکیب سے پیا اور پلایا۔ شیخ الہندؒ نے اسی نسخہ کو معجون مرکب کی صورت میں محفوظ کیا اور اس قابل کر دیا کہ ہر کس و ناکس اسے استعمال کر سکے۔ چنانچہ دوا استعمال عام شروع ہو کر عام ہو گیا۔ تحریک خلافت میں بھی نسخہ گو تلخ تھا مگر سب نے استعمال کیا اور بہر حال استعمال عام شروع ہو کر آزادی کا جذبہ مسلمانوں سے گزر کر ابناء وطن تک پہنچا وہ بھی سرگرم ہو گئے اور ہندو مسلمانوں کی انتھک مساعی اور قربانیوں کا ثمرہ شیریں آج ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس پر ہم ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور ان بزرگان مرحومین کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں' جن کی تخم ریزی اور تردد سے یہ درخت تناور ہوا اور آج اس کا پھل سب کھا رہے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات..... ہندوستان کی آزادی تمام دنیائے اسلام کی آزادی ہے اس لئے ہماری مبارکباد کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہے۔ ملک کی آزادی کی یہ پہلی قسط ہے۔ اس کی دوسری قسط جون اڑتالیس میں سامنے آنے والی ہے۔ لیکن ان اکابر مرحومین کا مقصد اس سے بھی آگے ہے۔ ہمیں آزادی کی دوسری قسط اور پاک نصب العین کی تکمیل کا انتظار بھی کرنا چاہئے اور اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ابھی کمر کھولنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہماری مبارکبادی کی مستحق ہندوستان و پاکستان دونوں سلطنتیں ہیں۔" ہم پاکستان کو مسلمان کی حیثیت سے اور ہندوستان کو وطن کی حیثیت سے مبارکباد دیتے ہیں"۔

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل..... میں اس تصور کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان میں مسلمان اب ایک معمولی اقلیت کی صورت میں رہ گئے ہیں اور آج کی آزادی میں جہاں ان کے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ انگریز کا دوسو سالہ اقتدار ختم ہو گیا جس کے لئے وہ بے چین تھے۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات..... وہیں اس فکر کا موقعہ بھی ہے کہ ان کی حیات اجتماعی کی اس ملک میں اب کیا صورت ہے کہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم کرنے کے لئے اپنے میں سے کسی امام اور متدین امیر کا انتخاب کر کے ہندوستان کی مسلم جماعتیں منتشر رہنے کے بجائے متحد ہو جائیں اور اسلام کے کلمہ پر ایک ہوں ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں۔ صرف ظاہری طور پر ایک نہ ہوں بلکہ حقیقی طور پر ایک

ہوں۔اسی ایک جملہ میں ان کی حیات اجتماعی کی لمبی چوڑی داستان پنہاں ہے۔ان کے لئے سب سے مقدم یہ چیز ہے کہ ماضی کے واقعات فراموش کر دیے جائیں طعن وطنز کا سلسلہ ترک کر دیا جائے ایک دوسرے پر الزام رکھنے کی فکر نہ رکھیں بلکہ صرف مستقبل کو سامنے رکھ کر اس پر غور کریں کہ انہیں متحد ہو جانے کے لئے اخوت ومساوات کی کتنی تدابیر ہو سکتی ہیں جو وہ آج عمل میں لا سکتے ہیں۔

نئے ہندوستان میں وحدت جماعت کی ضرورت...... میرے خیال میں پہلے سے زیادہ اب وقت ہے کہ ہم متحد ہوں پہلے سے زیادہ اب امکانات ہیں کہ ہم متحد ہو سکیں۔وہ پارٹیاں جن پر آویزشوں کی بنیادیں ہیں۔اس انقلاب سے منقلب ہو چکی ہیں اور حقیقتاً ہندوستان کے بدلنے سے وہ بھی بدل گئی ہیں۔اس لئے اب بجائے اس کے کہ ہم نئی پارٹیوں کی بنیادیں رکھ کر اختلافات کی تخم ریزی کریں یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ وحدت جماعت کا سنگ بنیاد رکھ کر ان تمام مسائل کو حل کریں جو نئے ہندوستان میں پیدا ہو گئے ہیں۔میں آخر میں مکرر مبارک باد پر جو مسلمانوں کے لئے اور پورے ایشیاء کے لئے ہے اس تقریر کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

پس منظر ...حضرت مولانا مدنی مدظلہ کی تحریک اور نائب مفتی احمد علی صاحب سعید کی تائید سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر جلسہ قرار پائے۔قاری حفظ الرحمٰن صاحب کی قراءت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔حافظ اخلاق احمد صاحب محرر دارالافتاء نے حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کی جانب سے قاسمی کا قصیدہ خیر مقدم پڑھ کر سنایا۔محمد حبیب دیو بندی طالب علم نے اردو نعت اور فضل الرحمٰن ابن قاری حفظ الرحمٰن نے عربی قصیدہ سنایا۔

حضرت مولانا مدنی مدظلہ نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا مے روی

نہایت خوشی کا مقام ہے جس جگہ ہم سب جمع ہیں یہ کوئی معمولی نہیں ہے۔تذکرۃ الرشید میں ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ نے خواب میں دیکھا تھا کہ۔

''میں خانہ کعبہ کے در پر کھڑا ہوں اور میرے پیروں کے نیچے سے نہریں نکل کر تمام عالم میں پھیل رہی ہیں''۔اس خواب کا مصداق دارالعلوم اور اس کی شاخوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے خلیفہ اعظم تھے۔شاہ عبدالغنی صاحبؒ تا وہ یذ میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ پر اور خلفاء میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ پر فخر کیا کرتے تھے۔چنانچہ تصوف میں مولانا رفیع الدین صاحبؒ کا بڑا درجہ تھا۔انہوں نے ہی یہ خواب دیکھا تھا کہ علم کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دی گئیں وہ تعجب کرتے تھے کہ میرا علم میں کوئی بڑا درجہ نہیں ہے پھر ایسا کیوں ہوا؟ مگر جب وہ دارالعلوم کے مہتمم بنائے گئے تو معلوم ہوا کہ ان کے ذریعے سے علم دنیا میں پھیلا۔

ایک دوسرا خواب انہوں نے ہی یہ دیکھا تھا کہ ''مدرسہ کے چمن میں خانہ کعبہ ہے اور لوگ اس کا طواف کر

رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی معنوی حیثیت اسلام میں وہ شان رکھتی ہے جو عالم میں خانہ کعبہ کے انوار و برکات لئے ہوئے ہیں"۔ ہماری عملی حالت گو بہت گری ہوئی ہے مگر خدا کا یہ عظیم الشان احسان ہے کہ اس نے ہم سے اس مرکز کی خدمت لی۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ کے ان مکاتیب میں جو ابھی چھپے نہیں ہیں میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب جہانگیر نے ان کو قید کر کے دہلی بلایا تو ان کا دیو بند سے گزر ہوا تو فرمایا کہ "اس جگہ سے علم نبوت کی بو آتی ہے"۔

چنانچہ اس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے علم شریعت وعلم نبوت کا مظہر قرار دیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے جب ہمارے مہتمم صاحب کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مدرسہ کے لئے دعا فرمائیں تو بگڑ کر فرمایا کہ "کیا خوب! تمہارے مدرسہ کے لئے؟ نہ معلوم ہماری کتنی راتیں اس دعا کی نذر ہوئی ہیں۔ اور اب مدرسہ آپ کا ہو گیا۔ فرمایا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارا خیال تھا کہ علم شریعت کا کوئی مرکز بننا چاہئے مگر ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دیو بند کو اس کام کے لئے منتخب کیا ہے"۔

بہرحال یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ہم سب سے یہ خدمت لی۔ دار العلوم کو جو فضیلت ان بزرگوں کے ذریعہ سے حاصل ہے وہ کسی دوسری جگہ کو نصیب نہیں ہے۔ علم کے اللہ نے بڑے بڑے مرکز مقرر فرمائے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عراق، شام، مصر، خراسان، بخارا اور سمرقند وغیرہ۔ پھر دیو بند کے حصہ میں یہ دولت آئی۔ دینی علوم کی ترقی جس قدر آپ کو یہاں ملے گی وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہے۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ ①

یہاں کے دیہات میں علم کا جو اثر ہے وہ دوسری جگہ کے شہروں تک میں نہیں ہے۔ ہمارے محترم بزرگ حضرت مہتمم صاحب گو عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر ان کو خاندانی جو نسبت حاصل ہے اور ان کا جو منصب ہے۔ اس کے اعتبار سے وہ ہمارے سب کے سردار ہیں۔ ہمارے لئے افسوس کا موقع تھا کہ وہ دوسری جگہ پاکستان رہ جاتے۔ اگرچہ جانا عارضی تھا مگر یہ افواہیں سن سن کر اب واپسی نہیں ہوگی ہم کو تکلیف ہوتی تھی مگر ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور

الحمد للہ! ہمارے صدر مہتمم صاحب حضرت نانوتوی کی آنکھوں کے تارے تشریف لے آئے ہیں۔ ہم جس قدر بھی خوشی کا اظہار کریں کم ہے۔ ان کا قیام اگر پاکستان میں ہوتا تو بھی فیض سے خالی نہ ہوتا مگر ہمارے لئے قلق کا باعث ہوتا۔ آپ کے لئے سرچشمہ فیض خانہ کعبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر میں ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اپنے سفر کے تاثرات سے بھی مستفیض فرمائیں گے تاکہ وہ مستقبل میں ہمارے کام آئیں۔

حضرت مولانا کی تقریر کے بعد مولوی غلام حیدر اور مولوی عبدالاحد صاحبان کی دستار بندی ہوئی۔ اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے خطبہ مسنونہ کے بعد ذیل کا شعر پڑھ کر اپنے تاثرات بیان فرمائے۔

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۱۔

حدیث پاکستان

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . اَمَّا بَعْــــــدُ !

عظیم الشان نفع...... بزرگانِ محترم!

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل　　　　نسیم صبح تیری مہربانی

میں حیران ہوں کہ بیان تاثرات کے اس بوجھ کو کس طرح اٹھاؤں مجمع اکابر کا ہے۔ اساتذہ کا اجتماع ہے۔ بزرگوں کے اجتماع میں قوت گویائی یارا نہیں دیتی اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ ارشاد ہے کہ اپنے ان تاثرات کا اظہار کروں جو ہر شخص کچھ نہ کچھ سفر سے لے کر آتا ہے۔

اول تو پاکستان جانے میں جو عظیم الشان نفع حاصل ہوا وہ دعائیں ہیں جو بزرگوں نے فرمائیں۔ وگر میں پاکستان نہ جاتا تو یہ دعائیں حاصل نہ ہوتیں۔ پھر بزرگوں کے حوصلہ افزا کلمات میسر نہ ہوتے۔ حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب نے اپنی نظم میں جس تاثر کا اظہار فرمایا وہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ اور حضرت شیخ مدظلہٗ العالی کے بارے میں تو میں کیا عرض کروں وہ تو ہم سب کے لئے ان شاء اللہ وسیلۂ نجات ہیں۔ حضرت نے اس ناکارہ کے بارے میں جو کلمات فرمائے ہیں۔ "میری درخواست یہ ہے کہ وہ انہیں یاد رکھیں اور قیامت میں انہی الفاظ میں گواہی دے دیں تاکہ میرے لئے وہاں نجات کا باعث ہوں کہ یہ کلمات ہی میرے لئے دستاویز نجات ہیں"۔

(اس موقع پر وفور جذبات سے حضرت مہتمم صاحب پر رقت وگریہ طاری تھا۔ ممدوح کی اس حالت کا مجمع پر بھی زبردست اثر پڑا اور لوگوں کے بے ساختہ آنسو نکل آئے) چند لمحے خاموش رہنے کے بعد فرمایا۔

پاکستان جانے کے مقاصد...... میں یہاں سے پاکستان تین مقصد لے کر گیا تھا۔ ایک عزیز اقرباء سے ملاقات تھی جن کا عرصہ سے تقاضا تھا۔ وہاں کے مدارس سے بھی طلب تھی اور جلسوں میں شرکت کے خطوط بھی برابر آرہے تھے۔ اس مرتبہ کوشش کی کہ ہو آؤں۔ چنانچہ سفر کا یہ مقصد میں نے حکومت کے سامنے بھی ظاہر کر دیا تھا۔

دوسری غرض دارالعلوم کا مفاد تھا۔ دارالعلوم ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں وہاں سفر بھی

کئے۔اور بساط کے موافق جتنی کوشش ہوسکتی تھی کی؛ اس کے اثرات اور منافع بھی بحمد اللہ ظاہر ہوئے۔

تیسرے تبلیغ واصلاح کا سلسلہ جو ہر شخص کا فرض ہے اور قدرتی طور پر میرے دل میں بھی ہے ایک اہم مقصد سفر تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ جلسے ہوئے اور اصلاح دینی کی سعی کی گئی۔ میں نہ سیاسی آدمی تھا، نہ ہوں۔ اس لئے زیادہ تر اجتماعات، اخلاقی مواعظ و پند پر مشتمل ہوتے تھے۔

دنیا کا عمومی دینی انحطاط...... دینی حالت پاکستان و ہندوستان کیا، ساری دنیا کی یکساں ہے۔ آج حقیقی طمانیت تمام دنیا سے مفقود ہے۔ دنیا اس وقت ایک بے اوڈھک کرہ کی طرح اضطراب اور حرکت میں ہے۔ ساری دنیا کی یہی کیفیت ہے۔ آج جہاں سے بھی خبریں آتی ہیں وہ عام بدامنی، عام طور سے بے چینی، بے سکونی، لڑائیوں اور فسادات کی تو آتی ہیں۔ صلاح و رشد کی اطلاعات کہیں سے نہیں آتیں حجاز سب سے بڑا مرکز دین ہے۔ خود وہاں کی حالت بھی دینی اور اخلاقی حیثیت سے بلند پایہ نہیں۔

تیسرے سال جب مجھے وہاں حاضری کا موقع ہوا تو میں نے دیکھا کہ عصر کے بعد ہزاروں آدمی جبکہ طواف بیت اللہ اور ذکر اللہ میں مشغول تھے۔ مکہ کے چند نوجوان جو لباس فاخرہ پہنے ہوئے تھے اور اونچے طبقے کے معلوم ہوتے تھے۔ حرم محترم میں انگریزی اخبار ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ جس میں عریاں تصویریں تھیں۔ ان تصویروں کی خوبیاں بیان کرنے اور یورپ و لندن کے تمدنی مسائل کی بحث میں مشغول تھے۔ گویا وہ ان طواف و ذکر کرنے والوں کو احمق سمجھ رہے تھے۔ اور ان کے نزدیک ان عریاں تصاویر کی دید بیت اللہ کی دید کے مقابلہ میں زیادہ باوقعت تھی۔ مجھے بڑی ضیق ہوئی۔ حرم محترم میں بیٹھ کر بیت اللہ کے سامنے قبولیت کے اوقات میں تصاویر پر بحث کرنا بہت ہی ناگوار گزرا۔ میں چپ رہا یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہوئی اور لوگ نماز میں مشغول ہوگئے۔ نماز کے بعد دیکھا تو انہوں نے پھر یہ مصور اخبار سنبھالے اور پھر وہی بحث چھیڑی تنگ ہوکر میں نے عرض کیا کہ "عزیزو! مشرق و مغرب کے لوگ جو آپ کی تقلید کرنے یہاں آتے ہیں جب آپ عمل کا یہ نمونہ پیش کریں گے تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ آپ کو اپنا مقام خود سمجھنا چاہئے۔ آنے والے آپ سے اسلام کا نمونہ سمجھنا اور سیکھنا چاہتے ہیں"۔ حاصل یہ ہے کہ اخلاقی حالت آج ہر جگہ یہ ہے تو ہندوستان اور پاکستان تو پھر بعد کی چیز ہے۔ بہرحال ہر ملک کی طرح پاکستان بھی دین کے لحاظ سے بہت زیادہ محتاج اصلاح ہے۔

اصلاح کی ذمہ داری...... اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہے؟ حقیقت میں مسلمانوں پر، مسلم کو خیر الامم کہا گیا ہے جس طرح جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم امام الانبیاء ہیں۔ اسی طرح آپ کی امت بھی امام الامم ہے۔ اگر امام کا وضو ٹوٹ جائے تو مقتدیوں کی تو نماز بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ پھر مسلمانوں میں سب سے زیادہ اصلاح خلق اللہ کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ذمہ داری بھلادی ہے۔ اگر وہ خود خلیق ہوں تب دوسرے بااخلاق بن سکتے ہیں۔

پاکستان میں سر اٹھانے والے فتنے...... وہاں اس وقت دینی حیثیت سے تین فتنے مسلمانوں کے لئے خطرناک ثابت ہو رہے ہیں۔ ایک قادیانی فتنہ۔ دوسرا شیعیت کا فتنہ۔ اور تیسرا مغربیت کا فتنہ۔

قادیانیوں نے اپنا مرکز کوئٹہ بلوچستان کو بنالیا ہے۔ مرزا بشیر الدین نے اعلان کر دیا ہے کہ قادیانی بلوچستان کو سنبھالیں۔ چنانچہ انہوں نے کوئٹہ میں اپنا مرکزی دفتر کھول دیا ہے۔ جو ایران، مصر اور دوسرے ممالک اسلامیہ کا دہانہ ہے۔ انہوں نے ملتان میں ایک عظیم جلسہ کا اعلان کیا ہے جس میں ان کے نزدیک پچاس ہزار قادیانیوں کے جمع ہونے کا امکان ہے۔ جلسہ کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا میں پھیل کر قادیانی مسلک کی اشاعت کی جائے۔

انہوں نے اپنے چند افراد مصر وغیرہ بھیج کر انہیں عربی بول چال کا ماہر بنالیا ہے۔ اور بطور شو کے ان کی عربی تقریریں پبلک کے سامنے کراتے ہیں۔ تبلیغ کا نظم سامنے لاتے ہیں اور اپنی مساعی کی روداد پیش کرتے ہیں۔ اس طرح سے اہل حق اس باطل کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ادھر ان عربی دانوں کے ذریعہ ممالک اسلامیہ میں اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

دوسری طرف شیعوں نے ملک میں مختلف انداز سے شیعیت کا پروپیگنڈا کر رکھا ہے۔ جس سے سادہ لوح عوام شیعیت کا شکار ہو رہے ہیں اور اس طرح یہ فتنہ بھی فروغ پا رہا ہے۔

تیسرا فتنہ مغربیت یا آزادی اور بے قیدی کا ہے جس کے راستہ سے بے دینی اور بے حیائی کی تخم ریزی ہو رہی ہے۔ اس جماعت کے نزدیک سرے سے مذہب ہی کی اہمیت نہیں۔ مغربیت کے اس فتنہ سے الحاد اور بے دینی بڑھ رہی ہے۔ گو یہ فتنہ اس وقت پوری دنیا پر مسلط ہے۔ تاہم ہمیں اور جگہ سے بحث نہیں۔

فتنوں کا سدِ باب ...... ایک زمانہ میں ان فتنوں کا دارالعلوم نے سدِ باب کیا تھا اور آج بھی دارالعلوم ہی کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ذیل میں کمیونزم اور کیپٹل ازم وغیرہ کے سیاسی فتنے پھر سر ابھار رہے ہیں۔ جن کا سدِ باب علمائے حق کا کام ہے۔ میں نے تو وہاں کے علماء کو توجہ دلائی کہ اگر مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست ہو جائے تو دوسری اقوام کی حالت درست ہو جائے گی بلکہ اخلاق درست کر لئے جائیں تو پاکستان و ہندوستان دونوں کے درمیانی معاملات کی حالت بھی درست ہو سکتی ہے۔

ایک حدیث قدسی میں یہ فرمایا گیا ہے " حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں جب کسی قوم کی بدعملی پر ناخوش ہوتا ہوں تو دوسری اقوام کے دل میں اس بدعمل قوم کی طرف سے بغض و عداوت بٹھا دیتا ہوں اور وہ جلاد بن کر مجرم قوم پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ اور قتل و غارت کے ذریعہ اسے سزا دیتی ہیں۔ بس اگر تمہیں یہ سزا اور بے کسی اور مغلوبیت ناگوار ہے تو تم کسی قوم کو برا مت کہو۔ میرے ساتھ معاملہ درست کرو، میں اقوام کے قلوب میں پھر تمہاری محبت ڈال دوں گا"۔ اس لئے میں تو دوسری اقوام کی بدحالی کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہی عائد کرتا ہوں۔ اگر یہ قوم درست ہو جائے تو سب اقوام درست ہو جائیں۔

اصلاحی کاموں پر تقسیم ہند کے اثرات...... بہرحال جیسے عام دنیا اس وقت اصلاح طلب ہے اسی طرح پاکستان بھی دینی حیثیت سے کافی حد تک محتاج اصلاح ہے۔ جو علمائے حقانی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ملک کی تقسیم سے اصلاحی کاموں میں خصوصیت سے رکاوٹ پیش آ گئی ہے اور اصلاح کے راستے کچھ بند سے ہو گئے ہیں۔ طلباء کا ادھر سے آنا منقطع ہو گیا ہے اور دارالعلوم کا علمی فیضان وہاں پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔ دارالعلوم کی سعی پر حکومت ہند نے طلباء کے لئے راستہ کھول دیا ہے۔

اور اب حکومت پاکستان کے سامنے بھی دارالعلوم کی طرف سے درخواست پیش کی گئی ہے کہ وہ بھی طلبائے علم کے لئے ہندوستان آنے کے راستے کھول دے امید ہے کہ یہ سعی کامیاب ہو جائے گی۔ بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ نہ صرف وہاں سے طلبہ کی آمد پر ہی سے پابندی ہٹا لینے کی ضرورت ہے بلکہ یہاں سے وہاں مبلغین کی آمد و رفت کو بھی آزاد کر دیا جائے تو یہ دونوں ملکوں کے تعلقات کے لئے خیر سگالی کے وفود سے زیادہ مفید اور موثر ثابت ہوگا۔ کیونکہ مبلغین ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کریں گے اور اخلاق جس حد تک درست ہوں گے اور کردار جس حد تک کسی ملک کا اونچا ہو گا۔ اسی حد تک دوسرے ممالک اس سے مطمئن ہو کر اس کا اعتماد حاصل کر لیں گے۔

بڑی امید افزاء خوبی...... آج کل اخلاقی حالات کے بگڑ جانے سے ہی عموماً بگاڑ آیا ہوا ہے۔ ہاں! مگر جہاں عام دنیا کی حالت ہے وہاں دینی حیثیت سے یہ خرابیاں ہیں وہیں ایک بڑی امید افزاء خوبی بھی ہے جو اور جگہ کم پائی جاتی ہے اور وہ ہے طلب اصلاح اور حسن قبول یعنی وہاں پر ہر بڑے چھوٹے میں اصلاح کی طلب اور خواہش پائی جاتی ہے۔ مگر اصلاح کے لئے ہر قسم کے علماء کی ضرورت ہے۔ ایک خالی الذہن کے لئے خطابات سے سمجھا دینا کافی ہوگا۔ ایک عقلیت پسند کے لئے حکمت واستدلال کی ضرورت ہوگی اور ایک کٹ حجت کے لئے الزامی جوابات اور خود اس کے مسلمات سے اس پر حجت قائم کرنا ضروری ہوگا۔ قرآن نے ان ہی تین مقامات کی طرف اشارہ فرمایا کہ ﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ ① پس جیسے لوگ ہوں گے ویسی ہی زبان میں انہیں سمجھانا ہوگا۔ اس لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔

اعلان استغناء...... ہاں! پھر اسی کے ساتھ ساتھ ایک مصلح کو قلبی استغناء کی بھی حاجت ہے۔ اصلاح میں جس قدر بھی رکاوٹ یا تاثیر میں جتنی بھی روک ہوتی ہے وہ مصلح کی طمع سے ہوتی ہے۔ مخاطب پہلے یہ دیکھتا ہے کہ مصلح غرض مند تو نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی غرض مندی کا شبہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، اس لئے جہاں قلبی استغناء درکار ہے وہیں اعلان استغناء بھی ضروری ہے تا کہ اصلاح محض لوجہ اللہ ہونے سے قلوب پر اثر انداز ہو، گویا تبلیغ کی تاثیر کے لئے استغناء بالقصد ضروری ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام موعظت و اصلاح کے وقت خصوصیت سے اعلان استغناء فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ ﴿ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ

① پارہ: ۱۵، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۲۵۔

اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ ① اگر اس طرف سے طلباء آنے لگیں اور اس طرف سے مبلغین جانے لگیں تو دونوں حکومتوں کے کردار پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے جیسا کہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

دیانت عمل کی تاثیر..... تقریباً آٹھ سال ہوئے کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے جلسہ کی صدارت کے لئے میرا حیدرآباد سندھ جانا ہوا تھا، جلسہ کے بعد وہاں کے ہندوؤں نے ہم لوگوں کو چائے پر مدعو کرنا چاہا جس کو مان لیا گیا۔ عصر کے بعد موٹریں آئیں۔ شہر سے باہر ان کی کوٹھی پر پہنچے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا اس لئے طبیعت نماز کے لئے بے چین ہوئی۔ جس کو انہوں نے بھی محسوس کیا اور کہا کہ غالباً آپ لوگ نماز کی وجہ سے مضطرب ہیں تو مسجد یہاں سے ڈیڑھ میل دور ہے۔ مسجد تک جاتے جاتے نماز کا وقت جاتا رہے گا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو نماز ہمارے مکان ہی میں پڑھ لیجئے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ساری زمین ہمارے لئے مسجد ہے۔

اس قرارداد کے بعد کا منظر دیکھنے کے قابل تھا کہ وہ لوگ پانی وغیرہ لا رہے تھے سفید تولئے لا رہے تھے، چادریں بچھا رہے تھے۔ قبلہ کی سمت بھی انہوں نے تشخیص کر کے بتلائی۔ ہم نے اذان دی اور نماز ادا کی۔ اور وہ سب مرد، بچے، بڑے ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ جب ہم لوگ نماز اور معمولات سے فارغ ہو چکے تو وہ آگے آئے اور کہا کہ "ہماری قسمت ایسی کہاں تھی کہ ہمارے گھر پر بھگوان کا نام لیا جائے"

مجھے ان کے ان الفاظ کی قدر ہوئی اور میں نے کہا کہ یہ آپ کی نیکی کی بات ہے مگر عام طور سے تو لوگ نماز کے بارے میں اور مسجدوں کے معاملہ میں تعصب کا برتاؤ کرتے ہیں۔ مسجد اور باجہ وغیرہ کا جھگڑا روزانہ ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا جیسے آدمی ہوتے ہیں ویسا ہی ان کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمارے چڑانے کو نماز پڑھیں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں گے۔ بہر حال اگر مسلمان دیانت عمل کا مجسمہ بن جائیں تو خود بخود لوگوں کے دل میں کشش پیدا ہو جائے۔ غلط نمونہ پیش کر کے خود ہم نے لوگوں کو دین سے دور کر دیا ہے۔ گویا ہم مبلغ بننے کی بجائے تبلیغ دین کے حق میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا نمونہ عمل دیکھ کر لوگ کہتے ہیں کہ اگر اسلام کے یہی معنی ہیں تو ہمارا اسلام کو سلام ہے۔ بہر حال دارالعلوم اپنی بنیادوں کے لحاظ سے مصلح ہے اور لوگ اس کی اصلاحی مساعی سے اثر لیتے ہیں۔ اس وقت اسے اخلاقی اور دینی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ اصلاحی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

قدر دارالعلوم..... ہم کو دارالعلوم کی قدر یہاں بیٹھ کر محسوس نہیں ہوتی۔ دارالعلوم سے باہر جا کر قدر ہوتی ہے کہ وہ کیا نعمت ہے! جب مجھے واپسی کی راہ کچھ مسدود سی نظر آئی تو اس وقت دارالعلوم کی فضا ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے لگی کیونکہ یہ ماحول ہر جگہ میسر نہیں۔

مجھے عیدالاضحی کراچی ہی میں پڑھنے کی نوبت آئی اور ظاہر ہے کہ چودہ لاکھ کے شہر میں عید کے اجتماع کا منظر کتنا اعلیٰ ہوتا ہوگا۔ لاکھوں کے مجمع میں ایک جگہ عید پڑھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے تلاش طلباء وعلماء کے ماحول کی

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۰۹۔

رہی۔ اور میں اس عید کا متلاشی تھا جس میں دارالعلوم جیسا ماحول ہو۔ میں نے مولانا محمد صادق صاحب کے مدرسہ کے مجمع کے ساتھ نماز عید پڑھی کہ وہاں کا ماحول کچھ طلباء اور علماء کا تھا مگر پھر بھی کمال تسکین واطمینان حاصل نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگوں نے مدارات میں کمی نہیں کی۔ قدم قدم پر وسائل راحت تھے۔ پبلک نے مجھے دارالعلوم قائم کرنے کو کہا اور تین لاکھ کا فنڈ بھی پیش کیا۔ لوگ وہاں کے قیام کے لئے مضبوط دلائل بھی بیان کرتے تھے مگر اس کے باوجود قلبی رجحان اور وجدان دارالعلوم کے ماحول کا متلاشی تھا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تصرف...... میرے اصرار واپسی کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے قلب میں قیام سے توحش کی بنا در حقیقت حضرت شیخ مدنیؒ کا تصرف ہے جو وہاں بیٹھ کر وہ کر رہے ہیں۔ اور اس لئے آپ یہاں سے اکھڑ رہے ہیں۔ بہر حال میرا قلبی رخ کسی بھی وجہ سے ہو یہی تھا کہ میں حاضر ہوں۔ الحمدللہ کہ حاضری ہوگئی۔ اور آپ بزرگوں اور دوستوں کی زیارت کا حق تعالیٰ نے موقع میسر فرمادیا۔ پھر بھی وہاں کے بزرگوں اور دوستوں کی محبانہ مہمان نوازی اور غرباء پروری کے نقوش دل میں نقش رہیں گے۔ باقی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت کی حاضری حضرت شیخ کی ظاہری و باطنی توجہ بلکہ تصرف سے ہوئی اور دارالعلوم کی خدمت کا دوبارہ موقع ملا۔

قمیص عثمانی...... میرے محترم بھائی مولانا عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی نبیرۂ حضرت اقدس مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے اس خدمت دارالعلوم کو قمیص عثمانی سے تشبیہ دیتے ہوئے مجھے وہاں لکھا تھا کہ آپ کو اپنے ارادہ واختیار سے اس قمیص عثمانی کو نہ اتارنا چاہئے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ قمیص عثمانی کو اتارا نہیں ہے بلکہ تھوڑے وقفے کے لئے۔ جیسے غسل کے لئے کپڑے اتارے جاتے ہیں اور پھر پہن لئے جاتے ہیں۔ ایسے ہی میں نے برائے تطہیر کچھ وقفہ کے لئے یہ لباس اتار کر رکھا ہے۔ عنقریب پہن لیا جائے گا۔

جذبات تشکر...... آخر میں مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ آپ حضرات نے کل سے اب تک جن پرخلوص جذبات محبت کو ظاہر فرمایا اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں اور اس کو اپنے لئے وسیلہ نجات تصور کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کی توفیق مزید نصیب فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

امارتِ شرعیہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِیْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰی کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ)

روزِ مسرت...... بزرگانِ محترم! میرے لئے خصوصیت سے آج بہت ہی مسرت وخوشی کا دن ہے کہ اس مقدس مجمع میں کہ جس میں اس نواح کے امیرِ شریعت اور دوسرے بزرگان تشریف فرما ہیں۔ مجھے ان کی معیت کا بھی شرف حاصل ہوا ہے۔ اور ان کی برکات سے مستفیض ہونے کا بھی موقع ملا اور دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ ان کی رعیت ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اس لئے کہ امیرِ شریعت کے سامنے تو سب رعایا ہی ہوتی ہے وہ باہر کے ہوں یا اندر کے ہوں۔

بہر حال ایک رعایا کی حیثیت سے اپنے امیر کی خدمت میں حاضر ہونا ایک مستقل سعادت اور برکت ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس امارت کے سلسلہ میں چند حاسب عنانہ باتیں آپ کی خدمت میں گزارش کروں زیادہ دیر تک تو عرض نہیں کر سکوں گا اس لئے کہ کچھ تو علیل ہوں اور باعتبار علم کے قلیل ہوں اور اسی کے ساتھ ساتھ صبح سے دماغی کاوش کا بار بھی اوپر پڑا ہوا ہے جس وجہ سے تعب اور تکان بھی پیدا ہو گیا۔

معالجوں کی طرف سے بھی مجھے ہدایت ہے کہ عشاء کے بعد کسی جلسے میں تقریر کروں۔ اور نہ شرکت کروں لیکن بہر حال بزرگوں کا حکم ڈاکٹروں کے حکم سے زیادہ اونچا ہے کیونکہ ڈاکٹر معالج جسمانی ہیں اور یہ بزرگان دین معالج روحانی ہیں اور روح کو جسم پر قدرتی طور پر فضیلت حاصل ہے اس لئے معالجین روح کا حکم زیادہ واجب الاطاعت ہے بہ نسبت معالجینِ جسم کے۔ اس لئے تعمیل حکم کے طور پر بھی کچھ عرض کرنا ضروری تھا۔ مگر میں زیادہ

① پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹.

وقت نہیں لے سکوں گا صرف تھوڑی دیر چند طالب علمانہ باتیں مختصر طور پر گزارش کروں گا۔

اسلام کی بنیاد...... اسلام وسیع ترین اور عالمگیر دین ہے اور ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے۔ اور اس کی عمارت پانچ شعبوں پر قائم ہے۔ گویا اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں کہ جس پر اسلام کی تعمیر کھڑی ہے۔

1 ...... اعتقادات 2 ...... عبادات 3 ...... اخلاقیات 4 ...... معاملات...... 5 اجتماعیات

عقائد...... پہلا شعبہ اعتقادات کا ہے کہ آدمی کے عقائد درست ہونے چاہئیں اور عقیدے کی تین بنیادیں ہیں۔

1 مبداء 2 معاد 3 نبوت مبداء کے معنی یہ ہیں کہ ہم کہاں سے کہاں آئے ہیں۔ ہماری اصل کیا ہے۔ ہم کس طرح دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں۔ معاد کا حاصل یہ ہے کہ ہم یہ عمر گزار کر جائیں گے کہاں؟ اور نبوت کا حاصل یہ ہے کہ اس آمد وشد کے درمیان ہم زندگی کیسے گزاریں۔ یہ تین بنیادیں ہوئیں عقائد کی۔ مبداء ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے کہ جس سے ہمیں ہستی ملی ہے اور وجود ملا ہے۔ اور وہ ہمارے وجود کی اصل ہے اور معاد بھی وہی ہے کہ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تو مبداء بھی وہی ہے۔ اور معاد بھی وہی ہے۔ اور ہدایت کرنے والا بھی وہی ہے۔ کہ ہم زندگی کیسے گزاریں۔ تو سب سے پہلی چیز عقائد ہے کہ جس سے قلب انسانی صحیح ہو جائے۔ کیونکہ تمام اعمال عقائد ہی کے تابع ہیں۔ عقیدہ اگر غلط ہے تو عمل خود بخود غلط ہو جائے گا خواہ آدمی اچھی نیت ہی سے کرے۔ اگر عقیدہ درست ہے تو سارے اعمال خود بخود صحیح ہو جائیں گے۔ جب اعمال صحیح ہوں گے تو احوال بھی صحیح ہوں گے۔ اور جب احوال صحیح ہوں گے تو انجام بھی صحیح ہو جائے گا۔ تو ابتداء سے انتہاء تک انسان عقائد کی صحت کی بناء پر صحیح ہوگا۔ اس لئے سب سے بڑی بنیادی چیز اسلام میں عقائد کا درجہ ہے جو قلب کے اندر پیوست کیا جاتا ہے۔

عبادات...... دوسرا شعبہ عبادات کا ہے کہ ان عقائد کے تحت اللہ تعالیٰ کو کس طرح سے یاد کیا جائے، عبادت کس طرح سے کی جائے۔ عبادت کے معنی ہیں غایت تذلل یعنی معبود کے سامنے ایسے ذلت اختیار کر لینا جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی عزت لامحدود ہے۔ کوئی عزت کا درجہ نہیں جو اس کی ذات میں موجود نہ ہو۔ اس کے یہاں عزت کامل ہے اس لئے اس کے یہاں ذلت کامل یعنی ایسی ذلت پیش کرنی چاہئے کہ اس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے کہ آدمی اس کے سامنے ذلیل نہ ہو جائے۔

تو عبادت کا مطلب یہ ہے کہ اس عزیز مطلق کے سامنے ذلیل مطلق بن جائے۔ اس کی عزت کسی حد تک رکی ہوئی نہیں۔ ہماری ذلت کسی حد پر رکی ہوئی نہ ہو اور یہ غایت تذلل اور انتہائی ذلت اللہ کے سامنے اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ آدمی میں انتہائی محتاجگی ہو کیونکہ غنی کسی کے سامنے نہیں جھک سکتا:

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج   احتیاج است احتیاج است و احتیاج

جو شیر دل کو بھی لومڑی بنا دے وہ حاجت مندی ہے۔ غنا کے ساتھ کوئی کسی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ حق

تعالیٰ شانہ غنی مطلق ہیں، رفیع المرتبت ہیں، انسان ان کے سامنے ذلیل مطلق ہے اس کا کام ان کے سامنے ہر وقت جھکنا ہے کہ دل سے بھی جھکے، روح سے بھی جھکے، بدن سے بھی جھکے، قول سے بھی جھکے، فعل سے بھی جھکے ہر اعتبار سے اپنی ذلت و پستی کا اظہار کر دے۔ یہ ہے عبادت۔ عبادت کے معنی فقط نماز روزہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ قانون اسلام کے تحت ذلت کے ساتھ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ وہ اگر کہیں کہ گھر میں فلاں کام کرو تو یہ ہمارا فرض ہے کہ اسی طرح کریں۔ اگر وہ فرمائیں کہ مسجد میں جاؤ تو ہمارا فرض ہے کہ مسجد میں جائیں اگر وہ کہیں کہ تخت سلطان پر امیر شریعت بن کر بیٹھ جاؤ۔ ہمارا فرض ہے کہ امیر بن کر بیٹھ جائیں اگر وہ کہیں کہ غلام بن جاؤ، فلاں کے تو ہم غلام بننے کو تیار ہوں۔ تو اظہار ذلت کے یہ معنی ہیں کہ عمل سے قول سے، فعل سے، حال سے، چال سے ہر اعتبار سے آدمی اپنی پستی، اپنی احتیاج اور اپنی حاجت مندی کا اظہار کر دے۔ اسی کا نام عبادت ہے۔

اخلاقیات..... تیسرا شعبہ اخلاقیات کا ہے۔ عبادات اور عقیدہ درست نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ قلب کی حالت درست نہ ہو اور قلب محل اخلاقیات ہے۔ لہٰذا جب تک اخلاق انسانی صحیح نہ ہوں گے یعنی جب تک صبر نہ پیدا ہو، حیا نہ پیدا ہو، شکر نہ پیدا ہو، سخاوت نہ پیدا ہو، شجاعت نہ پیدا ہو، توکل علی اللہ نہ پیدا ہو۔ انابت الی اللہ نہ پیدا ہو۔ یہ ملکات جب تک ذہن میں نہ جمیں گے عقیدہ درست نہ ہوگا۔ عقیدہ درست نہ ہوگا تو عمل درست نہ ہوگا۔ اور عبادت درست نہ ہوگی۔ تو مدار آ کر ٹھہر جاتا ہے اخلاق پر۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاق کا ہے۔ لہٰذا اخلاق کی تربیت کی جائے۔ اخلاق کو بلندی پر پہنچایا جائے۔ اور انسان کو جبلی طور پر جو بداخلاقیوں کے روگ لگے ہوئے ہیں یہ دور کر کے پاکیزہ اخلاق سے بدلا جائے۔ جبلی طور پر انسان میں حرص بھی ہے۔ بخل بھی ہے۔ حسد بھی ہے۔ کبر و رعونت بھی ہے۔ یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کو مخلوق کے آگے ذلیل کرتی ہیں۔ ان کو نکال کر کبر کی بجائے تواضع پیدا کی جائے۔ بخل کی بجائے سخاوت پیدا کی جائے۔ خود غرضی کی بجائے ایثار پیدا کیا جائے ہوس رانی کی بجائے قناعت کا جذبہ پیدا کیا جائے جب یہ اخلاق درست ہوں گے تو عقائد درست ہوں گے پھر اعمال درست ہوں گے اور جب اعمال درست ہوں گے تو انجام درست ہوگا۔ پھر زندگی بھی صحیح ہو جائے گی اور موت بھی صحیح ہو جائے گی۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاقیات کا ہے۔

معاملات..... چوتھا شعبہ معاملات کا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کس طرح کا برتاؤ کریں۔ معاملات میں نزاع ہو، جھگڑا ہو، اس کا سلجھاؤ کس طرح سے کریں۔ ہم ایک دوسرے سے جھگڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کا فیصلہ کس طرح سے کریں، لین دین کس طرح سے ہو، قرض ادھار کے طریقے کیا ہوں گے، امانت رکھنے کے طریقے کیا ہیں اور ادائیگی کے طریقے کیا ہیں، اجارہ کے احکام کیا ہیں، اور رہن کے احکامات کیا ہیں تو معاملات کا شعبہ بھی اہم شعبہ ہے جس میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے واسطہ پڑتا ہے، اگر دیانت نہ ہو، امانت نہ ہو۔ لازمی طور پر دنیا میں فساد پیدا ہوگا اور جب فساد پیدا ہوگا تو بدامنی پیدا ہوگی، جب بدامنی پیدا ہوگی تو نہ جان کی خیر رہے گی نہ

مال کی خیر رہے گی۔ ہر شخص غیر مطمئن رہے گا۔ پریشان رہے گا۔ اضطراب اور بے چینی قلب کا جوہر بن کر رہ جائے گا۔ اسی لئے معاملات کی صحت اور خوبی یہ بھی اسلام کا اہم ترین شعبہ ہے۔

اجتماعیات...... پانچویں چیز اپنی قومیت کو سنبھالنا ہے، یعنی اجتماعی حالت کو درست کرنا ہے قوم میں اجتماعی طور پر ایک تنظیم ہو، قوم ایک نظم کے تحت زندگی گزارے، یہ امنی نہ ہو کہ ایک کا رخ ادھر کو ہو اور ایک کا رخ ادھر کو ہو، ایک مشرق کو جا رہا ہے اور ایک مغرب کو بھاگ رہا ہے۔ یا ایک ادھر سے آ رہا اور ایک ادھر سے دونوں ٹکرائیں آپس میں اور جھگڑیں اور خونم خون ہوں، بلکہ ایک نظم کے اندر پوری قوم جڑی ہوئی ہو۔ ایک نظام کے تحت چل رہی ہو۔ ہر ہر چیز اپنے محل کے اوپر قائم ہو۔

یہ پانچ شعبے ہو گئے ہیں۔ اعتقادات، عبادات، اخلاقیات، معاملات اور اجتماعیات۔ ان پانچ شعبوں کو علماء کے ایک ایک طبقہ نے سنبھالا ہے اور لاکھوں علماء ایک ایک شعبے کو سنبھالنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے سنبھالا اور اپنا فرض منصبی پورا کیا۔

متکلمین اسلام کی خدمات...... اعتقادات کو سنبھالنے اور ان کو ثابت کرنے کے لئے حکماء اسلام کا ایک طبقہ کھڑا ہوا جنہیں متکلمین کہتے ہیں، انہوں نے عقلی اور نقلی انداز سے عقائد کو حق ثابت کیا، استدلالات سے عقائد کا فطری ہونا ثابت کیا سب عقیدے فطرت کے مطابق ہیں، کوئی عقیدہ فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ عقل کے خلاف ہو اور اسلام میں اس کو زبردستی ٹھونس دیا گیا ہو بلکہ فطرت تقاضہ کرتی ہے کہ یہی عقیدہ ہونا چاہئے۔

فطرتیں مطمئن ہیں کہ یہی عقیدہ درست ہے۔ ان حکماء اسلام نے حسی، عقلی، نقلی، فطری۔ ہر طریقے سے ثابت کر دکھایا، ایک ایک عقیدے کے لئے ہزار ہا دلائل قائم کئے اور اس سلسلے میں بڑی بڑی، ضخیم ضخیم، عظیم عظیم کتابیں لکھی گئیں اور حجت و برہان سے عقائد مضبوط ہو گئے۔ اس لئے کوئی قوم کامیاب نہیں ہو سکتی ہے نہ مسلمانوں کے سامنے اور ان کے عقائد کے سامنے، اللہ جزائے خیر دے متکلمین حکماء اسلام کو کہ انہوں نے اس سلسلہ میں خدمت کی اور اس دائرہ اعتقادات کو سنبھالا اور ثابت کر دکھایا کہ حق یہی ہے جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

ائمۂ اجتہاد کی خدمات...... دوسرا شعبہ عبادات کا ہے، اس کو سنبھالا ہے فقہائے اسلام نے اور ائمہ مجتہدین نے اور پھر ان کے پیچھے دوسرے ائمہ کھڑے ہوئے اور فقہ کے بڑے بڑے اکابر نے اس کو مدون کیا اور مرتب کیا۔ باب وار فصل وار مسائل مقرر کئے، اپنی ترتیب کے ساتھ مسائل کو ترتیب دیا، ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھی گئیں مستقل ایک فن بن گیا جس کے اندر ہزار ہا فروع داخل ہوئیں، ائمہ اجتہاد نے اپنے تفقہ کے اصول سے قرآن و حدیث سے مسائل کا استخراج کیا، خود مسائل کو نکال کر پیش کیا اگر کہیں اصول فقہ میں اختلاف ہوا تو فروعی مسائل میں بھی اختلاف ہوا مگر سب ائمہ ہیں دین حق پر ہیں اور حق ان میں دائر و سائر ہے۔

اگر امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک و امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ میں اختلافات ہیں تو وہ حق و باطل

کے نہیں کہ ایک سمت حق ہو اور ایک سمت باطل ہو، ایسا ہرگز نہیں بلکہ وہ خطاء اور صواب کے اختلافات ہیں کہ ایک طرف صواب ہے اور ایک طرف خطاء، لیکن ساتھ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ یہ صواب ہے مگر احتمال ہے کہ خطا بھی ہو اور یہ خطا ہے مگر احتمال ہے کہ صواب بھی ہو۔ اسی لئے حق دائر وسائر ہے یہ تمام ائمہ کے اندر اور تمام کے تمام نجوم ہدایت ہیں جس کا دامن آپ تھام لیں گے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی، اگر کوئی شافعی المسلک ہے تو وہ بھی نجات یافتہ ہے۔ اگر کوئی حنفی ہے تو وہ بھی نجات کے مراتب طے کر رہا ہے اور اگر کوئی مالکی یا حنبلی ہے تو وہ بھی نجات کے راستے پر جا رہا ہے اور سب اللہ ورسول کی طرف دوڑ رہے ہیں، اس لئے کہ بنیاد سب کی ایک ہے وہ ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ البتہ استخراج مسائل میں اصول الگ الگ ہو گئے ہیں۔

اختلافِ مشرب...... اور یہ خود شریعت کی عین حکمت ہے اس لئے کہ ائمہ کے اختلاف سے امت کے اندر آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اتنے راستے نکل آئے ہیں کہ جو جس ذوق کا ہے اسی راستے پر چل کر حق کو پا سکتا ہے، اگر ایک عظیم دریا ہو اور بہت بڑا لمبا چوڑا اتھاہ سمندر ہو لیکن پانی پینے کا گھاٹ ایک ہی ہو تو لوگ ہزاروں میل سے سفر کر کے آئیں گے جب ہی پانی مل سکتا ہے ورنہ وہ پانی سے محروم رہیں گے لیکن دریا اگر ایسا ہے کہ ہزاروں مشرب اور گھاٹ موجود ہیں جس سمت سے آئے وہی پانی، وہی مزہ، وہی ذائقہ ہے۔ صرف سمت بدلی ہوئی ہے۔ ایک مشرق کی طرف ہے ایک مغرب کی طرف ہے تو کچھ آسانی ہوگی کہ دریا بڑا ہے اور مشرب اور گھاٹ بہت ہیں۔ ہر طرف سے پانی مل سکتا ہے تو اسلام ایک اتھاہ سمندر ہے اس کے مشارب بہت ہیں۔ ایک مشرب حنفی ہے اور ایک مشرب مالکی ہے۔ ایک مشرب حنبلی ہے اور ایک مشرب شافعی ہے۔ اور یہ چار ائمہ وہ ہیں کہ حسن تدبیر کہئے یا تقدیر خداوندی کہئے کہ یہ چار مذہب دنیا کے اندر رائج ہو گئے۔ ورنہ ائمہ اجتہاد سینکڑوں پیدا ہوئے امام بخاریؒ خود مجتہد ہیں۔ عبداللہ بن مبارکؒ خود مجتہد ہیں۔ حماد بن سلمہؒ خود مجتہد ہیں۔ سفیان ثوریؒ مجتہد ہیں۔ سفیان بن عیینہؒ مجتہد ہیں۔ ہر ایک کی فقہ الگ الگ ہے۔ لیکن یہ خدا کی طرف سے بات ہے کہ بقیہ فقہیں مندرس ہو گئیں اور باقی نہ رہے اور یہ چار فقہیں دنیا کے اندر رائج ہو گئیں۔

فقہائے اسلام اور ان کا تادب...... امام ابوحنیفہؒ کوفہ میں پیدا ہوئے خراسان کی طرف ان کا فقہ چلا تو پورا خراسان حنفی پورا افغانستان حنفی، ہندوستان کا اکثر حصہ حنفی، پورا ترکستان حنفی، جہاں جہاں ان کا فقہ پھیلا وہاں وہاں حنفی ہو گئے۔ چونکہ اللہ ورسول کی محبت انتہا پر تھی اسی لئے ادب بھی بے حد تھا۔ چنانچہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حج کو تشریف لے گئے، مدینہ منورہ روضہ اقدس پر بھی حاضری دی تو سات دن کے بعد واپسی کا ارادہ کیا مگر تمام اہل مدینہ مصر ہو گئے کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔ جب سارے مصر ہو گئے تو ٹھہر گئے، دس دن ہو گئے تو پھر اجازت چاہی۔ مگر اہل مدینہ نے پھر گھیرا ڈال لیا کہ ہم ابھی اجازت نہیں دیں گے، گیارہویں دن آپ نے فرمایا کہ اب مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ اس پر اہل مدینہ نے معلوم کیا کہ نا طاقتی کی کیا بات ہے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ

جب سے مدینہ میں آئے ہیں۔ استنجا نہیں فرمایا ہے۔ نہ پیشاب نہ پاخانہ کہ مناسب نہیں۔ مدینہ کی ارض مقدس کو نجاست سے آلودہ کرنا اس لئے اب میرے اندر طاقت نہیں تو پھر اہل مدینہ نے خود باعزت واحترام رخصت کیا۔

یہ تھا ائمہ کا ادب واحترام کہ جتنی محبت غالب تھی ان حضرات میں اتنا ہی ادب واحترام تھا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ...... آپ کی پیدائش ہوئی مصر میں مقام غزا میں، ابتدائی زمانہ مصر میں گزرا اور عمر کا اکثر حصہ حجاز میں گزرا اور عمر کا آخری حصہ بھی مصر میں گزرا۔ مصر تقریباً سب کا سب شافعی المسلک ہے۔ حجاز میں بھی تقریباً سب فقہ شافعی پر چل رہے ہیں۔ محبت وادب میں ان کا بھی وہی حال تھا۔ جو دیگر ائمہ کا ہے۔ خوف و خشیت غالب اور تقویٰ کی اونچے درجے کا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ...... امام مالک امام دارالہجرہ کے لقب سے ملقب ہیں۔ مدینہ سے ان کو شغف تھا اور مدینہ شہر میں کبھی جوتے پہن کر نہ چلے، اس لئے کہ معلوم نہیں کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک پڑا ہو اور وہاں میرا جوتا گزرے اور مدینہ منورہ میں کبھی پاخانہ پیشاب بھی نہیں کیا بلکہ اس کے لئے مدینہ منورہ سے کئی میل دور نکل جاتے تھے۔ یہ ادب تھا اور تمام ائمہ میں اسی طرح سے ادب کی انتہا تھی۔ امام مالکؒ نے مدینہ منورہ کو ہی اپنا وطن قرار دیا اور وہیں ہجرت فرمائی۔ ان کی تمنا یہ تھی کہ مجھے مدینہ کی زمین قبول کرلے اور میں وہیں دفن ہو جاؤں۔ نفلی حج بھی نہیں کرتے تھے اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں باہر میری وفات نہ ہو جائے اور میں مدینہ کی زمین سے الگ نہ ہو جاؤں۔

امام مالک نے ایک روز خواب دیکھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار مبارک قائم ہے اور امام مالک حاضر ہیں عرض کیا یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ مدینہ کی زمین مجھے قبول کرلے اور مجھے معلوم ہو جائے کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں۔ سال ہے یا دو سال ہیں تا کہ مجھے اطمینان ہو جائے اور میں عمرہ کر آؤں اور حج کر آؤں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے ہاتھ اٹھایا کہ پانچوں انگلیاں کھلی ہوئی ہیں۔ اب امام مالک حیران ہیں کہ پانچ انگلیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھائی ہیں تو آیا یہ مطلب ہے کہ پانچ دن باقی ہیں میری عمر کے۔ یا پانچ مہینے یا پانچ برس ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ امام مالک کے ہم عصر امام محمد بن سیرین ہیں جو تعبیر خواب کے امام ہیں اور خواب کی تعبیر پر انہوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ جلیل القدر امام ہیں اور ایسی تعبیر دیتے تھے کہ ہاتھ کے ہاتھ تعبیر واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ ان کو یہ مناسب تعبیر سے تھی۔ اس قسم کے ان کے بہت سے واقعات ہیں۔ تو امام مالک نے ایک شخص سے کہا کہ تم جا کر ابن سیرین سے میرا خواب بیان کرو مگر میرا نام مت لینا۔ یہ کہنا کہ مدینہ میں رہنے والے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا ہے۔ اس کی تعبیر کیا ہے۔

چنانچہ وہ شخص حاضر ہوا اور اس نے ابن سیرین سے کہا کہ مدینے کے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا دیا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ دن مراد ہیں یا پانچ مہینے یا پانچ برس مراد ہیں؟ ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب تو

بہت بڑا عالم دیکھ سکتا ہے۔ جاہل کا کام نہیں کہ اس قسم کا خواب دیکھے اور نہ جاہل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ جواب دے سکتے ہیں۔ یہ جواب تو بڑے عالم کو ہی دے سکتے ہیں۔ اور مدینہ میں اس وقت امام مالک سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ تو کہیں یہ خواب امام مالک نے تو نہیں دیکھا؟ اب وہ شخص خاموش کیونکہ اسے تو روک دیا گیا تھا کہ میرا نام مت لینا، اس نے کہا کہ اچھا مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان سے اجازت لے آؤں۔ فرمایا ہاں اجازت لے کر آ داؤ۔ پھر ہم خواب کی تعبیر بتلائیں گے۔ وہ گیا اور جا کر عرض کیا کہ حضرت! وہ تو پہچان گئے کہ یہ خواب دیکھنے والے آپ ہیں اور نام بھی لے دیا مگر یہ کہا کہ پوچھ کر آ جاؤ پھر تعبیر بتاؤں گا۔ فرمایا اچھا جاؤ میرا نام لے دینا کہ مالک بن انس نے یہ خواب دیکھا ہے۔

اس شخص نے جا کر عرض کیا کہ حضرت! امام مالک نے ہی یہ خواب دیکھا ہے ابن سیرین نے فرمایا کہ ہاں امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرے کی مجال نہیں کہ وہ یہ خواب دیکھے فرمایا کہ: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں اٹھائیں اس سے نہ پانچ دن مراد ہیں نہ پانچ مہینے نہ پانچ برس مراد ہیں بلکہ اشارہ ہے کہ اس طرف کہ ﴿فِيْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ﴾ ① یعنی پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی نہیں ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ ② کسی کو پتہ نہیں کہ میرا انتقال کس زمین پر ہوگا اور میں کہاں دفن ہوں گا اور کیا وقت ہے میرے انتقال کا۔ قرآن کریم کے اندر فرمایا گیا کہ اصول غیب کے پانچ ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا فرمایا گیا ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ﴾۔ ③ اس کے نظام کو صرف اللہ جانتا ہے قیامت کب آئے گی۔ کسی کو پتہ نہیں حالانکہ قیامت کا عقیدہ قطعی ہے، قرآن سے ثابت ہے ہر مسلمان کا ایمان ہے مگر وقت کا پتہ کسی کو نہیں حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پتہ نہیں۔ چنانچہ جبرئیل امین نے آپؐ سے پوچھا مَتَى السَّاعَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: "مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ" ④ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بارے میں سوال کرنے والے سے زیادہ مجھے علم نہیں ہے۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے کہ قیامت آئے گی مگر یہ مجھے معلوم نہیں کہ کب آئے گی۔ یہ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ تو امام ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب امام مالک ہی دیکھ سکتے تھے، خواب بھی علمی ہے جواب بھی علمی ہے اور حدیث کی طرف اشارہ ہے، امام مالک ہی اس کے مخاطب بن سکتے ہیں۔ ابن سیرین نے اس آدمی سے فرمایا کہ امام مالک سے کہہ دینا کہ حضورؐ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ موت کہاں آئے گی کس زمین میں آئے گی۔ اس کا علم ان پانچ چیزوں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴۔ ③ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴۔
④ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل النبی ﷺ، ج: ۱، ص: ۸۷، رقم: ۴۸۔

امام مالک یہ جواب سن کر مطمئن ہو گئے اور پھر گھر سے نہیں نکلے یہاں تک کہ وفات ہو گئی اور مدینہ کی زمین نے قبول کیا اور جنت البقیع میں مزار ہے جو ہر مسلمان کے لئے زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ تو بہر حال امام مالک امام دار الہجرہ ہیں اور ان کا زیادہ تر فقہ مغربی ممالک میں پھیلا ہوا ہے جو عرب کے مغربی حصے ہیں ان میں زیادہ تر مالکی ہی آباد ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ...... امام احمد بن حنبل کا قیام نجد میں رہا ہے۔ اسی لئے نجد اور یمن کے لوگ بکثرت حنبلی ہیں اور فقہ حنبلی پر عمل پیرا ہیں۔

احسانِ عظیم...... تمام ائمہ برحق ہیں جس کا دامن تھام لوگے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی یہ سب حضرات حقانی ہیں۔ ان بزرگوں نے اپنے اصولِ فقہ اور اپنے اجتہاد سے کتاب وسنت سے مسائل اخذ کئے اور مسائل نکال کر دین کو باغ و بہار بنا دیا اور ایک ایک قانون کی صورت میں فقہ کو مرتب کیا۔ جن کے ابواب الگ الگ ہیں۔ باب الافاضات، باب المعاملات، باب المساقات، باب المزارعۃ، باب الاراضی وغیرہ۔ سارے مسائل ان ابواب کے نیچے جمع ہیں۔ ساری چیزیں استخراج کر کے جمع کر دی ہیں۔ ان کا بھی امت پر احسان عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ان کے مقابر کو نور سے منور فرما دے اگر یہ استخراج نہ کرتے تو اتنی جزئیات ہمارے پاس فقہ میں موجود نہ ہوتیں۔ بڑی دقت اور دشواری پیش آتی۔

عرفاءِ اسلام کی خدمات...... عرفاء اسلام جن کا دوسرا نام صوفیاء کرام ہے۔ ان حضرات نے اخلاقیات کو سنبھالا ہے اس طرح پر کہ بال کی کھال نکال کر انسانوں کے سامنے پیش کر دی۔ روح کی حکمت بیان کی اور بتایا کہ نفس میں اتنی مکاریاں ہیں ان کا توڑ یہ ہے۔ کہ اگر نفس میں یہ کید پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے اور نفس میں یہ خواہش پیدا ہو تو اس کا دفعیہ یہ ہے۔ اور کوئی رغبت اور تمنا پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے۔ یہ ان حضرات صوفیاء ہی کا طفیل ہے کہ حکمت قلب کی انہوں نے تعلیم دی اور انہوں نے دلوں کو منور کیا اخلاق سے اور ان ہی اخلاق کے ذریعہ تزکیہ نفس کیا اور انسان کو انسان بنایا۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَآءِ

اُمراءِ اسلام کی خدمات...... اُمراء اسلام انہوں نے شعبہ معاملات کو سنبھالا۔ لین دین اور جھگڑوں کے فیصلوں پر امراء اسلام مقرر ہوئے، دنیا بھر کے جھگڑے نمٹائے۔ لوگوں کے مقدمات فیصل کئے، فوجداری کے الگ دیوانی کے الگ ہر ہر دائرے کے مقدمات سنبھالے اور مستقل کتابیں لکھیں گئیں، حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب ہے ''السیاسۃ الشرعیۃ'' اور اسی طرح بہت سے ائمہ علوم نے کتابیں لکھیں کسی نے سیاست کے اصول واضح کئے ہیں، فصل خصومات اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے اس لئے ان امراء نے بہت اونچا کام کیا ہے کہ اس شعبہ کے حقائق کو واضح کیا ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَآءِ

خُلفاءِ اسلام کی خدمات...... اس پانچویں شعبہ کو سنبھالا ہے خلفاء اسلام نے جیسے صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ وغیرہ یہ حضرات درحقیقت ذمہ دار تھے ملک کے نظام کے تنظیم ملت اور تنظیم امت کے ان حضرات نے پوری امت

کو اور مغرب و مشرق کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا کہ نہ آپس میں لڑیں نہ جھگڑیں نہ تعصبات برتیں نہ آپس میں گالم گلوچ کریں نہ سب و شتم کریں۔ اگر کسی کو شبہ ہو تو محبت سے پیش کر دیں، دوسرا محبت سے جواب دے۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو اسے معذور سمجھے اور یہ خیال کرے کہ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔ دوسرا حق پر ہو۔ یہ کہنا کہ میں ہی حق پر ہوں، دوسرا غلطی پر ہے۔ رائے و ہی کے معاملہ میں بالکل غلط چیز ہے۔

خلفاء کیلئے طریق عمل ...... سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے اپنے ایک خلیفہ کو خلافت عنایت فرمائی اس زمانے کے دستور کے مطابق پگڑی باندھی اور کچھ وصیتیں کیں اور کہہ دیا کہ تم میری طرف سے نائب اور خلیفہ ہو جا کر لوگوں کی تربیت کرو، اصلاح کرو ان خلیفہ نے رخصت کے وقت عرض کیا کہ حضرت! کچھ نصیحت فرمائیے تا کہ میں اس نصیحت پر کاربند رہوں۔ حضرت نے دو باتوں کی نصیحت فرمائی اور فرمایا کہ: نہ تو نبوت کا دعویٰ کرنا اور نہ خدائی کا دعویٰ کرنا۔

خلیفہ یہ سن کر حیران و پریشان ہوئے کہ حضرت آپ کا خادم غلام برسوں آپ کی صحبت میں رہا کیا مجھ سے یہ ممکن ہے کہ میں خدائی کا دعویٰ کروں۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا غلام ہو وہ کب نبوت کا دعویٰ کرے گا؟ تو حضرت نے یہ کیسی نصیحت فرمائی۔ نصیحت فرماتے کہ بھائی عبادت میں ثابت قدم رہنا اخلاق کی حفاظت کرنا مخلوق کی اصلاح کرنا اور یہ کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا یہ تو ہم لوگوں سے ممکن ہی نہیں اس نصیحت سے کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی فرمایا کہ اس کے معنی سمجھ لو پھر بات سمجھ میں آ جائے گی۔

فرمایا: کہ خدا کی ذات وہ ہے کہ جو کہہ دے وہ اٹل ہو۔ اگر وہ چاہے کہ زمین بنے تو زمین بن کر رہے۔ ناممکن ہے کہ نہ بنے۔ ارادہ خداوندی پر مراد کا مرتب ہونا قطعی اور لازمی ہے یہ ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ ارادہ فرمائیں اور وہ پورا نہ ہو وہ تو قادر مطلق ہیں۔ ﴿اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ ① اگر وہ ارادہ کرے کہ جہان بنے تو اسے محنت کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اسباب فراہم کریں، وہ اسباب کے محتاج نہیں۔ اسباب کے تو وہ خالق ہیں وہاں تو منشاء ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے تو اللہ کی ذات وہ ہے کہ جو وہ ارادہ کرے اور کہہ دے وہ اٹل ہو ٹلنے والی چیز نہ ہو۔

اور دعویٰ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ جو فرما دے وہ حق ہو۔ یوں ممکن ہی نہیں کہ نبی کی زبان سے کوئی ناحق چیز نکلے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے وہ حق ہوگا اور جو کر کے دکھائیں گے وہ بھی حق ہوگا۔ ناحق کا وجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ نبی جو کہے گا وہ حق ہوگا اور اس کے خلاف باطل ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کبھی خلاف حق نہیں ہو سکتی ہے، اگر تم نے جا کر یہ کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اور میری رائے اتنی حق ہے کہ دوسرا سامنے نہیں آ سکتا۔ تو یہ درپردہ نبوت کا دعویٰ ہوگا۔ میں تم کو اسی کی

① پارہ: ۲۳ سورۃ یٰسٓ، الآیۃ: ۸۲۔

نصیحت کرتا ہوں کہ یہ دعویٰ نہ کرنا۔ نبوت کا دعویٰ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم یوں کہو کہ میں نبی ہوں بلکہ اپنے اندر خاص وہ شان پیدا کر کے جو نبی کے اندر ہوتی ہے یوں کہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اس کے خلاف سب باطل ہے۔ اس چیز کا مدعی بننا در پردہ نبوت کا دعویٰ ہے۔ اور جو یوں کہے کہ میں نے ارادہ کرلیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ دنیا اُدھر کی اُدھر ہو جائے مخلوق کٹ جائے، خون بہہ جائے مگر یہ ہو۔ یہ در پردہ خدائی کا دعویٰ کرنا اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنے ارادے کو یوں مت سمجھنا کہ یہ اٹل ہے اور ہونا ہی چاہئے اور اس کے خلاف ممکن نہیں حالانکہ ہر چیز میں تمہارا اخلاف ممکن ہے، یہ تو ہوا دعویٰ خدائی کا حاصل۔ اور دعویٰ نبوت کا حاصل یہ کہ جو تمہاری زبان سے نکل جائے اس پر جمے رہو گویا کہ اس کے خلاف باطل ہے حالانکہ یہ ناممکن ہے وہ خدا کا مقام ہے اور یہ نبی کا مقام ہے۔

تو حضرت شیخ نے بڑے بلیغ پیرائے میں نصیحت فرمائی۔ ظاہر میں تو بڑی وحشت ناک نصیحت تھی کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا، نبوت کا دعویٰ مت کرنا، مگر جب معنی بیان کئے خدائی اور نبوت کے تو سمجھ میں آ گیا۔ معلوم ہوا کہ بہت سے آدمی در پردہ خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ جو جمود کرتے ہیں کہ وہی صحیح ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ وہ در پردہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ورنہ ان پر کوئی وحی یا الہام آ رہا ہے کہ وہی حق کہہ رہے ہیں دوسرا حق کہہ ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ مسئلہ جو قرآن و حدیث سے ثابت شدہ ہے اس کے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہی حق ہے اس کے خلاف ہرگز نہیں۔ ہاں اپنی رائے اور فکر کے بارے میں یہ کہیں کہ یہی حق ہے یہ نہیں ہونا چاہئے۔

ان جھگڑوں کا فیصلہ جب ہی ہو سکتا ہے جب امت کا نظام بنا ہوا ہو پھر اس قسم کے مدعی مغلوب ہو جائیں گے اور واقعی جو حقانی لوگ ہیں وہ غالب آ جائیں گے۔ یہ کام ہے نظام و تنظیم کا جب تک تنظیم نہ ہو، نظام نہ ہو اس وقت تک معاملہ نہیں سلجھ سکتا ہے۔ اس خدمت کو انجام دیا ہے خلفاء اسلام نے یہی در حقیقت ملک کے نظام اور تنظیم ملت کے ذمہ دار تھے۔ ان ہی حضرات نے امت کو جوڑا ہے اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہے۔

محافظین شئونِ نبوت کی تعظیم ضروری ہے...... خلفاء اسلام نے تنظیم ملت کی ذمہ داری قبول کی۔ امراء اسلام نے جھگڑوں اور فیصلوں کو نمٹایا عرفاء اسلام نے اخلاق درست کئے فقہاء اسلام نے عبادات کو صحیح کیا اور حکماء اسلام نے عقائد کو درست کیا۔ یہ پانچ جتھے اکابر اہل اللہ کے ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئے جنہوں نے ان پانچ شعبوں کو مضبوط کیا اور مضبوط بنیادوں پر قائم کیا اور امت کے سامنے پیش کیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے وہ یہ کہ ایک مقدمہ ہوا تفصیل اس میں بہت ہے مگر میں زیادہ تفصیل نہیں کر سکتا اسی لئے میں نے ایک لفظ کہا تھا کہ طالب علمانہ انداز میں کہوں گا یہ تو محض طالب علمانہ انداز ہے جو درس و تدریس میں طالب علموں کے سامنے کہا جا سکتا ہے اگرچہ آپ عرفی طور پر طالب علم نہیں ہیں مگر حقیقتاً تو طالب علم ہیں ورنہ جلسوں میں کیوں آتے؟ علم کی طلب ہی تو آپ کو لے کر آئی ہے۔ آپ بھی طالب علم ہیں اور میں بھی ایک طالب علم ہوں۔ اور آپ سے کم رتبہ ہوں درس و تدریس نہ سہی مگر کچھ تو سمجھ جائیں گے۔

میرا اندازہ تو یہ ہے کہ اتنی بات تو آپ سمجھ گئے ہوں گے جو میں نے کہی ہے کہ پانچ شعبے ہیں اور ان پانچوں شعبوں کو پانچ طبقات نے اٹھایا ہے اور وہ طبقے سب کے نزدیک معظم و مکرم ہیں اس لئے امراء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔ اسی طرف عرفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔ اور خلفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔ تو آدمی اپنی کس آنکھ کو پھوڑ لے؟ سب کو یکساں طور پر ہم کو اپنے سر پر رکھنا پڑے گا اسی بنا پر سب ہمارے نزدیک معظم و مکرم ہیں سب کے آگے گردن جھکانا ہمارا کام ہے۔

اگر کوئی شخص محدث کے آگے گردن جھکا دے۔ اور فقیہ کے خلاف کرے۔ وہ درحقیقت امتی ہونے کا ثبوت نہیں دے رہا ہے امت کا صحیح فرد وہ ہے کہ حکماء فقہاء صوفیاء عرفاء امراء خلفاء سب کو واجب التعظیم سمجھ کر سب کے آگے گردن جھکا دے۔ اس لئے کہ یہ پانچوں طبقے وہ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک شان کو سنبھالا ہے آپ کی ایک شان عقیدے کی ہے۔ ایک شان عبادت کی ہے ایک شان اخلاق کی ہے ایک شان معاملات کی ہے ایک شان خلافت و تنظیم ملت کی ہے۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ شانیں ہیں انہیں ٹکرانے کا یہ مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانوں میں تعارض پیدا کر رہے ہیں جو لوگ ان میں باہم ٹکر دے رہے ہیں یہ سوائے جہل کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ شؤن نبوت میں ٹکراؤ پیدا کرنا علم والے کا کام نہیں ہے اور نہ علم والے کا کام یہ ہے کہ طبقات امت میں ٹکراؤ پیدا کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے گردن جھکا دے اور ہر ایک تعظیم و تکریم ضروری سمجھے۔

نظم مسائل...... ایک دوسری بات اور سمجھ لیجئے وہ طالب علمانہ ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر طبقے نے کتاب و سنت سے نظم قائم کیا ہے یعنی اسلامی مسائل بے تکے نہیں ہیں ہر مسئلہ ایک لڑی کے اندر پرو دیا ہوا ہے اور مسائل کا ایک نظام ہے۔ اور پورے مسائل منظم ہو کر ایسے ہیں جیسے موتیوں کا ایک ہار ہوتا ہے اگر ایک موتی بیچ سے نکال دو تو ہار ناقص ہو جائے گا اور چونکہ ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے لہٰذا ہر شعبہ نہایت منظم ہے۔

تنظیم بلا امام ممکن نہیں...... آپ جانتے ہیں کہ نظم و تنظیم بغیر امام کے نہیں ہوتی مثلاً اگر تسبیح میں ایک ہزار دانے ہیں مگر امام نہ ہو جسے الفقد کہتے ہیں۔ وہ ایک لمبا دانہ ہوتا ہے تسبیح کے درمیان وہ اگر بیچ میں نہ ہو تو وہ تسبیح نہ ہوگی بلکہ مالا کہلائے گی۔ اگر تسبیح ہی بنانی ہے تو ایک گرہ بیچ میں ضرور ہونی چاہئے جسے آپ امام کہیں اسی سے سارے دانے جڑے ہوئے ہوں گے۔ وہ گرہ آپ اگر کھول دیں تو سارے دانے بکھر جائیں گے۔ جھاڑو میں ہزاروں سینکیں ہوتی ہیں ایک سینک کو آپ چٹکی سے مسل دیں تو وہ ٹوٹ جائے گی لیکن اگر بندھن باندھ کر جھاڑو بنا ئیں تو گھر کا کوڑا کباڑ آدھ گھنٹے میں صاف کر دیں گی۔ ایک سینک یہ کام نہیں کر سکتی ہے ساری سینکیں مل کر پھینکیں گی۔ اور ملنے کی شرط یہ ہے کہ ان میں بندھن بندھے وہی بندھن ان کا امام ہے اگر ان میں بندھن نہ ہو تو وہ منتشر ہو جائیں گی۔ بکھر جائیں گی کوڑا کباڑ تو کیا صاف کریں وہ خود کباڑ بن جائیں گی۔ لیکن اگر بندھن باندھ دیا اور ایک ڈورے کے تابع کر دیا ان کو تو سارے گھر

کا کوڑا صاف ہو جائے اور جھاڑو ایک جگہ رکھی ہوئی موزوں نظر آئے گی۔ گویا کہ صاف کرنے کا آلہ موجود ہے۔ جو بڑے سلیقہ سے رکھا ہوا ہے۔ بغیر امام و بندوبست کے نظام قائم نہیں ہوسکتا ہے۔

اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے ہر چیز میں اس نے نظم قائم کیا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھوں اور جماعت کے اندر بھی پھر ترتیب قائم کی ہے کہ امام کیا کرے گا اور تم کیا کرو گے۔ امام کیا پڑھے گا اور تم کیا پڑھو گے اس میں تمہیں آزادی نہیں بلکہ ایک نظم کے تحت نماز پوری کرنی ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے: اِذَا قَالَ الْاِمَامُ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِیْنَ۔ یہ حدیث کا آخری ٹکڑا ہے مطلب یہ ہے جب امام اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہے سب اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہو جب وہ رکوع کرے تم بھی رکوع کرو، وہ سجدے کرے تم بھی سجدہ کرو، وہ قیام کرے تم سب قیام کرو اور جب امام وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہے تم آمین کہو اور جب وہ سلام پھیرے تو تم بھی سلام پھیرو۔

تو تم کلیۃً امام کے تابع ہو ہر نقل و حرکت میں اگر تابع نہ ہوئے اور اطاعت نہ کی تو آپ جماعت سے الگ ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے امام سے پہلے سلام پھیر دیا تو بس گئی آپ کی نماز اس لئے کہ آپ امام سے منحرف ہوگئے۔ جماعت کی نماز بن نہیں سکتی جب تک آپ اطاعتِ کامل نہ کریں۔ لیکن انفرادی طور پر بھی اللہ نے اجازت دی ہے کہ پڑھ لیا کرو جتنی چاہے پڑھو لیکن جماعت سنتِ موکدہ ہے اور بعض ائمہ کے یہاں واجب قرار دی گئی ہے اور بعض کے یہاں فرض ہے کہ اگر نماز یا جماعت ترک کردی تو وہ اس کا مستحق کہ اس کو قتل کردو یا جیل میں ڈال دو۔ امام ابوحنیفہؒ کے یہاں یہ سہولت ہے کہ وہ جماعت کو سنت موکدہ کہتے ہیں جو قریب قریب واجب کے ہوتی ہے تو جماعت بن نہیں سکتی جب تک امام نہ ہو اور امام نہیں ہوسکتا جب تک کہ سب مطیع نہ ہوں امام بنا دیا اور مقتدی کھڑے ہوگئے، لیکن کوئی تکبیر کہتا ہے تو کوئی تکبیر کے بجائے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتا ہے۔ کسی نے سجدہ کیا تو کسی نے رکوع کیا۔ کسی نے مغرب کی طرف منہ کیا تو کسی نے مشرق کی طرف منہ کیا تو امام ہوا نہ ہوا برابر ہے۔ امام جب ہی بنتا ہے جب سب مطیع ہوں۔

سمع وطاعت...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَلَوْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ مُجَدَّعُ الْاَطْرَافِ" ① "سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تم پر امیر مقرر کردیا جائے کسی ایسے حبشی غلام کو جس کے ہاتھ پیر بھی کٹے ہوئے ہوں"۔ کوئی صورت وجاہت کی نہ ہو اور قوم نے کر اسے امیر بنا دے تو مامورین پر سمع و طاعت فرض ہے اس کے خلاف مت کرو۔ مت کا نظم جب ہی باقی رہ سکتا ہے، نماز فرض کی تو اس میں جماعت کا حکم دیا اور جماعت کے لئے امام بنانے کی لازمی طور پر ضرورت پڑے گی۔

فرائض امیر...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما ہیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے چند صحابہ کو ساتھ لے کر سفر کیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ بھائی کسی کو امیر مقرر کرلو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ سے

---

① السنن للترمذی، ابواب الجهاد والسیر، باب ماجاء فی طاعة الامام، ج:۲، ص:۹۸، رقم:۱۶۲۸۔

زیادہ افضل ہم میں کون ہے؟ کہ جس امیر بنادیں آپ افضل اصحابؓ ہیں فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کوئی اور بن جائے۔ عرض کیا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آخر کار سب نے مل کر حضرت صدیق اکبرؓ کو ہی امیر بنا دیا۔

حضرتؓ نے فرمایا کہ جب میں امیر بن گیا تو اطاعت کرو گے۔ عرض کیا کہ لازمی طور پر کریں گے عہد و پیمان لیا کہ منحرف تو نہیں ہو گے؟ عرض کیا کہ قطعاً نہیں۔ جب منزل پر پہنچے تو سب کے بستر کھول کر بچھانے شروع کئے لوگوں نے کہا حضرت ہم بچھائیں گے فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو امیر کی اطاعت واجب ہے کسی کو بستر نہیں بچھانے دیا کبھی جگہ صاف کر رہے ہیں کبھی کپڑا بچھا رہے ہیں جہاں کوئی آیا کہ حضرت میں کروں گا یہ کام فرماتے کہ میں امیر ہوں امیر واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

لوگ عاجز آگئے کھانا پکانے کا وقت آتا۔ تو جنگل سے لکڑیاں لا رہے ہیں کبھی بازار میں گوشت خریدنے جارہے ہیں لوگوں نے عرض کیا حضرت! ہم یہ کام کریں گے۔ فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو لوگ عاجز آگئے کہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے کہ ہمارے امام مقتداء بڑے اور ساری خدمات انجام دے رہے ہیں ہمارے جوتے بھی سیدھے کر رہے ہیں بستر بھی بچھا رہے ہیں کھانا بھی پکا رہے ہیں اور کوئی بول بھی نہیں سکتا اور جہاں کوئی بولا تو انہوں نے کہا کہ میں امیر ہوں واجب الاطاعت ہوں اس لئے لوگ عاجز آگئے۔

عجیب لطیفہ......اس سفر میں ایک لطیفہ بھی پیش آیا۔ وہ بھی سن دوں۔ گو مضمون سے متعلق نہیں مگر اس واقعہ کا جز ہے کہ ایک روز حضرت صدیق اکبرؓ نے کھانا وغیرہ پکا دیا مگر کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا کسی کام سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک صحابیؓ کو بھوک بے تحاشہ لگی۔ انہوں نے کھانے کے نگران سے کہا کہ بھائی کم از کم مجھے ایک روٹی دے دو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ مجھ سے تو انتظار بھی نہیں جاتا۔ نگران نے کہا جب تک امیر نہیں آئیں گے اور ان کی اجازت نہیں ہوگی تو میں کھانا نہیں دوں گا۔ انہوں نے بہت منت سماجت کی کہ بھائی مجھے ضعف طاری ہو رہا ہے۔ بھوک ستا رہی ہے۔ ایک آدھ روٹی دے دو! کچھ سہارا ہوگا۔ انہوں نے پھر انکار کیا اور ان کو روٹی نہیں دی۔

تو صحابہؓ جیسے مقدس ہیں ویسے ہی اندر خوش طبعی بھی ہے۔ فرمایا کہ اچھا میں تجھے سمجھوں گا نہ دے تو روٹی۔ اسی حال میں بھوکے بیٹھے رہے، کچھ دیر کے بعد وہ جنگل کی طرف اٹھ کر چلے، اچانک دیکھا کہ ایک دیہاتی اونٹ پر بیٹھا ہوا آ رہا ہے۔ وہ گاؤں کا مکھیا تھا۔ لباس سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی گاؤں کا بڑا آدمی ہے اور اچھی خاصی عمدہ اونٹنی پر سوار ہو کر آ رہا ہے۔ ان صحابیؓ نے کہا کہ چودھری صاحب کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا مجھے ایک غلام خریدنا ہے کھیتی باڑی کے کام کے لئے۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس غلام موجود ہے اور پانچ سو درہم میں بیچ سکتا ہوں۔ چودھری صاحب نے کہا کہ پانچ سو درہم کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر غلام اچھا ہے انہوں نے کہا کہ بہت سمجھ دار ہے معاملہ طے ہو گیا اور پانچ سو درہم لے کر اشارہ ان کی طرف کیا جنہوں نے روٹی نہیں دی تھی کہ وہ بیٹھا ہوا ہے اس کو جا کر پکڑ لو اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے دماغ میں تھوڑی سی سنک ہے جب کوئی پکڑنے جاتا ہے تو کہتا ہے

کہ میں غلام کب ہوں؟ میں تو آزاد ہوں۔ اس کا خیال نہ پوچھا انہوں نے کہا کہ میں سمجھ گیا۔ بعضوں کے دماغ میں ہوا ہی کرتی ہے۔ ایسے میں انہوں نے کہا، یہ چلائے گا بھی کہ میں غلام کب ہوں؟۔ میں تو حر ہوں۔ آزاد ہوں اس کا بھی خیال نہ کیجیو یہ اس کی عادت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں سمجھ گیا ہوں۔

چودھری صاحب نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا چل میرے ساتھ! اس نے کہا کہ: کہاں چلوں؟ چودھری صاحب نے کہا کہ: میرے گھر، اس نے کہا کہ: کیوں؟ کہنے لگے: میں نے تجھے خریدا ہے۔ اس نے کہا کہ: واللہ میں غلام نہیں ہوں، میں تو آزاد ہوں، اس نے کہا: مجھے معلوم ہے کہ تیری عادت یہی ہے۔ اب یہ چلا رہا ہے کہ میں آزاد ہوں۔ حر ہوں۔ مگر چودھری صاحب نے ایک نہ سنی۔ چودھری صاحب چونکہ طاقت ور تھے، زبردستی اٹھا کر اونٹ پر سوار کیا اور لے جانا شروع کیا اور اس نے ہائے وائے شروع کی کہ مجھے غلام بنا دیا، میں تو آزاد ہوں۔ اس نے کہا کہ میں تیری ساری داستان سن چکا ہوں۔ تیری عادت ہی یہ ہے۔

ادھر سے صدیق اکبرؓ چلے آ رہے تھے دیکھ کر یہ چلائے کہ امیر المؤمنین میرا تو ناطقہ بند کر دیا ہے اور مجھے غلام بنا دیا ہے اور یہ چودھری مجھے لئے جا رہا ہے۔ صدیق اکبرؓ کا بھی لوگ احترام کرتے تھے۔ چودھری اترا سواری سے اور سلام عرض کیا، حضرت نے فرمایا کہ بھائی یہ تو میرا ساتھی ہے اسے تو کہاں لئے جا رہا ہے۔ کہنے لگا حضرت جی میں نے تو اسے پانچ سو درہم میں خریدا ہے۔ فرمایا کہ یہ غلام نہیں، یہ آزاد ہے یہ کس نے بیچا ہے۔ اشارہ کیا کہ فلاں صاحب نے بیچا ہے۔ میں نے رقم بھی ان کو ہی دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ غلام موجود ہے لے جاؤ، حضرت صدیق اکبرؓ سمجھ گئے کہ کسی نے مذاق کیا ہے ان کے ساتھ جب واپس آئے تو جنہیں روٹی نہیں ملی تھی انہوں نے آنکھ سے اشارہ کر کے کہا کہ اب کہو کیا حال ہے۔ تو نے مجھے روٹی سے عاجز کر رکھا۔ اب بتا۔ صدیق اکبرؓ جب پہنچے تو فرمایا: کیا واقعہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی میں نے اس کی بہت منت کی کہ بھائی آدھی ہی روٹی دے دو، کچھ سہارا ہو جائے گا۔ اس نے کہا: جب تک امیر نہیں آئیں گے میں نہیں دوں گا تو میں نے بھی ایک مذاق کیا کہ اس کو پانچ سو درہم میں بیچ دیا۔ تو حضرت صدیق اکبرؓ بہت ہنسے وہ پانچ سو درہم واپس کئے گئے، جب اس کی گلو خلاصی ہوئی۔ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سنایا گیا تو آپ مسکرائے اور منہ پر رومال رکھ لیا جب بھی اس واقعہ کا ذکر آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے اور منہ پر رومال رکھ لیتے۔ گویہ یہ عجیب لطیفہ بن گیا۔

نظمِ اجتماعیت...... یہ واقعہ اس پر یاد آیا تھا کہ نماز کے اندر بھی جماعت رکھی ہے اور اس جماعت کا ایک امام مقرر کیا ہے اور وہ بھی مطاع جس کی اطاعت کی جائے سفر پیش آئے تو اس میں ایک امام بنا لیا جائے تاکہ سفر منظم ہو گھر میں: گھر ہو تو ایک کو بڑا سمجھ لو اور اس کے احکام کی تعمیل کرو گھر میں نظام پیدا ہوگا۔ حج رکھا تو اس میں امام الحج مقرر کیا کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ زکوٰۃ رکھی تو بیت المال میں ایک کو امام مقرر کیا کہ وہ ہر چیز کی زکوٰۃ وصول کیا کرے تو ہر چیز میں ایک جماعتی اور

اجتماعی نظم قائم کیا اور اس کا ایک ایک امیر مقرر کیا اور اس کی سمع و طاعت واجب قرار دی کہ اس کی اطاعت کرو۔

اس طرح ہر فن کا ایک امام مقرر ہے عقیدہ میں مرکز حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے اس میں امام مقرر کئے گئے۔ چنانچہ عقائد میں دو بڑے بڑے امام ہیں۔ ایک امام ابو منصور ماتریدی ہیں اور ایک امام ابوالحسن اشعری ہیں یہ دو امام ایسے سمجھے جاتے ہیں کہ جن کی رائے فن عقائد میں فن کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے بعض لوگ اشعری ہیں اور بعض لوگ اپنی نسبت دوسرے امام کی طرف کر کے اپنے آپ کو ماتریدی کہتے ہیں ان میں آپس میں کچھ تھوڑے بہت اختلافات بھی ہیں مگر وہ اختلافات لفظی کے قریب قریب ہیں۔ عقائد سب کے ایک ہی ہیں جب اس فن کا کوئی بڑا مسئلہ پیش آوے تو رجوع کرو اس کی طرف کہ امام ابوالحسن نے یہ کہا ہے۔ فقہ کا مسئلہ ہو تو اس میں ایک امام مقرر کرو امام شافعیؒ ہوں، امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ ہوں جب کوئی مسئلہ اختلافیہ آئے تو کسی ایک کی اطاعت کر لو تاکہ تمہارے اندر نزاع نہ پیدا ہو۔

مبنی بر حجت اختلاف مذموم نہیں ..... اس لئے کہ مسئلہ میں نزاع نہیں۔ مسئلہ میں اگر اختلاف ہو تو اختلاف حجت کا ہوتا ہے اور نزاع و جدال جو ہوتا ہے وہ نفسانی جذبے کے تحت ہوتا ہے اور وہ برا ہوتا ہے اور حجت سے جو اختلاف ہوتا ہے وہ برا نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ ہر اختلاف برا نہیں ہے۔ مثلاً چور اور ڈاکو اتفاق کر لیں تو یہ اتفاق اچھا نہیں ہے۔ برائی میں اگر لوگ متحد ہو جائیں تو وہ اتحاد بھی برا ہوگا اور اگر بھلائی کے اوپر لوگ جمع ہو جائیں تو وہ اتحاد اچھا ہوگا۔

اب اختلاف کو لے لو اگر اختلاف حجت سے ہو اور اللہ و رسول کا حوالہ دیانت سے ہو تو وہ ایک پہلو ہوگا دین کا۔ وہ اختلاف ہوگا مگر جھگڑا نہ ہوگا۔ کیونکہ حجت اس میں موجود ہے۔ یہ جھگڑے اصل میں ہم اپنے جذبات سے کرتے ہیں اور مسئلوں کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑنا نہیں ہے اگر مسئلوں کی خاصیت لڑنا ہوتا تو پہلے تو صحابہؓ میں لاٹھی چلتی کہ کوئی رفع یدین کر رہا ہے کوئی نہیں کر رہا ہے۔ کوئی امین بالجہر کر رہا ہے کوئی امین بالسر کر رہا ہے۔ کوئی فاتحہ کو امام کے پیچھے واجب قرار دیتا ہے اور کوئی ناجائز قرار دے رہا ہے تو سب سے پہلے تو صحابہؓ میں لاٹھی چلتی اگر مسئلہ کی خاصیت لڑنا ہوتا۔ مگر سب اپنے اپنے مسلک پر عمل کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کی عظمت بھی قلب میں لئے ہوئے ہیں۔ پھر اس کے بعد ائمہ مجتہدین میں ڈنڈا چلتا جن میں اختلاف ہے۔ خوب لڑائی ہوتی مگر سارے ائمہ باہم متحد ہیں اس لئے کہ وہ اختلافات فروعی ہیں اور بنیادیں سب کی ایک ہیں۔ اس لئے قلوب میں سب ایک دوسرے کی عظمت لئے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ بغداد میں امام ابوحنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے تو فاتحہ پڑھی اور ایصال ثواب کیا۔ وہیں مسجد تھی جب نماز کا وقت آیا تو نماز پڑھی اور اپنا مسلک ترک کر کے امام اعظمؒ کے مسلک کے مطابق نماز پڑھی اور امام شافعیؒ کا مسلک جو کہ مستحب کے درجہ میں تھا یعنی رفع یدین نہیں کیا اور آمین زور سے نہیں کہی۔ پوچھنے پر امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ''مجھے صاحب مزار سے حیاء آتی ہے کہ ان کے قریب ہو کر ان کے مسلک کے خلاف عمل کروں۔ جس جس مسئلہ میں گنجائش تھی اس میں فقہ حنفی کے مطابق نماز پڑھی اور جہاں جہاں جائز و ناجائز کا

اختلاف تھا اس میں وہ معذور تھے"۔ چونکہ ان کی عظمت قلب میں موجود تھی اس لئے ایسا کیا تو معلوم ہوا کہ مسئلہ کہ خاصیت لڑائی نہیں بلکہ اپنے نفسانی جذبات سے لڑتے ہیں اور مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے۔

آمین بالشر...... ہمارے بچپن کا زمانہ تھا ہمارے ہاں سہارنپور میں مارچ نام کا ایک کلکٹر تھا۔ تھا فی لینڈ کا رہنے والا نسلاً یورپین تھا۔ مگر مذاق وذوق اس کا ایشیائیت کا تھا کیونکہ اس کی پیدائش ہندوستان کی تھی۔ اس کے زمانے میں ایک جھگڑا پیش آیا کہ ایک حنفی کہیں اہل حدیث کی مسجد میں چلا گیا۔ انہوں نے زور سے آمین کہی۔ اس نے آہستہ سے کہی۔ وہاں سب جہلاء جمع تھے انہوں نے اس کی مار پٹائی کی کہ اس نے زور سے آمین نہیں کہی۔ پٹتے پٹتے وہ چلایا کہ حنفیو! دوڑو، دوڑو، تمام حنفی جمع ہو گئے انہوں نے اہل حدیث پر حملہ کر دیا۔ اب اہل حدیث چلائے کہ اے اہلحدیث دوڑو! ادھر سے اہل حدیث آ گئے۔ غرض لاٹھی چلی کتنوں کے ہی سر پھٹے۔ بلوہ عام ہو گیا فریقین سے رپورٹ درج کرائی۔

مارچ کا زمانہ تھا اس کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ فریقین کے وکلاء نے بحث کی آمین کے مسئلہ میں۔ اب اس کی سمجھ میں نہ آئی اس نے کہا کہ بھائی کیا آمین کسی جائیداد کا نام ہے؟ یا کوئی جاگیر ہے؟ یا کوئی بلڈنگ ہے؟ آخر تم کس چیز پر لڑ رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ صاحب! مسئلہ ہے۔ اس نے کہا کہ مسئلے پر کیوں لڑتے ہو؟ لڑائی عورت پر ہوتی ہے دولت پر ہوتی ہے۔ جائیداد پر ہوتی ہے۔ مسئلہ پر کیوں لڑتے ہو۔ آخر یہ لڑائی کی کیا وجہ ہے۔ انہوں نے کہ صاحب ایک حدیث میں آیا ہے کہ آمین زور سے کہو اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ آہستہ سے پڑھو۔ اس نے کہا بھائی، جسے زور سے پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ زور سے پڑھے اور جسے آہستہ پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ آہستہ سے پڑھے۔ آپس میں لڑتے کیوں ہو۔ اپنی اپنی حجت پر عمل کرو۔ اس کی سمجھ میں بات نہ آئی کہ آمین پر لڑائی کیسے ہو سکتی ہے۔ بات بھی ایسی ہی سمجھ میں نہ آنے کی تھی۔ اس نے تحقیق کر کے فیصلہ لکھا اور فیصلہ بڑا دانش مندانہ لکھا۔ اس نے لکھا کہ میں روداد مسئلہ کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ: "مسلمانوں کے یہاں آمین کی تین قسمیں ہیں۔ 1 آمین بالجہر یعنی زور سے امین پڑھنا۔ 2 آمین بالسر یعنی آمین آہستہ سے پڑھنا 3 آمین بالشر یعنی جھگڑا اٹھانے کے لئے آمین پڑھنا۔ یہ جتنا جھگڑا ہے نہ آمین بالجہر کا ہے اور نہ آمین بالسر کا کیونکہ دونوں کے بارے میں پیغمبرؐ سے حدیث وارد ہے اور یہ جھگڑے کی چیز نہیں۔ یہ سارا جھگڑا آمین بالشر کا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں فریق مفسد ہیں۔ میں دونوں کو سزا کرتا ہوں"۔

مسائل کی آڑ میں اندرونی بخار نکالنا...... مطلب یہ کہ ہم لوگ آپس میں نفسانی جذبے کے تحت لڑتے ہیں اور مسائل کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑائی نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب وسنت کی حجت ہے اس پر عمل کریں۔ لڑائی کے کیا معنی؟ اور نفرت کے کیا معنی؟ آپس میں مل کر رہو اگر کوئی نہیں مانتا ہے تو جبر تھوڑا ہی ہے۔ ان کے پاس بھی حجت ہے وہ اس پر عمل کر رہا ہے۔ یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ وہ فاسق ہے۔ کافر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ لہٰذا میری بات مانو۔ دوسرا باطل محض ہے۔ اس لئے وہ حق پر نہیں۔ یہ کہنا غلط بات۔ یہ

مسئلے صرف آڑ ہیں ورنہ حقیقی لڑائی تو نفسانی جذبات کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ لڑلڑ کر مسلمانوں نے حکومتیں برباد کیں۔ اپنی جائیدادیں تباہ کردیں۔ اپنی بلڈنگیں برباد کردیں، جب یہ دنیا چلی گئی تو رہ گیا دین اور لڑنا ضروری تھا۔ اس سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ کہا کہ اب دین کو آڑ بناؤ۔ اب جائیدادیں نہیں تو مسئلوں پر لڑو۔ فروعات پر لڑو۔ یہ صرف نفسانی جھگڑے ہیں۔ اگر حجت ہاتھ میں ہے تو اس میں جھگڑا ہی نہیں۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اس لئے زور سے آمین کہتا ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ کہیں گے کہ آپ معذور ہیں کیونکہ آپ کے پاس حجت ہے۔ میرے پاس حدیث ہے۔ میں آہستہ سے آمین کہتا ہوں چونکہ میرے پاس حجت ہے امام شافعیؒ کہیں گے آپ بھی معذور ہیں چونکہ آپکے پاس بھی حجت ہے۔ آپ بھی حق پر عمل کررہے ہیں۔ میں بھی حق پر عمل کررہا ہوں۔ معاملہ ختم ہوا نہ دوستی گئی، نہ نفرت پیدا ہوئی۔ نہ جھگڑا پیدا ہوا اس لئے کہ حجت ہے۔ جہاں اختلاف بلا حجت ہوتا ہے۔ تعصب سے، عناد سے، پارٹی بندی سے وہاں اصل میں لڑائیاں نفسانی جذبے کے تحت ہوتی ہیں۔ وہ مسئلے کی لڑائی نہیں ہوتی۔ وہ تو مسئلہ کو آڑ بنا کر اپنا اندرونی بخار نکالنا مقصود ہوتا ہے۔

توحید مقصد...... میں عرض کررہا تھا کہ فقہ کے مسئلے میں بہرحال کسی کو امام بنانا پڑے گا، جہاں اختلافی مسئلہ آوے کسی امام کی طرف رجوع کرے اور یہ فطری چیز ہے۔ مثلاً آپ علاج کرائیں اور چار طبیبوں کی چار رائیں ہوجائیں۔ ایک کہے کہ میں گرم دوائیں دوں گا۔ ایک کہے کہ میں ٹھنڈی دوائیں دوں گا۔ ایک کہے میں خشک دوائیں دوں گا۔ ایک کہے کہ میں تر دوائیں دوں گا۔ کیا کبھی آپ نے یہ کیا ہے کہ چونکہ طبیب آپس میں لڑ رہے ہیں۔ لہٰذا مجھے انتقال کرکے قبر میں چلا جانا چاہئے۔ میں علاج نہیں کراؤں گا۔ چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ان اطباء میں سے آپ انتخاب کرتے ہیں کہ کسی ایک کی طرف رجوع کریں خواہ انتخاب کی کوئی بھی وجہ ہو۔ خواہ یہ وجہ ہو کہ یہ جامعہ طبیہ کا پڑھا ہوا ہے جو بہت بڑا طبی ادارہ ہے۔ لہٰذا یہ طبیب حاذق ہوگا۔ اس لئے اس کا علاج کراؤں گا۔

یا اس وجہ سے کہ اس کے مطب سے شفاء پانے والے بہت ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نسخے تیر بہدف ہیں لہٰذا اس کا علاج کراؤں گا یا یہ وجہ ہو کہ یہ طبیب خاندانی طور پر طبیب ہے اس کے یہاں جدی طب چلی آرہی ہے۔ لہٰذا طب سے جو مناسبت اسے ہے وہ دوسروں کو نہیں ہے۔ اس بنا پر میں اس کا علاج کراؤں گا کہ کوئی بھی وجہ ہو مگر آپ انتخاب کریں گے۔ اس لئے کہ جان عزیز ہے محض اس بناء پر کہ اطباء میں اختلاف رائے ہے۔ آپ موت کو ترجیح نہیں دیتے زندگی پر۔ کہتے ہیں کہ زندگی رہنی چاہئے اور علاج ہونا چاہئے۔ تو ان اطباء میں سے کسی کو بھی منتخب کرلو۔

اگر علماء میں اختلاف رائے ہو اور آپ یہ کہیں کہ علماء تو لڑ رہے ہیں لہٰذا ہم دین اسلام کو چھوڑ دیتے ہیں اور ابدی موت کو ترجیح دیتے ہیں اور موت کو قبول کرتے ہیں۔ یہ آج تک کسی نے کیا ہے؟ انتخاب کرنا پڑے گا۔ جس کی طرف آپ جائیں یہ دیکھیں کہ اس کا علم مستند ہے۔ اس کے مشائخ سند صحیح کے ساتھ نبی کریمؐ تک پہنچے ہوئے

ہیں۔اور جو احکام یہ بیان کرتے ہیں ان کی سند کا سلسلہ پیغمبر تک پہنچا ہوا ہے۔لہٰذا ہم ان کے مسائل پر عمل کریں گے۔دوسروں کے مسئلے پر عمل نہیں کریں گے۔کوئی بھی وجہ ہو مگر انتخاب کرنا پڑے گا۔

اطباء میں اختلاف رائے ہو تو ان میں سے انتخاب کرتے ہیں اگر علماء میں اختلاف ہو تو دین سے بدظن ہو جاتے ہیں کہ صاحب!کس کی مانیں؟ مولوی تو آپس میں لڑ رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جان زیادہ عزیز ہے ایمان زیادہ عزیز نہیں ہے۔وہاں چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ڈاکٹروں میں کتنے ہی شدید اختلافات ہوں کسی کا انتخاب ضرور کریں گے۔یہاں اگر ایمان عزیز ہوتا تو کتنا ہی اختلاف ہوتا علماء میں کسی نہ کسی کا انتخاب ضرور کرتے اور اس کی پیروی کرتے چونکہ ایسا نہیں ہے معلوم ہوا کہ جان تو عزیز ہے مگر ایمان عزیز نہیں ہے۔

بہر حال اپنا امام ضرور بنانا پڑے گا اور اشخاص میں سے انتخاب ضرور کرنا پڑے گا اور ایک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔طب کے اندر ہو تو رجوع کرنا پڑے گا کسی طبیب کی طرف۔ایک دم چار کا علاج جاری کریں تو آپ کا مزاج فاسد ہو کر رہ جائے گا اور جلد ہی آپ قبر میں تشریف لے جائیں گے۔اس لئے کہ ایک طبیب صبح کو ٹھنڈی دوا دے گا تو دوسرا شام کو گرم دوا دے گا،تیسرا تر دوا دے گا،چوتھا خشک دوا سے علاج کرے گا تو مریض تختہ مشق بن جائے گا اور وہ قبر میں جانے کی تیاری شروع کر دے گا۔اس لئے ایک ہی کا علاج کریں۔

توحید مطلب......طریقت میں آپ نے بیعت کی تو وہاں بھی توحید مطلب ہے کہ جس شیخ کے ہاتھ پر بیعت کریں یہ سمجھیں کہ میری دنیا و آخرت کی خوبی اسی شیخ میں ہے دوسرے کی طرف رجوع مت کرو۔ہاں عظمت سب کی کرو۔احترام سب کا کرو مگر قلب کا علاج ایک ہی سے کراؤ۔صوفیاء کی اصطلاح میں اس کا نام توحید مطلب ہے۔یہ ہے کہ وحدت ہونی چاہئے اس شخص کے لئے جس کو آپ نے شیخ بنالیا ہے۔شیخ دو یا تین نہیں ہوں گے بلکہ ایک ہی ہو گا اور ایک ہی کے طریق پر چلنا پڑے گا۔

ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ شیخ واقعی اہل سنت میں سے نہیں ہے بلکہ مبتدع ہے تو ترک کر سکتے ہیں۔اس کے بعد پھر حضرات صوفیاء لکھتے ہیں کہ ترک کر کے دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرو مگر اس پہلے کی شان میں بے ادبی مت کرو،چاہے وہ اپنی ذات میں کیسا ہی ہو،گستاخی مت کرو۔ادب سے پیش آؤ۔تو طریقت کے اندر توحید مطلب ہے اور طب کے اندر توحید مطلب ہے۔تو آخر علم کے اندر توحید مقصد کیوں نہیں ہونا چاہئے اور کسی ایک امام کو کیوں مقرر نہیں کرتے کہ آپ اس کے فقہ پر عمل کریں۔اگر ایسا نہیں کریں گے تو آپ ڈانواں ڈول رہیں گے،کبھی ادھر، کبھی ادھر اور یہ نفس کی اتباع ہو گی کسی امام کا اتباع بالکل نہ ہو گا اور شریعت میں نفس کا اتباع مطلوب نہیں۔

تو شریعت نے ہر معاملے میں نظم قائم کیا،عقائد میں الگ نظم ہے۔اور فقہ کے مسائل میں الگ نظم ہے۔مقصد یہ کہ امت جڑ جائے۔چاہے اختلاف رائے بھی ہو مگر باہم متفق و متحد ہو جائیں۔اسی طرح سے جب آپ حضرات صوفیاء کے پاس جائیں گے اور اپنے اخلاق کی تربیت کرائیں گے تو ان کے بھی مختلف طرق پائیں گے۔

چشتیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ سہروردیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ قادریہ کے وظائف اور ہیں مگر ہیں سب حضرات اہل اللہ اور سب حضرات اہل حق ہیں۔ لیکن چاروں میں آپ ایک دم بیعت کر کے چاروں سے علاج کرائیں تو دین فاسد ہو کر رہ جائے گا اس لئے کہ متضاد چیزوں پر عمل کیسے کریں۔ لہٰذا ایک ہی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ ہاں عظمت واحترام سب کا کرنا پڑے گا اور خادم سب کا بننا پڑے گا مگر علاج ایک سے کرائیں۔ تو تصوف کے اندر بھی توحید مطلب ہے جیسے طب کے اندر توحید مطلب ہے۔ اور فقہ کے اندر توحید مقصد ہے۔

امیر معاملات...... اسی طرح سے جب معاملات پیش آئیں تو کسی نہ کسی کو امیر تو بنانا پڑے گا مثلاً کوئی جھگڑا ہو، اب راستہ چلتے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ بھائی کیسے فیصلہ کروں، ایک نے کہا کہ یوں کرو، دوسرے نے کہا کہ یوں کرو، تیسرے نے کہا کہ یوں کرو۔ اگر تینوں کی رائے پر عمل کیا تو وہ جھگڑا تو یوں ہی رہ جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ گھر بھی فاسد ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی ایک متدین شخص کو اپنا امیر بنا لیا کہ بھائی! ہم تم سے فیصلہ چاہتے ہیں جو تم فیصلہ کرو گے ہمیں منظور ہے۔ اگر صحیح کرو گے۔ تب بھی عمل کریں گے۔ اور اگر کوئی فکری غلطی بھی واقع ہو گئی تب بھی عمل کریں گے۔ مگر کرائیں گے فیصلہ آپ سے ہی۔ تو ایک قسم کا اطمینان وسکون ہو جائے گا۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جائے گی۔ قاضی جب حکم کر دے کہ یہ ہے مسئلہ تو وہ ظاہر میں بھی، اور باطن میں بھی نافذ ہو جاتا ہے یعنی اس کے خلاف پھر کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر بعد میں یہ بھی ثابت ہو کہ رائے کی غلطی تھی تو یہ بات نہیں کہ فیصلہ ٹوٹے گا، ایسا نہیں بلکہ جو فیصلہ ہو چکا وہ نافذ ہو کر رہے گا۔ چونکہ وہ فیصلہ من جانب اللہ ہے اور اس کے بغیر سکون واطمینان قلبی اور یکسوئی نہیں ہو سکتی اس بنا پر قاضی کی قضا ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی ہے اور اس کا ماننا لازم ہو جاتا ہے تو امراء اسلام اس لئے مقرر کئے گئے تا کہ وہ جھگڑوں کے فیصلے کر سکیں۔

حق امارت...... اگر خلیفۃ المسلمین اور بادشاہ اسلام موجود ہے تو اصل امیر وہ ہے پھر جن کو وہ امیر مقرر کریں وہ امیر بن جائیں گے۔ اگر اسلام کی حکومت نہیں ہے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ سب مل کر اپنا ایک امیر مقرر کر لیں۔ اگر سارے ملک کے مسلمان ایک امیر پر جمع نہ ہوں تو خطوں کے امیر بنا لئے جائیں۔ ہر صوبہ کا الگ امیر ہو اور تمام مامورین پر اپنے اپنے امام کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ ① یہاں پر تین اطاعتیں واجب اور فرض قرار دیں۔ اللہ کی اطاعت، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، اولی الامر یعنی امیر کی اطاعت۔

اطاعت ذاتی اور وصفی...... قرآن تو قرآن ہی ہے وہ تو سرچشمہ ہے بلاغت وفصاحت کا اور معجزہ ہے اس نے جہاں اللہ کی اطاعت فرض کی وہاں تو اللہ کا نام ذکر کیا کہ اطیعوا اللہ یعنی اللہ کی اطاعت کرو۔ اس کے معنی یہ ہیں اللہ بذاتہ واجب الاطاعت ہیں کسی وصف کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت نہیں ہے کہ جب اللہ کا نام آئے تو گردن جھک جاتی

① پارہ: ۵ سورۃ النساء الآیۃ: ۵۹.

چاہئے اطیعوا اللہ علم ذات کا ہے۔ اس لئے کہ وہ بالذات واجب الاطاعت ہیں۔ ہم اور آپ کسی وصف سے واجب الاطاعت بنتے ہیں۔ آپ میں اگر علم آ گیا تو علم کی وجہ سے آپ کی اطاعت ہوگی۔ ورنہ آپ کی اطاعت نہ ہوگی۔ مثلاً کوئی جاہل ہے اس کی کوئی بھی اطاعت نہیں کرتا ہاں علم کا وصف اگر آ جائے تو اطاعت کرنے لگیں گے۔

اگر کوئی باپ ہے تو باپ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی استاذ ہے تو استاذ ہونے کی حیثیت سے اس کی اطاعت ہوگی کوئی شیخ ہے۔ تو شیخ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی تو انسان بذاتہ واجب الاطاعت نہیں بلکہ بالاوصاف واجب الاطاعت ہے۔ جب کوئی وصف کمال پیدا ہوگا اس کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی۔

لیکن حق تعالیٰ شانہٗ بذاتہ واجب الاطاعت ہیں۔ صفات تو ذات کے تابع ہوا کرتی ہیں کیوں کہ وہ ذات کا پرتو ہیں۔ دراصل سرچشمہ کمالات کا ذات ہے اور صفات اس لئے مقبول ہوئیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہیں مگر اصل ان سب کی ذات ہی ہے اور جب آگے کی اطاعت بتلائی گئی تو یوں نہیں فرمایا گیا کہ۔ اَطِیْعُوْا عِیْسٰی یا اَطِیْعُوْا مُوْسٰی یا اَطِیْعُوْا مُحَمَّدًا۔ بلکہ فرمایا اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ یعنی رسول وصف رسالت کی وجہ سے واجب الاطاعت ہیں۔ اسی وجہ سے اگر وہ کوئی ذاتی مشورہ دیں تو واجب الاطاعت نہیں ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اپنی محبت کی وجہ سے اس کی منشاء کی بھی اطاعت کریں۔ لیکن قانون شریعت یہ ہے کہ اگر رسول کوئی ذاتی رائے دیں تو واجب الاطاعت نہیں البتہ جب یہ فرمائیں کہ میں حکم خداوندی پہنچا رہا ہوں تو وہ واجب الاطاعت ہے جب رسالت پہنچائیں گے تو اطاعت کرنا فرض ہے اور جب یوں فرمائیں کہ میرا ذاتی مشورہ ہے تو آپ مختار ہیں۔ اور معذرت بھی کر سکتے ہیں، اور چاہے آپ عمل کرلیں مگر آپ کے ذمے واجب نہیں ہے۔

جیسے کہ حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہوا۔ یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باندی تھیں اور ان کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیثؓ سے کر دیا تھا۔ حضرت بریرہ حسین وجمیل اور بہت خوبصورت تھیں اور حضرت مغیثؓ کالے کلوٹے اور بدصورت تھے۔ اس لئے آپس میں بنتی نہ تھی۔ رات دن آپس میں کھٹ پٹ رہتی تھی اور رات دن لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ فرماتے تھے مگر بہرحال قصہ چل رہا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے ان کو آزاد کر دیا اب وہ باندی نہیں رہیں اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ منکوحہ باندی جب آزاد ہوتی ہے تو نکاح اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ چاہے تو باقی رکھے چاہے تو فسخ کر دے۔ اب جب کہ آزاد ہو گئیں تو انہوں نے ارادہ کر لیا کہ میں نکاح کو باقی نہیں رکھوں گی بلکہ فسخ کر دوں گی کیونکہ حضرت مغیثؓ سے ان کی موافقت نہیں ہوتی۔ پکا ارادہ کر لیا کہ اب میں ان کے نکاح میں نہیں رہوں گی۔

اور حضرت مغیثؓ ان پر سو جان سے عاشق تھے جب انہیں معلوم ہوا تو پریشان ہو گئے۔ کبھی صدیق اکبرؓ سے سفارش کراتے ہیں کبھی حضرت عمر فاروقؓ کے پاس جاتے ہیں کہ آپ ان کو سمجھا دیں کہ وہ نکاح باقی رکھیں۔

انہوں نے سب کو جواب دے دیا کہ نہیں میں نکاح باقی نہیں رکھتی۔ آخر میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ یارسول اللہ! آپ نے ہی یہ نکاح باندھا تھا۔ اب بریرہؓ اس نکاح کو توڑ رہی ہیں۔ آپ ان سے فرمادیں کہ اس نکاح کو باقی رکھو۔ اور حضرت مغیثؓ بے حد پریشان حال ہیں۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ وقت دیکھنے کے قابل تھا کہ حضرت مغیثؓ مدینے کی گلیوں میں روتے ہوئے پھر رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں، داڑھی پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں کہ ہائے بریرہؓ جدا ہو گئیں۔ اس درجہ عشق تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ آپ فرمادیں نکاح باقی رکھنے کو۔ حضورؐ تشریف لے گئے اور فرمایا: بریرۃ نکاح مت توڑو مغیث سے۔ میں نے ہی وہ نکاح قائم کیا تھا تم اب بھی قائم رکھو۔ وہ بھی بڑی ذہین تھیں۔ انہوں نے کہا: ”یارسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کا ذاتی مشورہ؟ آپ نے فرمایا: کہ نہیں حکم شرعی نہیں شرعاً تو تم آزاد ہو۔ نکاح رکھو چاہے توڑ دو۔ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے“۔ ①

بریرہؓ نے کہا پھر تو میں نہیں مانتی۔ آخر کار نہیں مانا اور نکاح توڑ دیا تو معلوم ہوا کہ اگر نبی اپنی ذات سے کوئی مشورہ دیں تو وہ قانون واجب الاطاعت نہیں ہوتا، اگر رسالت پیش کریں کہ یہ حکم خداوندی ہے تو اس کی اطاعت فرض ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب انبیاء بھی ذاتی طور پر واجبُ الاطاعت نہیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے اور میں ذاتی بات کہوں اور اس پر ضد کروں کہ نہیں اس کو ماننا ضروری ہے۔ قطعاً ضروری نہیں ہے۔ صرف ایک رائے ہے آپ کی، میری بھی ایک رائے ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جو حق ہو اس پر عمل کریں۔ تو اللہ نے جہاں اپنی اطاعت کا حکم دیا وہاں اپنا نام لیا ہے اور فرمایا ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ﴾ کہ اللہ کی ذات واجبُ الاطاعت ہے۔ آگے رسول کا نام نہیں لیا بلکہ ﴿وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾۔ ② فرمایا یعنی وصفِ رسالت کا تذکرہ کیا کہ اسی وصفِ رسالت کی وجہ سے وہ واجبُ الاطاعت ہیں کہ جب رسالت خداوندی پیش کریں تو گردن تسلیم خم کر دو۔

اطاعتِ امیر کا معیار...... ﴿وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ یہاں ﴿اَطِیْعُوْا﴾ ③ کا لفظ بھی خصوصیت سے ذکر نہیں کیا جیسا کہ ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾۔ ④ میں ذکر کیا تھا یہ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ پچھلے اَطِیْعُوْا کے نیچے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اُولِی الْاَمْرِ ہو گا وہ تابع ہو گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چونکہ آپ کا نائب بن کر آیا ہے۔ اس لئے واجبُ الاطاعت ہے۔ مستقلاً اس کی اطاعت نہیں۔ اللہ کے رسول کا فرمان نافذ کرے گا تو واجبُ الاطاعت ہوگی ورنہ محض ذاتی مشورہ ہوگا کوئی واجبُ الاطاعت نہیں اور اولی الامر کا لفظ آخر میں ہے۔ اس کے بعد کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اس بناء پر تین اطاعتیں ہو گئیں۔ اللہ کی اطاعت۔ رسول کی اطاعت۔ اولی الامر کی اطاعت۔ ہاں اگر اولی الامر کوئی غلط حکم دے۔ تو اس کی اصلاح کی جائے۔ اس لئے ذاتی حکم

① الصحیح للبخاری، کتاب الطلاق، باب شفاعۃ النبی ﷺ زوج بریرۃ، ج: ۱۶، ص: ۳۳۲، رقم: ۴۸۷۵۔

② پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹ ③ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹ ④ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹۔

واجبُ الا طاعت نہیں۔ جب وہ یوں کہے کہ قرآن شریف میں یوں آیا ہے تو پھر وہ واجبُ الا طاعت ہے چاہے وہ استنباط ہی سے کہتا ہو۔ نصِ صریح نہ ہو کیونکہ وہ قرآن ہی سے کہہ رہا ہے۔ وہ قرآن ہی کا مصداق ہے۔ اس لئے اس سے گردن پھیرنا جائز نہیں ہے۔

صلاحیت کی بنیاد پر چیف جسٹس کی تقرری..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب امیر المومنین تھے تو دربارِ خلافت میں ایک عورت حاضر ہوئی۔ اس نے عرض کیا کہ امیر المومنین! میرے خاوند کی آپ کیا بات پوچھتے ہیں۔ صَآئِمُ الدَّهْرِ ہے۔ قَآئِمُ الَّيْلِ ہے۔ تمام راتیں عبادتیں کرتا ہے اور تمام دن روزے رکھتا ہے۔

فرمایا کہ ماشاء اللہ اللہ مبارک کرے بڑا اچھا خاوند ہے کہ عبادت گزار ہے، راتوں کو تہجد پڑھتا ہے۔ دنوں کو روزے رکھتا ہے مبارک ہو۔ وہ بیچاری چپکی ہو کر چلی گئی۔ دربار میں ایک صحابیؓ موجود تھے جن کا نام اشجؓ تھا وہ اٹھے اور انہوں نے کہا کہ امیر المومنین! آپ کچھ بھی سمجھے کہ یہ کیا کہہ کر گئی ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خاوند کی تعریف کر کے گئی ہے اور کیا کہتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ حضرت! اسے کیا مصیبت آئی تھی کہ وہ دربارِ خلافت میں آکر خاوند کی تعریف کرے کہ نمازیں اتنی پڑھتا ہے۔ روزے اتنے رکھتا ہے۔

کہنے لگے پھر کیا کہہ کر گئی ہے۔ اشجؓ نے کہا: خاوند کی تعریف کرنے نہیں آئی تھی بلکہ استغاثہ اور دعویٰ دائر کر کے گئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دعویٰ کیا کر کے گئی ہے۔ اشجؓ نے کہا کہ دعویٰ یہ کیا ہے کہ ساری رات تو رہتا ہے عبادت میں اور سارے دن رہتا ہے روزے میں یہ اللہ میاں کے کام کا تو ہے میرے کام کا نہیں ہے۔ یہ ہے اس کا منشاء وہ استغاثہ دائر کر کے گئی ہے۔ حضرت عمرؓ چپ ہو گئے اور فرمایا کہ مجھ جیسے کو امیر بنا دیا ہے معاملہ سمجھنے کی بھی طاقت نہیں۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ امیر بنایا جاتا۔ پھر فرمایا کہ اچھا اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی سمجھ دی ہے تو تو ہی فیصلہ کر اس مقدمے کا جب اس نے استغاثہ دائر کیا ہے اور خاوند کی شکایت کی ہے تو کیا حکم شرعی ہونا چاہئے؟

انہوں نے فوراً ہاتھ کے ہاتھ فیصلہ کیا کہ "امیر المومنین! اس کے خاوند کو حکم دیا جائے کہ چار دن میں سے ایک دن ضرور افطار کیا کرے اور خوب کھانا کھایا کرے اور چار راتوں میں سے ایک رات بالکل نہ جاگے۔ بیوی کے پاس سویا کرے۔ تین راتوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب تہجد پڑھے اور تین دنوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب روزہ رکھے۔ تو ہر چار دن میں سے ایک دن اور ہر چار راتوں میں سے ایک رات خالی چھوڑے"۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اشجؓ! یہ حکم تم نے کہاں سے نکالا ہے۔ انہوں نے کہا قرآن سے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ قرآن میں کہاں موجود ہے؟ کہ اگر کسی بیوی کا خاوند رات دن عبادت کرے تو وہ چار رات دن میں سے ایک رات دن بیوی کے پاس گزارے۔ عرض کیا قرآن میں حکم ہے۔ ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ ① اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ اگر

① پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۔

چار بیویاں ہوں تو چار راتیں انکے گھر جائیں گے۔ اگر چار میں سے ایک بیوی ہو تو تین راتیں خدا کی اور ایک رات بیوی کی۔ فرمایا: سبحان اللہ کتنا اچھا فیصلہ ہے۔ مجھ جیسے کو امیر بنادیا جس نے قرآن سے اتنا فیصلہ نہیں کیا۔ اس دن حضرت عمرؓ نے ان کو چیف جسٹس یعنی قاضی القضاۃ بنادیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری سمجھ کو تیز کیا ہے۔ اس لئے تم ہی فیصلے کرو آج سے مسلمانوں کے مقدموں کے۔ ایک چاول سے پوری دیگ پرکھی جاتی ہے جب ایک فیصلہ کیا کہ جو کہ معمولی مسئلہ تھا قرآن سے پیش کیا۔ فرمایا کہ تیری سمجھ اس قابل ہے کہ آج سے تو مسلمانوں کے فیصلے کرے۔ اس بناء پر ان کو قاضی القضاۃ بنادیا۔

انحرافِ اطاعت موجب تفریق ہے...... بہر حال اطاعتیں تین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت، رسولؐ کی اطاعت اور رسولؐ کے جو نمائندے اور نائب ہیں ان کی اطاعت جب کہ وہ رسول کی رسالت کو جاری کریں اور ان کے علم پر اعتماد ہو تو وہ واجب الاطاعت بن جاتے ہیں۔ پھر ان سے اور ان کی اطاعت سے انحراف کرنا قوم کے اندر تفریق ڈالنا ہے اس لئے مامورین کے ذمہ ہے کہ ہر صورت میں جب کہ وہ حکم شرعی بیان کریں تو ان کی اطاعت کریں۔ لہٰذا جب ہم نے اپنا امیر شریعت بنایا ہے اور بحمداللہ ان میں امیر شریعت کے اوصاف بھی موجود ہیں جو اوصاف کہ واقعی طور پر ایک امیر کے اندر ہونے چاہئیں۔ خدا نے ان کو اہل بنایا ہے۔ جب آپ کو ایک اہل ملا تو آپ کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں۔ اب ایسے اشخاص تو آنے سے رہے جو کبھی بھی غلطی نہ کریں۔ ہمیں اپنے ہی میں سے ہر ایک کو بنانا پڑے گا اور اس کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ ہاں اتنا دیکھ لو کہ وہ بشر عمدہ ہو جس کی تمام زندگی تقویٰ وطہارت سے گزری ہو۔ جس کی زندگی میں صلاح اور رشد پایا جاتا ہو وہ بے شک اس قابل ہے کہ وہ ہمارا مطاع بن جائے اور غلطی سے تو کوئی بشر خالی نہیں ہر ایک انسان غلطی بھی کرتا ہے مگر اس کے باوجود واجب الاطاعت ہے تو بہر حال اللہ تعالیٰ نے ایک امیر بنادیا آپ کے لئے جو اہل ہے امامت کا۔ ہم سب کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اب اگر ان سے کوئی اور افضل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ امیر سب سے افضل ہو۔ اگر دوسرا کوئی افضل بھی ہو تو اطاعت اسے بھی کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ قوم نے مل کر ان کو امیر مقرر کردیا ہے۔

امارت کی بنیادی شرط...... اگر کوئی یوں کہے کہ صاحب! میں ان سے زیادہ کامل ہوں۔ اس لئے امیر میں بنوں گا۔ تو مدعی کو امیر بنانے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ خود شریعت میں مسئلہ موجود ہے "لَانُوَلِّيْ اَمْرَنَا هٰذَا مَنْ طَلَبَهٗ" ① جو خود عہدے کی طلب کرے اسے کبھی عہدہ نہیں دیں گے۔

جو شخص عہدے سے بچے اور الگ رہے وہ اس قابل ہے کہ عہدہ اس کے ذمے ڈالا جائے۔ اس واسطے کہ جب مسلمانوں نے عہدہ ڈال دیا اس کے ذمے اور امیر بنادیا اور امیر نے پھر ایک قاضی مقرر کردیا تو قوم کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات سامنے آئے کہ صریح قرآن وحدیث کے خلاف فیصلہ

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الامارة، باب النهي عن طلب الامارة والحرص عليها، ص: ١٣٣٣.

دیا اور تخریب کردی تو بھائی اس وقت غور کرنا! کہ ایسے کو امیر کیوں بنایا، لیکن قرآن و سنت کے مطابق فیصلے کر رہا ہے۔ تو اس بیچارے سے کیوں انحراف کریں؟

اسلامی حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کی ذمہ داری...... امارت شرعیہ کا قیام ضروری ہے اور فقہاء لکھتے ہیں کہ جب حکومت اسلامی نہ ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کرلیں۔ اپنے معاملات میں ان کی طرف رجوع کریں اور سمع و طاعت کے ساتھ اس پر چلیں۔ اس کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے گا۔ وہ یہ کہ جب پوری قوم منظم ہوگی اور ایک کے تابع ہوگی تو اغیار پر اثر پڑے گا کہ یہ ہے متحد و منظم قوم۔ جب عید کی نماز ہوتی ہے اور ایک امام کے پیچھے پچاس پچاس ہزار آدمی ہوتے ہیں تو بہت سے غیر مسلموں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ یہ نظام کسی قوم کو نصیب نہیں ہے جو اس قوم کو دیا گیا ہے کہ ایک کے اشارے پر لاکھوں آدمی جھک رہے ہیں۔ حرم محترم میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک امام کے پیچھے تیں لاکھ آدمی نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایک امام زکوٰۃ کے پیچھے سارے اپنی زکاتیں پیش کر رہے ہیں۔ تو اسلام نے ہر ہر جزئی میں ایک نظم قائم کیا ہے اور نظام ہو ہی نہیں سکتا جب تک جماعت نہ ہو اور جماعت ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ امام نہ ہو اور امیر نہ ہو اور امیر ہو ہی نہیں سکتا ہے جب تک کہ سمع و طاعت نہ ہو۔ تو سمع و طاعت ہم سب کا فرض ہے ہمیں اور آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی توفیق دی کہ ہم نے اپنا ایک امیر مقرر کیا اور امیر بحمد للہ ایسا کہ قابل اعتراض نہیں ہے۔

انتخاب امیر کے لئے مجموعی زندگی کو پیش نظر رکھا جائے...... دنیا میں کوئی ایسی ذات نہیں ہے جو اعتراض سے بچی ہوئی ہو۔ اعتراض سے کوئی خالی نہیں۔ اعتراض جس پر چاہو کردو۔ حتی کہ اعتراض کرنے والوں نے اللہ و رسول پر بھی اعتراض کردیئے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

قَـدْ قِيْـلَ إِنَّ الـلّٰـهَ ذُوْ وَلَـدٍ	وَقِيْـلَ إِنَّ الـرَّسُوْلَ قَدْ كَهَنَ
مَـا نَـجَـا الـلّٰـهُ وَالرَّسُوْلُ مِنْ	لِسَـانِ الْـوَرٰى فَـكَيْفَ أَنَـا

کہنے والے نے کہا کہ اللہ صاحب اولاد ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے بیٹے ہیں اور باپ ہیں۔ اور حضرت مریم بیوی ہیں۔ رسول کے بارے میں کسی نے کہا کہ کاہن ہیں۔ کسی نے کہا کہ ساحر ہیں، کسی نے کہا کہ مجنون ہیں۔ تو شاعر کہتا ہے کہ جب اعتراض کرنے والوں نے اللہ و رسول کو بھی نہیں چھوڑا تو میں کون ہوں۔ میں بیچارہ کیا چیز ہوں۔ دنیا میں کون ہے ایسا جس پر اعتراض نہ ہوا ہو۔ بھائی تھوڑا بہت تو اعتراض سب پر ہوتا ہے۔ مجموعی زندگی کو دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی زندگی سچائی سے گزر رہی ہے یا مکر و فریب سے۔ صلاح و تقویٰ پر گزر رہی ہے یا جہالت پر اس لئے اگر تھوڑی بہت غلطی بھی ہو جائے تو وہ قابل عفو ہے۔ ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ① جن کی نیکیاں غالب ہیں وہ اللہ کے یہاں بھی نجات پا جائیں گے۔ معصوم تو انبیاء علیہم

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۸۔

الصلوٰۃ والسلام کی ذواتِ گرامی ہیں۔

لیکن انبیاء کے بعد اولیاء محفوظ ہیں۔ پھر اولیاء کے بعد جتنے ہم اور آپ ہیں نہ محفوظ ہیں نہ معصوم ہیں۔ کبھی نہ کبھی کوئی غلطی ہو ہی جائے گی مجموعی زندگی کو دیکھ کر حکم لگے گا۔ ایک ایک غلطی نہیں پکڑی جائے گی۔ یہ بدبختی ہوگی کہ ساری زندگی کی اچھائیوں میں سے ایک برائی پر نظر پڑی تو اس کو آپ نے اچھال دیا یہ تو عناد کی بات ہے۔ یہ کوئی آدمیت نہیں ہے۔ یہ ہے خلّتِ ماکرہ نبی کریمؐ نے اس سے پناہ مانگی ہے۔ فرمایا کہ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ خَلِیْلٍ مَاکِرٍ عَیْنَاہُ تَرْیَانِیْ وَقَلْبُہٗ یَرْعَانِیْ اِنْ رَّاٰی حَسَنَۃً دَفَنَھَا وَاِنْ رَّاٰی سَیِّئَۃً اَفْشَاھَا۔" ② "اے اللہ! میں ایسے مکار دوست سے تیری پناہ لیتا ہوں جس کی آنکھیں مجھے دیکھیں اور اس کا دل میری ٹوہ میں لگا رہے اگر نیکی دیکھے تو اسے چھپالے اور اگر برائی دیکھے تو اس کو پھیلاتا پھرے"۔

ایسا دوست پسندیدہ نہیں ہے بلکہ اگر کسی کی برائی آپ کے سامنے ہو تو اس کی اچھائیوں کو بھی دیکھنا چاہئے اور ان اچھائیوں کی وجہ سے اس کی برائی نظر انداز کر دینی چاہئے۔ یہی قرآن کا فیصلہ بھی ہے۔ ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ ① کہ نیکیاں تمام برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ جب ختم ہوگئی پھر برائی رہ ہی کہاں گئی جس کو اچھالا جائے۔ لیکن کہنے والے اور اعتراض کرنے والے تو ہر وقت اور ہر زمانہ میں رہتے ہیں۔ کام کرنے والے اگر اس کی پرواہ کریں تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ قیامت میں جب باری تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی تو اعتراض کرنے والے بھی سامنے کھڑے ہوں گے اور کام کرنے والے بھی کھڑے ہوں گے۔ مگر کامیاب و سرخرو کام کرنے والے ہوں گے۔ تو شکریہ ادا کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے ہمیں اپنا امیر بنانے کی توفیق دی اور آگے ہم اس کی توفیق بھی بارگاہ صمدی سے چاہتے ہیں کہ ہم اپنے امیر کی سمع و طاعت کریں اور ہم کو راہِ راست پر چلائے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔ ہمیں اسلام پر قائم و دائم رکھے، ایمان پر خاتمہ فرمائے۔

آمِیْن یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

---

① کنز العمال، ج: ۱، ص: ۴۷۹، رقم: ۳۶۶۲، ابن النجار عن سعید المقبری مرسلاً۔

② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۱۱۴۔

اَلواعظ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ، وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ، فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْفَازَ ، وَمَاالْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ① (صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ)

فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے...... بزرگانِ محترم! آج بعض ضروری کام کی وجہ سے وعظ کرنے کا ارادہ نہیں تھا مگر چونکہ موذن صاحب نے اعلان کر دیا اس لئے موذن صاحب کے اور دوسرے حضرات کے اس جذبہ اور شوق کے پیشِ نظر کہ آپ لوگوں کو وعظ سننے کا شوق ہے اور اس خیال سے آپ لوگ جمع ہو گئے ہیں کہ خدا کی ، دین کی اور شریعت کی کوئی بات کان میں پڑ جائے ۔ آج میں آپ لوگوں کو ایسی بات بتلا دوں کہ کوئی واعظ ہو یا نہ ہو، مقرر ہو یا نہ ہو آپ لوگ وقت صرف کر کے کہیں جمع ہوں یا نہ ہوں جس حال میں بھی ہوں خود وعظ کہہ لیں اور خود سن لیں ۔ خدا اور رسول کی بات کہہ اور سن کر اس پر عمل کر لیں کہ مقصود عمل ہے ۔ فائدہ نہ صرف کہنے سے ہوتا ہے اور نہ سننے سے ہوتا ہے فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے ۔ فرمایا ۔

عقل فکر ونظر کا واعظ...... انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اس کی عقل ہے ۔ اگر انسان عقل وتدبر اور تفکر سے کام لے ، انقلاباتِ زمانہ اور لیل ونہار کی گردش پر غور کرے اور سوچے تو اس سے اس جہان کے خالق اور اس کی مخلوقات ، عجیب وغریب کرشمہ سازیوں اور بوقلموں ایجادات کی طرف رہنمائی ہوگی ۔ علوم وحقائق کا انکشاف ہوگا ۔ رشد وہدایت کی راہ کھلے گی ۔ حیات ، زندگی اور دنیا کی ناپائیداری اور ناثباتی کا پتہ چلے گا ۔ موت اور بعد الموت پیش آنے والے واقعات کا علم الیقین حاصل ہوگا ۔ خدا اور آخرت کی طرف طبیعت رجوع کرے گی ۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔ ﴿سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ﴾ ② آفاق اور انفس میں خدائے برتر وبزرگ کی ہزار

① پارہ: ۴ ، سورۃ آل عمران ، الآیۃ: ۱۸۵ ۔ ② پارہ: ۲۵ ، سورۃ فصلت ، الآیۃ: ۵۳ ۔

بانشانیاں اور علامات موجود ہیں اگر چشم بصیرت سے کام لیا جائے دھیان دیا جائے۔قلب کو متوجہ کیا جائے۔عالم کی ایک ایک جزئی سے خدا کی قدرت، اس کی حکمت اور بالغ النظری نمایاں ہوگی۔مگر شرط دھیان اور توجہ ہے، جب تک دھیان اور توجہ سے دیکھا نہ جائے اور غور نہ کیا جائے، اس وقت تک نہ کوئی حکمت ظاہر ہوگی اور نہ کسی مصلحت و دانائی کا پتہ چلے گا۔دن رات کا مشاہدہ ہے۔بازار میں، مدرسہ میں، گھر میں، جب تک آپ دھیان نہ دیں کسی کام یا چیز کو خیال اور توجہ سے نہ کریں اور نہ دیکھیں۔اس وقت تک آپ کو اسکا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔حالانکہ وہ واقعات آپ کی نظروں کے سامنے گزر رہے ہیں۔آپ کے کان آپ کی آنکھیں اسے سن اور دیکھ رہی ہیں۔لیکن پوچھنے پر آپ انہیں بتا نہیں سکتے، اس واسطے کہ آپ نے اسے دھیان اور توجہ سے نہیں دیکھا۔قلب کو متوجہ نہیں کیا۔تو اصل قلب ہے۔قلب اگر متوجہ نہ ہو تو نہ کوئی دکھائی دے اور نہ کان کچھ سن سکے۔

یہ آنکھ اور کان قلب کی عینک اور چشمہ ہیں۔انسان اگر صرف اپنے نفس، اس کے عدم، پھر وجود اور پھر عدم پر غور کرے اور دیکھے کہ دن اور رات میں، صبح اور شام میں اس خاک کے پتلے پر کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اور کن کن حالات سے اسے دو چار ہونا پڑتا ہے۔کوئی پیدا ہوتا ہے کوئی مرتا ہے۔کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی صحت مند ہے کوئی بیمار و مریض، کسی کی زندگی عیش و عشرت سے گزر رہی ہے اور کسی کی تنگی اور عسرت سے۔بہر حال اگر انسان آفاق و انفس اور اس مادی عالم پر نظر ڈالے، اس کے حوادث و واقعات کو امعان کی نظر سے دیکھے۔عقل و بصیرت، تدبر اور تفکر سے کام لے۔تو یہ چیز اس کے لئے بڑے سے بڑے واعظ اور مقرر کا کام دے گی۔اور انسان ہر وقت وعظ کہہ سکتا ہے اور اس سے پند و نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔اس عالم کون و فساد، اس کے حوادث، واقعات، انقلابات اور صبح و شام کے تغیرات پر نظر ڈالو، غور کرو، دھیان اور توجہ سے سوچو۔یہ انقلابات تمہیں خالق کا، صانع کا، اور مالک کا پتہ دیں گے، خالق کے اقرار کے بعد اس کی قدرت، حکمت، علم اور ستوئیت کا نشان ملے گا۔اس کے بعد اس سے محبت عقیدت اور تعلق پیدا ہوگا۔پھر اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور عبادت کی طرف میلان پیدا ہوگا۔ آخرت، دین اور خدا و رسول کی طرف طبیعت رجوع کرے گی اور یہی حاصل ہے وعظ کا، نصیحت کا اور تقریر کا۔غرض عقل اس عالم میں غور و فکر انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اور مفت کا واعظ ہے۔

موت ایک خاموش واعظ ......دوسرا بڑا واعظ موت ہے۔اگر انسان موت پر اس کے احوال پر اور یہ کہ موت کے بعد کیا پیش آنے والا ہے؟ اور یہ کہ ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ کیا رہا؟ اور موت کے بعد خدا ہم سے کیا معاملہ کرے گا؟ ان احوال پر غور کرنا خود دین اور منشاء شریعت ہے۔موت کی یاد سے خدا یاد آتا ہے، آخرت کی یاد آتی ہے، دنیوی لذات سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔اور یہی حاصل ہے وعظ کا اور نصیحت کا۔حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا. انسان کے لئے بڑا واعظ موت ہے۔دوسری حدیث میں ارشاد ہے اَکْثِرُوْا ذِکْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ لذتوں کو مٹانے والی (موت) کا ذکر زیادہ کیا کرو۔موت سے غافل نہ ہو۔موت کا دھیان ہر وقت

رکھا کرو۔ اس سے دنیا میں اس کی لذات اور آرائشوں میں انہماک کم رہے گا۔ آخرت کی توجہ ہوگی۔ عبادت اور اطاعت میں جی لگے گا اور یہی اصل ہے وعظ کا۔ غفلت بہت بری چیز ہے۔ غفلت سے انسان خسارہ اور نقصان میں رہتا ہے، دنیاوی معاملات میں رات دن کا مشاہدہ ہے، بارش کے وقت اگر کاشتکار آرام میں رہے۔ ٹھنڈی ہوا اور سہانے وقت کے عیش میں پڑا رہے، نہ کھیت پر جاوے اور نہ بیج ڈالے نہ تولائی کرے اور نہ کھیت کی دیکھ بھال کرے تو ظاہر ہے کہ جب دوسرے کاشت کار اپنی لہلہاتی ہوئی کھیتی دیکھ کر خوش ہوں گے اسے کاٹیں گے۔ غلہ اور اناج گھر لائیں گے تو یہ غافل کاشت کار کف افسوس ملے گا اور شرمندہ ہوگا لیکن اس نے وقت کھو دیا وقت کو ضائع کر دیا۔ غفلت اور لاپرواہی برتی۔ افسوس اور پچھتانا اب کچھ کام نہیں دے گا۔ بعینہٖ یہی حال آخرت کا ہے۔ حدیث میں ہے "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ" ① "دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔

دنیا میں اگر انسان توجہ سے دھیان سے کام کرتا ہے۔ غفلت نہ برتے، وقت کو ضائع نہ کرے، قلب میں ایمان کا بیج ڈالے، اعمال سے اس کی آبپاشی کرے، خیر خیرات اور صدقات سے اس کی دیکھ بھال اور تولائی کرتا رہے، موت کو یاد رکھے، اعمال کا محاسبہ اور نفس کا مراقبہ کرتا رہے تو آخرت میں سرخرو ہوگا۔ کامیاب ہوگا اور فائز المرام ہوگا ورنہ نقصان میں رہے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا "اَلنَّاسُ نِيَامٌ اِذَا مَاتُوْا فَانْتَبَهُوْا" ② لوگ سورہے ہیں۔ غفلت میں ہیں۔ جب مریں گے حساب و کتاب دیں گے۔ سوال و جواب ہوگا۔ اس وقت چونکیں گے، غفلت سے بیدار ہوں گے لیکن دور اندیش اور عاقبت بیں وہ انسان ہے جو سوال و جواب، حساب و کتاب اور محاسبہ سے پہلے ہی اپنا حساب پاک و صاف رکھے نفس کا مراقبہ کرتا رہے۔

روزمرہ کے واعظ..... فرمایا گیا: "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا" ③ مرنے سے پہلے اپنے کو مرا ہوا سمجھو۔ محاسبہ سے پہلے اپنے اعمال اور احوال کا حساب کرلو، پاک و صاف ہو کر جاؤ۔ خدا کے دربار میں سرخرو پاک و صاف ہو کر حاضر ہو۔ غرض موت بھی انسان کے لئے بہت بڑا واعظ ہے۔ موت سے پہلے مرض، بیماری، بڑھاپا، مصائب اور تکالیف بھی کم از کم مسلمان کے لئے واعظ اور مذکر کا درجہ رکھتے ہیں۔ انسان کو غور و خوض، دھیان اور توجہ کی ضرورت ہے۔ غفلت اور سستی چھوڑ دو۔ ہمت اور عزم و استقلال سے کام لو۔ تم تھوڑا کرو۔ خدا زیادہ توجہ کرے گا۔ تم خدا کی طرف ایک قدم بڑھو گے تو خدا دو قدم بڑھے گا۔ "مَنْ اَتٰی اِلَیَّ شِبْرًا اَتَیْتُهٗ

① المقاصد الحسنة، قال السخاوي لم اقف عليه مع ايراده الغزالي له في الاحياء، حرف الدال، ج: ١، ص: ١١٨.

② یہ حضرت علی کا قول ہے۔ دیکھئے: كشف الخفاء ٢/٣١٢.

③ حدیث کے پہلے حصے "موتوا قبل ان تموتوا" کے بارے میں علامہ عجلونی فرماتے ہیں: قال الحافظ ابن حجر هو غير ثابت وقال القاري: هو من كلام الصوفية، دیکھئے: كشف الخفاء ج: ٢ ص: ٢٩١ جبکہ دوسرا حصہ "حاسبوا قبل ان تحاسبوا" حضرت عمر کا قول ہے، دیکھئے: مصنف ابن ابي شيبة، كلام عمر بن الخطاب ج: ٨ ص: ١٤٩.

ذِرَاعًا وَمَنْ اَتٰى اِلَیَّ ذِرَاعًا اَتَیْتُهٗ بَاعًا وَمَنْ اَتٰى اِلَیَّ مَشْیًا اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً“۔ (1) ”جو میری طرف ایک بالشت آوے میں اس کی طرف ایک ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ آوے میں اس کی طرف ایک قدم یا ایک گز آتا ہوں اور جو میری طرف متوسط رفتار سے چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں“۔ (الحدیث) کیا ٹھکانا ہے اس کی رحیمی اور کریمی کا۔ بہتر اس کی رحمت اور کرم لینے کو لینے کی اہلیت کے ساتھ ساتھ سعی اور کوشش کو بھی دخل ہے۔ تمہاری ادنیٰ توجہ سے خدا کی زیادہ توجہ ہوگی اور تم ان شاء اللہ کامیاب اور فائز المرام ہو کر دنیا سے جاؤ گے۔

نصیحت اور دعا پر تقریر ختم فرمائی۔

(1) الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: ویحذرکم اللہ نفسہ ج: ۲۰۲ ص: ۴۰۹۔

اظہارِ تعزیت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ﴾① (صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ)

موت کا جام......

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خوابِ ہستی کی ؎ کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

بزرگانِ محترم! دنیا میں موت و حیات کا سلسلہ ابتدائے آفرینشِ عالم سے جاری ہے، ولادتیں بھی ہو رہی ہیں اور موتیں بھی آ رہی ہیں، ولادت کے بعد موت سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔ عالم میں ہر کلیہ میں کچھ نہ کچھ مستثنیات نکلتے ہیں۔ مگر جس کلیے سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں وہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ...... کا کلیہ ہے، جب انبیاء اور اولیاء اور دنیا کے بڑوں میں امراء و سلاطین مستثنیٰ نہیں رہے تو کون ہے کہ موت کے پنجے سے اسے بچا ہوا باور کر لیا جائے۔ پس جو بھی پیدا ہوتا ہے اس کی آخری منزل موت ہی ہے۔

ہر آں کہ زاد بنا چار بایدش نوشید ؎ ز جامِ دہر مئے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

یعنی جو بھی پیدا ہوا ہے اسے بہر حال موت کا جام نوش کرنا ہے۔

فَاِنَّ الْمَوْتَ غَایَۃُ کُلِّ حَیٍّ "موت ہی ہر زندہ کی آخری منزل ہے" اسی لئے ولادتوں کے ساتھ موت کا سلسلہ بھی دنیا میں قائم ہے اور رہے گا۔

کسی کا کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے ؎ کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے

عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر ؎ کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

فرقِ مراتب...... لیکن ولادت و موت سب کی یکساں نہیں ہوتی بلکہ جیسے پیدا ہونے اور مرنے والے مختلف

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۵۷.

مراتب کے لوگ ہوتے ہیں ایسے ہی ان کی ولادتوں اور موتوں میں تفاوت اور فرق مراتب ہوتا ہے کسی کی پیدائش صرف ماں باپ کے لئے خوش کن ہوتی ہے۔ کسی کی خاندان بھر کے لئے باعث مسرت ہوتی ہے۔ کسی کی ولادت پر پورا شہر خوشی کرتا ہے اور کسی کی پیدائش پر ملک بھر اور دنیا میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ ایسے ہی موت بھی برابر نہیں۔ کسی کے مرنے پر کوئی بھی رونے والا اور میراث بانٹنے والا نہیں ہوتا۔ جیسے حدیث شریف میں ارشاد ہے **قَلَّتْ بَوَاكِيهِ وَقَلَّتْ تُرَاثُهُ** "نہ اس کے رونے والے نہ میراث لینے والے"۔

کسی کی موت پر صرف اس کے ماں باپ یا قریبی عزیز غم کر لیتے ہیں۔ کسی کی موت صرف خاندان کے لئے غم ساتھ لاتی ہے، کسی کی موت سے شہر کا شہر سوگوار ہو جاتا ہے اور کسی کی موت پر شہر ہی نہیں ضلع اور صوبہ روتا ہے۔ خان بہادر مرحوم انہیں لوگوں میں سے تھے کہ جن کی ولادت بھی صرف ایک گھر کی خوشی نہ تھی بلکہ کئی خاندانوں اور ایک پورے علاقہ کی خوشی تھی۔

احسانات کا غم...... اور آج جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کا غم بھی صرف ان کے گھر کا غم نہیں بلکہ خاندانوں پورے شہر والوں پورے ضلع والوں بلکہ بعض حیثیات سے پورے صوبے کا غم ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی کسی کی ذات کو نہیں روتا، بلکہ اس کے اوصاف کو، اس کے احسانات کو اور اس کی خوبیوں کو روتا ہے۔ ٹھیک اس وقت جب کہ اچھے اوصاف کا انسان مرنے کے وقت ہنستا ہوا اور خوش ہوتا ہوا اپنے اللہ سے ملتا ہے اس وقت دنیا روتی ہوتی ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

یاد داری کہ وقت زادن تو	ہمہ خنداں شوند تو گریاں
آں چناں زی کہ وقت مردن تو	ہمہ گریاں شوند تو خنداں

تجھے یاد بھی ہے کہ تیری پیدائش کے وقت تو تو رو رہا تھا اور سب خوشی سے ہنس رہے تھے۔ بس زندگی ایسے گزار کہ مرنے کے وقت تو تو خوشی سے ہنستا ہوا ہو اور سب روتے ہوئے ہوں۔" تو یہ واقعہ ہے کہ خان بہادر مرحوم اسی شعر کے مصداق تھے کہ وہ تو انشاء اللہ اپنے نیک کردار کے سبب ہنستے ہوئے اپنے مالک سے جا ملے اور دنیا آج ان کے ماتم میں رو رہی ہے تو یہ رونا ان کی ذات کا نہیں بلکہ ان کے اوصاف اور خوبیوں کا ہے جو آج ہم سے چھن گئی ہیں۔

سلامتی فطرت...... خان بہادر مرحوم کی جوانی اور پیری میرے سامنے گزری ہے۔ میرا لڑکپن تھا اور وہ جوان تھے ان کی زندگی کا ایک عجیب اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی اور وہ لڑکپن میں بلا مربی کے رہ گئے تھے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ ایک نونہال جو خاندانوں کی آنکھ کا تارا ہو اور دولت سے گھر بھرپور ہو تمام وسائل زندگی اور مال وجاہ خاندانی طور پر ورثہ میں ملا ہو اور اوپر سے کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہ ہو تو ایسی حالت میں مال و دولت کی فراوانی کی جو بری لت بھی پڑ جائے وہ حیرت انگیز نہیں ہوتی۔ ہزاروں رئیس زادے اس طرح بگڑتے دیکھے گئے کہ سر پر بڑا اور مربی نہ رہا اور خاندانی دولت بلا محنت ہاتھ لگ گئی تو

بدکاریوں اور برائیوں میں مبتلا ہو کر دولت بھی برباد کردی، جائیداد بھی ضائع کردی اور خاندانی وجاہت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ لیکن یہ خان بہادر کی ہستی تھی کہ گھر کی ریاست ہاتھ میں ہے سر پر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں لیکن اپنی سلامتی فطرت سے وہ کسی بری لت کے شکار نہیں ہوئے، کسی عیاشی کسی تعیش، کسی فضول خرچی، کسی نمود ونمائش کے چکر میں نہیں پھنسے ان کی جائیداد نہ صرف یہ کہ محفوظ ہی رہی، بلکہ باغ وراغ کا اس میں بھی اضافہ ہوا۔

یہ بلاشبہ ان کے قلب کی سلامتی اور فطرت کی خوبی تھی کہ وہ خود بخود اسی راہ پر چلے جس پر نیک دل رئیس کو چلنا چاہئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خدا نے انہیں دولت کے ساتھ عزت کے خزانے بھی بخشے، وہ آنریری مجسٹریٹ بھی ہوئے، چیئرمین بھی ہوئے اور برسہا برس رہے۔ صوبائی کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ اونچی سوسائٹی میں ان کا مقام بھی بنا اور شہر یا ضلع ہی کے نہیں صوبہ کے نمائندہ کی حیثیت سے وہ صوبہ بھر کے بڑوں میں شمار ہوئے، دوسرے لفظوں میں انہوں نے پوری صوبائی ملت کا اعتماد حاصل کرلیا جو ہر ایک کو میسر نہیں آتا۔

ضمیر کی سچائی...... ساتھ ہی اس سے بھی زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ وہ جس حالت میں قوم کے معتمد علیہ تھے اسی حالت میں گورنمنٹ کے بھی معتمد علیہ تھے۔ اعتماد کا آخری ڈپلومہ سرکاری خطاب ہے۔ سو وہ بھی گورنمنٹ کی جانب سے انہیں عطاء ہوا اور پھر عجیب تر یہ ہے کہ قوم اور گورنمنٹ کا ان پر اعتماد بیک وقت اس وقت بھی بدستور قائم رہا جب کہ قوم اور حکومت میں کشمکش اور مقابلہ ٹھن گیا اور جو لوگ قوم میں معتمد تھے ان کا اینٹی گورنمنٹ ہونا لازمی تھا اور جو گورنمنٹ کے معتمد علیہ ہوتے تھے ان کا اینٹی قوم ہونا ضروری تھا لیکن خان بہادر کے قلب کی یہ جامعیت اور صفائی حیرتناک ہے کہ وہ اس کشمکش کے دوران میں بھی بدستور قوم اور گورنمنٹ دونوں ہی کے معتمد علیہ رہے۔ کس طرح رہے؟ بعض لوگ دورخا اعتماد نفاق سے حاصل کرتے ہیں کہ جدھر جاتے ہیں ادھر ہی کی کہہ کر آتے ہیں۔ لیکن یہ اعتماد وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ اس نتیجہ میں انسان دونوں جانب سے دھتکار دیا جاتا ہے۔ خان بہادر نے ان دونوں متضاد جانبوں کا اعتماد اپنے ضمیر کی سچائی سے حاصل کیا۔ وہ گورنمنٹ اور قوم کے سامنے سچائی سے وہی بات کہتے تھے جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی تھی۔ بے غرض کہتے تھے، وہ کسی لالچ یا طمع سے کبھی بھی کسی کے سامنے نہیں آئے۔ وہ گورنمنٹ پر تو قوم کے اثرات کا دباؤ ڈال کر گورنمنٹ کو قوم کی بھلائی کے لئے ہموار کرتے تھے اور قوم کو سچائی کے ساتھ اس کی موافقت ومخالفت کی پرواہ کئے بغیر اپنے ضمیر کی بات پہنچا دیتے تھے جس میں ان کے نزدیک قوم کی بھلائی وبہبودی ہوتی تھی، ان کی یہ سب باتیں اس قدر سلجھی ہوئی اور بااصول ہوتی تھیں کہ انہیں مانے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا تھا، اس لئے قوم اور حکومت دونوں ان پر اعتماد کرنے میں مجبور تھے۔ بہرحال ان کے پیچھے جاہ ومال کی کوئی بری لت نہ تھی، جس سے ان کی دنیوی جاہ وعزت بڑھی، دولت نے ترقی کی اور اونچی سوسائٹی نے انہیں قبول کیا اور دنیاوی حیثیت سے وہ کبھی کسی تنزل سے دوچار نہیں ہوئے۔

دینی مقبولیت...... ہاں! جوانی میں اگر ان کے پیچھے کوئی دولت لگی تو وہ بزرگان دین کی طرف رجوع ان کی

مجلسوں میں بیٹھنا ان کی عادت بنی۔ یہ بھی ان کے ضمیر کی خوبی اور دل کی ہدایت کی بات تھی کہ لت بھی لگی تو وہ جو دنیا و آخرت میں مقبولیت کا ذریعہ بنے اور ان کی عزت کو پار چاند لگا دیئے۔ مجھے یاد ہے کہ ہر دوسرے تیسرے روز حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس نشینی۔ میرے والد صاحب قبلہ کی مجلس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں بیٹھنا ان کی زندگی کا ایک جزو بن گیا تھا۔ اکثر و بیشتر والد مرحوم کے ساتھ ان کے گھر پر آنا مجالس میں بیٹھ کر کچھ حاصل کرنا ان کا امتیاز بن گیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ نیکوں میں بیٹھ کر آدمی نیک اور بدوں میں بیٹھ کر بد ہوتا ہے۔ خان بہادر جیسے سلیم الطبع انسان کو دل کی سلامتی کے ساتھ جب مجلسیں بھی اہل خیر کی ملیں تو ان کی طبعی نیکی اور زیادہ دوبالا ہوگئی۔ ماہِ رمضان میں مجھے یاد ہے کہ کئی کئی بار میرا قرآن شریف سننے مسجد دارالعلوم میں آتے اور تراویح کے بعد ان بزرگوں کی مجلس میں بیٹھ کر طویل صحبت حاصل کرتے تھے جس سے دنیوی مقبولیت کے ساتھ انہیں دینی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

اعتمادِ اکابر...... اور وہ جس طرح گورنمنٹ اور قوم میں معتمد علیہ تھے اسی طرح دینی طبقہ اور جماعت علماء میں بھی معتمد علیہ بن گئے، ان کی زندگی کا عنوان ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ جس طبقہ میں بھی پہنچ جاتے تھے اس کا اعتماد لے کر واپس ہوتے تھے۔ جو ان کی طبیعت کے بے لوث اور صاف ہونے کی دلیل ہے۔ گورنمنٹ کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ خطاب یافتہ ہوئے۔ قوم کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ کونسل کے نمائندہ (ممبر) منتخب ہوئے، شہر کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ دیوبند کے چیئرمین ہوئے تو علماء کا اعتماد حاصل کر کے وہ دارالعلوم دیوبند کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۳۵۳ء سے ۱۳۷۲ء تک اکیس برس انہوں نے رکنیت کی یہ خدمات اس خوبی اور دیانتداری سے انجام دیں کہ ان کے دوست اور مخالف سب ان سے خوش رہے، جس کی بڑی وجہ دہی تھی کہ وہ ہر اقدام اپنے ضمیر کی سچائی سے کرتے تھے۔ کسی رو رعایت سے ان کے یہاں کام کی انجام دہی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ ان کے بڑے اور چھوٹے سب ان کے مداح تھے۔ کوئی بھی ان سے نالاں اور گریاں بریاں نہ تھا کیوں کہ نہ وہ خود غرضی سے کام کرتے تھے نہ انتقامی جذبات سے کام لیتے تھے، بلکہ اصول پسندی سے ان کی رائے اور عمل کا کام انجام پاتا تھا۔ اس دینی سلسلہ کی رکنیت اور علماء کی صحبت و معیت کا انجام دنیوی بہبود و فلاح کے ساتھ اخروی کامیابی کی صورت میں نمایاں ہوا، نماز، روزہ کی پابندی، زکوٰۃ کا حساب کتاب، حج کی توفیق، مسلمانوں کی اخلاقی اور مالی امداد کے کام ان سے بے تکلف سرزد ہوتے تھے۔ مدینہ منورہ کے غرباء کی امداد گھر بیٹھ کر کرتے تھے۔ دو مرتبہ ان کے عطیات کا امین میں خود بنا اور ان کے منشاء کے مطابق ان کی رقم مدینہ منورہ میں تقسیم کی گئی۔ پس مرحوم ان خوش نصیب افراد میں سے تھے جنہیں دنیا کے ساتھ دین اور جائز عیش کے ساتھ طاعات و عبادت کی توفیق بھی بخشی گئی۔

انفرادی اعتماد...... آج اگر یہ شہر اور ضلع خان بہادر کو رو رہا تھا تو وہ ان کی ذات کو نہیں بلکہ ان کے اوصاف کو رو رہا ہے جن کی بدولت وہ ہر طبقہ میں مقبول، ہر طبقہ کے معتمد علیہ تھے اس پر مزید خوبی ان کی بے تکلفی تھی بڑے ہی نہیں

چھوٹوں کے ساتھ بھی ایسے اخلاق سے پیش آتے تھے کہ چھوٹا انہیں بڑا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کیونکہ وہ خود اپنی نگاہ میں اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ برادری میں برابر کے بھائی کی طرح، بزرگوں میں نیک سرشت خوردوں کی طرح اور خوردوں میں مشفق بزرگوں کی طرح پیش آتے تھے جس سے انفرادی اعتماد بھی ان کا افراد میں قائم تھا۔

بہرحال یہی وہ اوصاف اور خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے شہر اور ضلع سوگوار ہے اور غم میں گریاں ہے۔ چنانچہ آج کی مجلس میں بھی وہی مجلس غم اور تعزیت کی مجلس ہے جو شہر کی طرف سے منعقد ہوئی ہے۔ اس مجلس کا موضوع یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کے غم کو جو چھپایا نہیں جاسکتا اور دل میں اس کی سمائی مشکل نظر آ رہی ہے کھول دیں۔ اور آنکھیں اگر روتے روتے تھک گئی ہیں تو دل کو ہی گریہ وبکا سے ہلکا کر لیں۔

لیکن میں اپنے بزرگوں کی خدمت میں ادب سے عرض کروں گا کہ رونا اور غم کرنا نہ کوئی فائدہ مند بات ہے نہ اس سے دنیا وآخرت کا کوئی نفع متعلق ہے اگر رونے اور غم کرنے سے جانے والا واپس ہو جایا کرتا تو سو برس تک بھی رونا بند نہ کیا کرتے۔ بقول عرفی کے ؎

عرفی گر بگریہ میسر شدے وصال ‏ ‏ ‏ صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

''اے عرفی اگر رونے سے مرنے والا مل جایا کرتا تو سو سال بھی ہم رونے سے نہ تھکتے اور روتے رہتے''۔

رسمی نوحہ وبکاء...... لیکن رونا اور غم کرنا کسی کو واپس نہیں لاسکتا اس لئے شریعت کے نزدیک غم لے کر بیٹھنا اور بہ تکلف اسے نمایاں کرنا جاہلیت کی رسم قرار دیا گیا ہے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا کہ بڑے لوگ مرتے وقت وصیت کر جایا کرتے تھے کہ ہمیں برس دن رویا جائے تاکہ دنیا پر واضح ہو کہ کوئی بڑا شخص دنیا سے اٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ برس دو برس کون ہے کہ دل سے روئے کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں رونے والیاں کرایہ پر رکھی جاتی تھیں اور انہیں اجرت دے دے کر رلایا جاتا تھا، جب کوئی تعزیت اور پرسہ کے لئے آتا تو وہ جلدی سے حلقہ باندھ کر بیٹھتیں اور آوازیں ملا کر نوحہ وبکاء کرنا شروع کر دیتیں۔ موکر اشعار اور غم افزا کلمات سے دلوں کو پگھلاتیں اور لوگ آنسو پونچھ کر یہ کہتے ہوئے چلے جاتے کہ حقیقتاً ایک بڑا آدمی دنیا سے اٹھ گیا جس کا یہ سوگ کیا جارہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس رسمی رونے میں نہ رونے والیوں کا دل شریک ہوتا نہ رونا دیکھنے والوں کا۔ دونوں سازی سے روتے تھے برادری یا شہر کو دکھلانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے۔

میت کی راحت رسانی...... اس لئے ہماری مجلس اور ہماری انفرادی نشست کا موضوع غم وماتم نہ ہونا چاہئے کہ یہ رسم جاہلیت ہے۔ بلکہ موضوع یہ ہونا چاہئے کہ ہم سے تو میت کو نفع پہنچے اور میت سے ہمیں نفع پہنچے۔ شریعت نے ہم سے میت کو نفع پہنچنے کی صورت تو ایصال ثواب بتلائی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ ''قبر کے اندھیرے گھرانے میں میت اپنے گھر والوں سے آس باندھتا ہے کہ شاید مجھے کوئی یاد کرے اور شاید مجھے کوئی ثواب پہنچا دے''۔ حدیث شریف میں ہے کہ ''قبر میں میت کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی بچہ دریا میں منجدھار

کے تنکے لے کھارہا ہو اور اسے تنکا بھی ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے بھی اپنا سہارا سمجھتا ہے، ٹھیک اسی طرح میت قبر میں راحت ونجات کی خاطر اپنے وارثوں اور دوستوں سے آس لگائے رہتا ہے کہ کاش مجھے کوئی یاد کرے اور ثواب پہنچائے جو میرے لئے تنکے کا سہارا ہو جائے"۔ سو خان بہادر کی خیر خواہی یا ان کے حقوق کی ادائیگی جو ہم سب کے ذمہ ہے یہ نہیں ہے کہ اس نیک ہستی کے غم میں ہم چار آنسو بہالیں اور رومال سے آنکھوں کو پونچھ کر اپنے گھر روانہ ہو جائیں بلکہ یہ ہے کہ ان کی راحت رسانی کا سامان بہم پہنچائیں اور وہ ایصال ثواب ہے۔

ایصال ثواب کی آسانی...... کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر ہر شخص روزانہ یا دوسرے تیسرے روز قل ھو اللہ شریف تین بار پڑھ کر مرحوم کو ثواب اور دعا میں یاد کرلیا کرے۔ قل ھو اللہ کو تین دفعہ پڑھنے کا ثواب حدیث شریف میں ہے کہ "ایک پورے قرآن کے ثواب کے برابر ہے"۔

اللہ نے کس قدر آسانی فرمادی کہ دو منٹ میں تین دفعہ قل ھو اللہ پڑھو اور ثواب حاصل کرو جو دس بارہ گھنٹے کی محنت سے پورا قرآن شریف پڑھ کر حاصل ہوتا ہے اس لئے چند آنسو بہالینا یا چند کلمات تعزیت زبان سے ادا کر دینا مرحوم کی خیر خواہی نہیں بلکہ ایصال ثواب کرنا حقیقی خیر خواہی ہے خواہ جان سے جیسے تلاوت نماز اور دوسری عبادات کا ثواب پہنچانا یا مال سے جیسے غرباء ومساکین کو بہ نیت ایصال ثواب کھانا یا کپڑا پہنچانا وغیرہ۔

محاسن مرحوم...... پس ہماری مجلس یا انفرادی نشست کا ایک موضوع تو بحکم شریعت یہ ہونا چاہئے کہ ہم میت کو نفع پہنچائیں اور دوسرا موضوع یہ ہے کہ میت سے ہم خود نفع حاصل کریں اس کی صورت شریعت نے یہ بتلائی ہے کہ **اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ** ① "اپنی میت کی خوبیاں بیان کیا کرو"۔ تاکہ ان خوبیوں کے تذکرہ سے ایک طرف تو میت کی طرف سے قلوب میں محبت پیدا ہو اور محبت کے داعیہ سے لوگ اسے ثواب ودعا سے یاد رکھیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی خوبیوں کے تذکرہ سے خود ہم میں ان خوبیوں کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور ہم بھی اس کے نقش قدم پر چل کر وہی مقام حاصل کریں جو مرنے والے نے حاصل کیا تھا۔ پس! ایصال ثواب سے میت کو ہم سے کچھ ملتا ہے اور میت کے عمدہ تذکرہ سے ہمیں میت سے کچھ ملتا ہے۔ اس لئے ہماری اس مجلس کا موضوع رونا اور اظہار غم کرنا نہیں ہونا چاہئے بلکہ خان بہادر مرحوم کو نفع پہنچانا اور ان سے خود نفع حاصل کرنا ہونا چاہئے۔

مرحوم کی یادگار...... خان بہادر مرحوم کی عمدہ ترین یادگار "یہ ہائی اسکول ہے جو تنہا انکی کوششوں سے قائم ہوا۔ اور اس وقت قائم ہوا جب کہ سب اس کے قیام سے مایوس تھے لیکن ان کی ہمت مردانہ تھی کہ مایوسیوں کے ہجوم میں پامردی کے ساتھ وہ کھڑے ہوئے اور اسکول قائم کر کے چھوڑا، جس کا نفع آج قصبہ کے ہندو، مسلمان دونوں کو پہنچ رہا ہے۔ درمیانی مدت میں ایسا وقت بھی آیا کہ اسکول باقی رہنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، مرحوم نے مجھ سے بھی اس کا تذکرہ فرمایا اور یہ کہ لوگوں کو اس کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے۔ میں نے بھی ان کے بزرگانہ ارشاد کی

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی النھی عن سب الموتیٰ ج: ۱۳ ص: ۵۱.

تکمیل میں انکی جدوجہد کی اور اس میں کامیابی ہوئی جس پر ہمیشہ ممدوح مسرت کا اظہار فرماتے تھے لیکن حقیقتاً یہ کام صرف ان کی ہمت مردانہ کا نتیجہ تھا کہ اسکول کو مایوسیوں کے ہجوم میں بھی چلاتے رہے۔ حتیٰ کہ انہیں کتنے ہی ماہ تنخواہ میں اپنی ذات سے ہزاروں روپیہ خرچ کرنا پڑا۔ مگر اس کارِ خیر سے نہ ہٹے۔ علم کی بقاء کا راستہ پیدا کرنا خواہ وہ کسی بھی چیز کا علم ہو امرِ خیر ہے۔ جبکہ حسن نیت سے ہو اور صدقہ جاریہ ہے کیوں کہ عمل تو عامل کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے لیکن علم عالم کے ساتھ یا علم کا انتظام کرنے والے کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ باقی رہتا ہے۔ یہ مادی دولت نہیں ہے کہ اسے جتنا خرچ کرو گھٹتی ہے بلکہ روحانی دولت ہے کہ جتنا خرچ کرو بڑھتی ہے۔

اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ ان کے اور محاسن کے ساتھ ان کے اس صدقہ جاریہ کو باقی رکھنے کی امکانی سعی کرتے رہیں، جس سے مرحوم کی روح خوش رہے گی اور اجر دائمی سے متمتع ہوتی رہے گی۔ بہر حال رونے اور غم والم کے اظہار کے بجائے ہمارا کام ایصالِ ثواب اور ذکرِ محاسن ہونا چاہئے کہ یہی ان کے دلوں میں ہمہ وقت زندہ رہنے کی سبیل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خان بہادر مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقامات عطا فرمائے اور جس طرح انہیں دنیا میں اس نے قبول فرمایا تھا اس طرح آخرت میں انہیں قبول فرمائے اور ان کے پسماندگان اور تمام وارثوں اور عزیزوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلائے اور صبر و تسلی عطا فرمائے۔ ہم سب ان کے دکھ درد کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

جامع مذہب

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

جامع مذہب ..... آیت کے ذیل میں دین اسلام کو جامع بتلایا۔ یہود ونصاریٰ کی مختلف جزئیات کو پیش کرتے ہوئے یہ واضح فرمایا کہ دین اسلام پچھلے تمام آسمانی دینوں اور ملتوں کا جامع بنایا گیا ہے، اس دین میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی سختی موجود ہے وہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی نرمی اور درگزر بھی موجود ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہیں اگر کوئی ایک تھپڑ مارے تو تم بھی ایک تھپڑ مارو۔ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہارے گال پر اگر کوئی ایک طمانچہ لگائے تو تم دوسرا گال بھی پیش کردو۔

دین اسلام میں نہ وہ سختی ہے اور نہ یہ نرمی ہے، بین بین کا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ ② "برائی کا بدلہ برائی لیکن اتنا ہی"۔ اس کی وضاحت دوسری آیت میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ اگر تمہاری کوئی ایک آنکھ پھوڑے تو تم بھی اس کی ایک آنکھ پھوڑ دو تمہاری ناک پر اگر کوئی گھونسہ مارے تو تم بھی اس کی ناک پر ایک گھونسہ مارو تمہارے کوئی اگر دانت توڑ دے تو تم بھی اس کا ایک دانت توڑ دو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاف کردیا جائے تو اس کی بھی اجازت ہے گویا بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے اور معاف کردینے کی بھی اجازت ہے۔ اس طرح اس دین میں شریعت موسوی بھی آگئی ہے اور شریعت عیسوی بھی آگئی۔ متعدد واقعات اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے اس نکتہ کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح اسلام سے پہلے مختلف ادیان اور مختلف شریعتیں جاری تھیں اور آپس میں اختلاف اور عداوتوں کی خلیج روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اسلام نے آکر اختلاف اور عداوتوں کی خلیج کو پاٹا، اتفاق واتحاد پیدا کیا اور تمام اقوام عالم کو

① پارہ: ۶، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۳۔ ② پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۴۰۔

ایک دین پر جمع کر دیا۔

طبقاتی اجتماعیت ...... اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ہندوستان کے تمام مذہبی طبقات بلکہ اُمراء کو، صوفیاء کو، سلاطین کو، وزراء کو غرض ملک میں پھیلے ہوئے تمام منتشر طبقات کو جمع کرنے کی کوشش کی، خطوط روانہ فرمائے پیغامات روانہ کئے اور حقیقت کے تمام طبقات کو ایک نقطہ پر جمع فرمایا۔

دارالعلوم کی شانِ اجتماعیت ...... یہ دارالعلوم دیوبند بھی اپنے مورث اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے طرز پر قائم کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند سے پہلے ہندوستان میں اہلِ علم کے مختلف طبقے تھے۔ کوئی متکلم اور کوئی منطقی تھا، اور کوئی اہلِ حدیث تھا، کوئی اہلِ قرآن تھا، کوئی فلسفی تھا، مگر دارالعلوم کے اکابر، اس کے بانیوں نے ایک ایسا نصاب جاری فرمایا جس سے ملک کے تمام طبقوں میں وحدت اور یکسانیت پیدا ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند نے سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں محدثین پیدا کئے، ہزاروں مفسرین قرآن اور متکلم پیدا کئے جنہوں نے دین اسلام کی حقانیت، اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کی۔ دارالعلوم کا فاضل بیک وقت محدث بھی ہے مفسر بھی ہے متکلم بھی ہے مبلغ اور صوفی بھی ہے، حق تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسی جامعیت اور مرکزیت عطا فرمائی ہے کہ اس کے فضلاء دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور دینی خدمت کر رہے ہیں یہ وہی جامعیت اور مرکزیت ہے جس پر شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ملک کے تمام طبقات کو جمع فرمایا۔

وفاق المدارس...... دارالعلوم دیوبند نے اجلاس صد سالہ کے موقع پر متعدد اہم و مفید اور کارآمد تجاویز منظور کرائیں۔ ان تجاویز میں سے ایک اہم تجویز وفاق المدارس کی بھی ہے اس تجویز کا مقصد بھی ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے، اگر ہندوستان کے تمام مدارس ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ دارالعلوم دیوبند پہلے سے بنا بنایا مرکز موجود ہے تو اس میں نفع دونوں کا ہے۔ مدارس اور مکاتب کا بھی اور دارالعلوم دیوبند کا بھی، ملک میں پھیلے ہوئے مدارس کی خدمات سے دارالعلوم باخبر رہے گا۔ مدارس کے فضلاء اور تعلیم یافتہ حضرات کی شہرت اور ان کی خدمات سامنے آئیں گی۔ مدارس اپنے مرکز دارالعلوم دیوبند کی خدمات، حذمات اور کارگزاریوں سے واقف ہوں گے۔ تو یہ وفاق مدارس کی تجویز ایسی تجویز ہے۔ جس کے روبہ عمل آجانے کے بعد فضلاء کی تنظیم بھی قائم ہو جائے گی۔ تنظیم فضلاء تنہا کوئی مقصد ہے نہ اس پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اصل وفاق المدارس اور تنظیم مدارس ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب منظم ہو کر اپنے مرکز کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے تو فضلاء کی تنظیم خود بخود قائم ہو جائے گی کیوں کہ ان مدارس اور مکاتب کے چلانے والے اس کے اساتذہ اور ذمہ دار اکثر و بیشتر فضلاء دارالعلوم ہی ہیں۔

افاداتِ علم و حکمت

مختلف علمی سوالات کے جوابات کے سلسلے میں
حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کا اظہارِ خیال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا

حسنِ نیت سے حرام حلال نہیں بنتا...... ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر قوم نے اپنے قومی مفاد کے خیال سے کچھ فنڈ جمع کیا، مثلاً لاکھ دو لاکھ روپیہ اور پھر یہ سمجھ میں آیا کہ اس رقم کو بطورِ قرض تاجروں کو دیں اور چونکہ تاجر بہر صورت بینک سے سودی قرض لیتا ہے تو کیوں نہ ہم اس رقم کا سود وصول کریں تاکہ فنڈ قائم رہے اور ترقی کرتا رہے اور قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے تو قوم کی یہ ہمدردی اسلامی شریعت کے نزدیک جائز ہے یا نہیں؟

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ سود کا مسئلہ تو واضح اور کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ اجتہادی یا فروعاتی مسئلہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے: ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ ① ''اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا'' (القرآن) سود کسی بھی نوعیت سے ہو وہ حرام ہی رہے گا اور قومی ہمدردی اگر حرام طریق سے ہو تو وہ مستقل وبالِ جان بنے گی دنیا میں بھی آخرت بھی میں کسی عمل کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں جب تک کہ وہ عمل شریعت کے مطابق نہ ہو۔ اچھی نیت سے اگر کوئی گناہ کرے تو وہ نیکی نہیں بن جائے گا اور نہ ہی اس نیت کا کوئی اعتبار ہوگا۔

جب دو چیزیں تھیں بیع اور سود۔ ایک کو حلال قرار دیا اور ایک کو حرام۔ تو بجائے اس کے کہ اس پر سود لیں اور صریح حرام کے مرتکب ہوں، خود بھی گناہ میں مبتلا ہوں اور قوم کو بھی گناہ میں مبتلا کریں۔ اس کو کسی تجارت میں کیوں نہ لگا دیں، خواہ ایک شخص وکیل بن جائے۔ سب کی طرف سے نفع و نقصان کا شریک رہے اور اس منافع سے وہ قوم کی خدمت کرے کہ وہ سرمایہ بھی باقی رہ سکتا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ محض سرمایہ کو رکھنے کے لئے ایک حرام شکل اختیار کی جائے کہ وہ راس المال کو بھی حرام اور ناجائز کر دے تو اس سے قوم کو فائدہ نہیں بلکہ ضرر پہنچے گا، یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کھلے طور پر کیسے خلاف ورزی کریں گے محض اس نیت سے کہ قومی ہمدردی ہو۔ آج یورپ والے جو سود لے رہے ہیں اور دے رہے ہیں ان میں بھی تو قومی ہمدردی کا

---

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۷۵.

جذبہ ہے کہ قوم کو فائدہ پہنچے لیکن وہ تو شریعت کے مکلف ہی نہیں مگر جو لوگ شریعت کے مکلف ہیں اور اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ سود لینے دینے میں ضرر بھی ہے۔ پھر جانتے بوجھتے کسی کام کو کرنا اور اس پر اعتماد بھی کر لینا صرف یہ سمجھ کر کہ ہماری تو نیت نیک ہے نہایت ہی غلط اور غیر مناسب بات ہے اور قوم کے ساتھ ہمدردی کی بجائے در پردہ دشمنی ہے، دنیاوی بھی اور اخروی بھی۔

عمل مشروع میں ہی حسن نیت کا اعتبار ہے......لہٰذا کسی کام کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں۔ اب نیک نیتی سے کوئی یوں سمجھ لے کہ نماز تو اچھی چیز ہے اس کی چھ رکعت ہی پڑھ لوں نفع ہی نفع ہوگا، تو چار بھی نہ ہوں گی وہ بھی منہ پر مار دی جائیں گی۔ تو جہاں اسلام میں نیت کی خوبی ضروری ہے۔ حسن عمل یا عمل صالح اسی کا نام ہے کہ جس میں اخلاص اور حسن نیت بھی ہو اور ساتھ میں عمل کی صورت بھی وہی جو شریعت سے ثابت ہو۔

اسی لئے سورہ ملک میں فرمایا گیا ہے: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ① برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی اور کائناتوں کا بھی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہی ذات ہے کہ جس نے موت اور حیات پیدا کی۔ (القرآن) کسی کو وجود دیا کسی سے وجود چھینا، کسی کو زندہ کیا کسی کو مردہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں ہے وجود اور عدم کی باگ ڈور۔ عالم میں یہ تغیرات، موت، حیات، نعمت، سلب نعمت کیوں رکھے؟ وجہ بیان فرمائی: ﴿لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ② تاکہ اللہ تمہیں جانچے کہ تم اچھا عمل کرتے ہو یا برا۔ جب تم اس کے ملک میں ہو، اس کے اقتدار کے نیچے ہو، اس کی قدرت کے تحت ہو تو تم اس کے حکم کی اتباع کرو گے یا نہیں اسی کو جانچنے کے لئے عالم میں یہ تغیرات رکھے ہیں تاکہ تمہارے ایمان کی جانچ ہو اور دیکھیں کہ تم میں اَحْسَنُ عَمَلًا ہے۔

عمل صالح کی دو بنیادیں......اَحْسَنُ عَمَلًا کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ نے کی ہے کہ "اَیُّ اَخْلَصُهٗ وَاَصْوَبُهٗ" ③ حسن عمل اور عمل صالح وہ ہے کہ خالص ہو، رضاء خداوندی کے لئے اخلاص کے ساتھ ہو مخلوق کی رضاء یا اپنی رضاء نفس شامل نہ ہو۔

اگر رضاء خلق کا شائبہ تک بھی شامل ہے عمل کے اندر تو وہ داخل شرک قرار دیا گیا ہے اور ظاہر کے اعتبار سے ثابت بالسند ہو اور بطریق صواب ہو یعنی اس نہج پر ہو کہ جس طرح شریعت نے بتلایا ہے، تو گویا عمل صالح کی دو بنیادیں ہو گئیں ایک اخلاص للہ کو جو کلمہ بیان کر رہا ہے وہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہی برحق ہے۔ اسی کا حکم ماننے کے قابل ہے۔ اور اسی کی رضا پر چلنے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اور اسی کلمہ کے دوسرے جز مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ سے نکلتا ہے اتباع سنت۔ اس لئے کہ بطریق صواب وہی ہے۔ جس کو سرکار

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۲-۱ ② پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۲

③ قال البغوی: قال فضیل فی تفسیرہ: اخلصہ و اصوبہ، ج: ۸، ص: ۱۷۶، تفسیر البغوی، سورۃ الملک۔

دو عالم نے کر کے دکھایا ہے یا جو آپ کے متبعین حضرات صحابہ کا تعامل ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ جس عمل میں لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ شامل ہوگا وہی عملِ صالح ہوگا۔

عمل صالح اسے کہتے ہیں کہ میں اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ فلاں نے بڑے اچھے کام کئے، رفاہِ عام کا کام کیا بہت ہی عمدہ کام کیا ہمارے اور آپ کے سمجھنے سے اور محض تخیل سے وہ عملِ صالح نہیں بنے گا۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے بلکہ عملِ صالح بنتا ہے دو بنیادوں سے اخلاص للہ اور دوسری بنیاد ہے اتباعِ سنت۔ جس کام میں اخلاص ہے اور اتباعِ سنت بھی ہے وہ عملِ صالح ہوگا۔

شرک و بدعت کی بنیاد...... اب اگر اخلاص میں کمی آئی یعنی کسی کام میں رضا خداوندی کے ساتھ کچھ مخلوق کی رضا بھی شامل ہوگئی۔ یا نفس کی رضا مخلوط ہوگئی تو وہ عمل خالص اللہ کے لئے نہ رہا، اس لئے جس درجہ اخلاص میں غیر اللہ کی رضا شامل ہوگی شرک کی بنیاد پڑتی چلی جاوے گی اور شرک فی العمل ہو جائے گا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے معنی ہیں اتباع ہو رسالت خداوندی کا۔ اب جس درجہ اتباع میں کمی آتی جائے گی اسی درجہ اتباع اور بدعت کی بنیاد پڑتی جائے گی جو شرک تک پہنچائے گی۔ تو دین کی اصلاح کی دو بنیادیں ہیں اخلاص اور اتباعِ سنت۔ اور دین کے فساد کی دو بنیادیں ہیں شرک اور بدعت۔ لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں کمی آنے سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے اور محمد رسول اللہ میں کمی آنے سے بدعت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اب ہر آدمی کا کام ہے کہ اپنے ہر کام میں غور کرے کہ جو کام میں کر رہا ہوں اس میں لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ شامل ہے یا نہیں؟ جس پر اس کا ایمان ہے، اگر ہے تو عملِ صالح ہے۔ نہیں تو پھر وہ عملِ طالح۔ تو ایک تو ہے صریح چیز جس کو شریعت نے صراحۃً ممنوع قرار دیا ہے اس کو اگر جائز کرنے کی فکر میں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص تو پہلے ہی کھو دیا وہ کام رضا حق کے لئے نہ رہا اور ساتھ میں اتباع کو بھی خیر باد کہہ دیا کہ وہ رسنت کی پیروی نہ رہی تو اس عمل میں برکت کہاں سے ہوگی؟

اس سے جتنے بھی آثار پیدا ہوں گے وہ سب نجس اور ناپاک ہوں گے اس لئے کہ معدہ تو درحقیقت حوضِ بدن ہے اس کا پانی گندہ ہوا تو ایک ایک عضو میں گندگی پہنچے گی۔ معدہ میں پاک چیز بھری ہوتی ہے تو ہر عضو میں پاک چیز پہنچے گی۔ ایمانی خوشبو پیدا ہوگی۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب مرنے کا وقت قریب ہوتا ہے، ملائکہ نزعِ روح کرتے ہیں تو ملائکہ ہاتھوں کو، پیروں کو، منہ کو ناکوں کو سونگھتے ہیں کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے؟ وہ جو قلب کا ایمان ہے جب وہ پھیلتا ہے تو ہاتھ پیر پر آتا ہے عمل کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ تو ملائکہ اس سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پیر میں ایمان کی کس قدر خوشبو ہے؟

ابتدا سے لے کر انتہا تک اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف دو ہی چیزوں کی جانچ ہے وہ یہ کہ ہر عمل میں ایمان کا دخل ہو۔ اور ہر عمل میں اتباع کا دخل ہو۔ ایمان میں کمی آئی۔ شرک پیدا ہوا۔ اتباع میں کمی آئی تو بدعت پیدا ہوئی۔ اور یہ دونوں چیزیں دین کے فساد کی ہیں تو آدمی قومی ہمدردی کرے اور دین کو پیچھے ہی خیر باد کہہ دے۔ یہ ہمدردی

کیا ہوئی، یہ تو نہ اپنی ہمدردی رہی نہ قوم کی ہمدردی رہی۔

قوم کے اخلاق کا تحفظ...... محض قومی ہمدردی کے نام پر ہم قوم کو ناپاک غذائیں پہنچائیں اور ساری قوم کے اخلاق کو گندہ بنانا، کمینہ اخلاق قوم کے اندر پیدا کرنا یہ کون سی ہمدردی ہے؟ لہٰذا یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع کیا محض اس لئے کہ ہماری قوم کی خدمت ہو مگر اس جمع کے اندر دین بھی تو شامل ہونا چاہئے تاکہ قوم کے اندر ناپاک اخلاق پیدا نہ ہوں اور قوم سے ناپاک افعال نہ سرزد ہوں۔

اگر اس کی غذا لقمہ صحیح ہے تو اخلاق صحیح ہیں، لقمہ ناپاک ہے تو اخلاق بھی ناپاک ہیں، اس لئے ہم نے اکابر کو یہ دیکھا ہے کہ بیعت کرتے وقت وہ پہلے پوچھتے تھے، کہ تمہارے پاس موروثی زمین تو نہیں ہے کچھ سود وغیرہ تو نہیں ہے جس کو تم کھاتے ہو، پہلے اس سے توبہ کرو، جب بیعت کریں گے۔ اس لئے کہ جب غذا ہی تمہاری مشتبہ ہوگی تو ذکر اللہ تمہارے اندر کیا اثر کرے گا، اگر اللہ کا نام لوگے تو اس کی تاثیر واقع نہیں ہوگی۔ اللہ کا نام جیسا پاک ہے وہ پاک ہی ظرف چاہتا ہے ناپاک ظرف کے اندر پاک چیز نہیں بھری جاتی۔ وہ بھی ناپاک بن جائے گی تو غذا پر اور اکل حلال پر دار و مدار ہے اخلاقِ حسنہ کا۔

ظلمتِ اخلاق...... اسلام نے سب سے زیادہ زور اکل حلال پر دیا ہے۔ اس لئے جتنی چیزیں ہیں کہ جس سے لقمہ میں کوئی حرمت پیدا ہو۔ کوئی ناجائز شکل پیدا ہو۔ ان سب چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دے دیا۔ سود کو حرام کر دیا۔ احتکار کو حرام قرار دے دیا۔ احتکار کے معنی ہیں، گرانی کی امید پر مال کو روک رکھنا، احتکار کی صورت میں مخلوق کو ستانا ہے اور مخلوق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ ضرورت ہوتے ہوئے مال کو اپنے نفع کے لئے روک کر رکھنا ایسی تمام چیزیں حرام قطعی ہیں اور کچھ "مکروہ" ہیں۔ مگر ایسی تمام چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے کہ جن سے مال میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا ہو۔ کوئی حرمت پیدا ہو یا کوئی کراہت پیدا ہو۔

مقصد اس کا یہ ہے کہ مسلم پیدا ہوا ہے دنیا میں اپنی آخرت بنانے کے لئے، دنیا اس کے لئے وسیلہ ہے، وسیلہ اس کا اگر گندہ بنا تو مقصد میں بھی گندگی آ جائے گی وسیلہ اگر پاک ہے تو مقصد بھی پاک ہوگا۔ اسی لئے مقصودِ اصلی آخرت ہے۔ گو اس کے لئے دنیا وسیلہ ہے اس کے قواعد بنا دیئے ہیں کہ جائز طریق پر کمائیں۔ جائز طریق پر خرچ کریں۔ ناجائز اور حرام، مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے بچیں، نہ بچنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ برکت نہیں ہوگی بلکہ برکت نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظلمت بھی ہوگی اور اس کے آثار ناپاک ظاہر ہوں گے۔ عمل میں بھی اور اخلاق میں بھی۔

قومی خدمت جائز ذرائع سے ہونی چاہئے...... اگر ہم قومی خدمت کریں اور ہم اس کے اندر اشتباہ پیدا کریں یا کم از کم مکروہ چیزیں داخل کر دیں یا صریح حرام چیزیں داخل کر دیں تو اس سے برکت کیا ہوگی؟ بلکہ خود بھی مبتلا ہوں گے، ظلمت میں اور قوم کے قلب میں بھی غلاظت بھرنے والے ہوں گے۔ ان کے دل میں بھی خیر و برکت پیدا نہیں ہوگی۔ اس لئے یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ سرمایہ جمع کیا تاکہ قوم کو فائدہ پہنچے۔

سرمایہ کے تحفظ کی صورت بجائے حرام کے، یہ شکل کیوں نہیں اختیار کر لیتے؟ مضاربت کی صورت کر لیں۔ دوچار افراد اپنی تجارت میں لگا دیں اور حسب رقم اس کا منافع دیتے رہیں۔ رقم بھی محفوظ رہے گی اور منافع بھی چلتا رہے گا اور ترقی بھی ہوتی رہے گی۔ آخر اس کے کیا معنی ہیں کہ مسلمان نفع کمائے تو اس کی طبیعت حرام اور مکروہات کی طرف کیوں جاتی ہے؟ جبکہ وہ اللہ اور رسول کو مانتا ہے۔ اس کی طبیعت اور فطرت کا تو تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ مشتبہ چیزوں سے بچے اور جائز اور حلال چیزوں کی طرف چلے تاکہ اپنا بھی نفع ہو اور دوسروں کا بھی نفع ہو تو بہر حال یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات کیا ہے کہ صاحب! سود سے کریں گے قوم کی خدمت کوئی فرعی چیز ہو یا کوئی اجتہادی چیز ہو تو اس میں کچھ گنجائش نکالیں بھی۔ ایک صریح اور قطعی حرام چیز اور آدمی اس سے فائدہ سوچے یہ کسی طرح مناسب نہیں۔

حرام میں شفاء نہیں ...... بیماری اور دواؤں کے سلسلے میں حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَآءَ كُمْ فِيْمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ'' ① اللہ نے ان دواؤں میں تمہارے لئے شفا نہیں رکھی، جو دوائیں حرام ہیں۔ شراب ہے، قمار کی چیزیں ہیں، جوا ہے، ان میں شفا نہیں ہے۔ اگر ظاہری طور پر شفا ہوئی بھی تو روح اتنی بیمار ہوگی کہ بدن پھر آخر غلیظ اور گندہ ہوگا۔ پھر یہ رہ گیا جب مادی امراض کی شفا بھی حرام میں نہیں تو روحانی امراض کی شفا کیسے ہو جائے گی حرام کے اندر؟ اور وہ بھی قطعی حرام، اس لئے یہ سوال ہی آنا نہیں چاہئے۔ نیت نیک ہے۔ جذبہ نیک ہے۔ پھر قومی خدمت کرے۔ تو کوئی بینک ایسا قائم کرے جو شرعی جواز کے تحت ہو۔ ذرا سا تغیر کردو وہی نفع رہے گا۔ مگر جائز بن جائے گا۔

متبادل صورت ...... تو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ اس لاکھ ڈیڑھ لاکھ کو باقی رکھنے کی صورت کو ذرا سا تبدیل کر کے حد جواز میں لے لیا جائے تاکہ حرام سے بچا جائے۔ تو مسلمان کا تو کام ہی یہ ہے کہ معاملہ ہو۔ اطاعت ہو، عبادت ہو، اس میں حرام و مکروہ سے بچ کر حد جواز کی طرف آئے، یہی معنی اس کے اسلام کے ہیں ورنہ تو مسلم اور غیر مسلم میں فرق کیا رہ گیا۔ وہ بھی سود خور، تم بھی سود خور، وہ بھی حرام خور اور تم بھی حرام خور۔ تو ہم تمہیں حلال خور بھی نہیں بنانا چاہتے (برسبیل لطیفہ فرمایا) اور حرام خور بھی نہیں بنانا چاہتے۔ آدمی اکل حلال پر رہے۔

تو میں عرض کرتا ہوں کہ نیت بھی نیک ہے، جذبہ بھی نیک اور قومی خدمت کا جذبہ مبارک ذرا سا تغیر کر کے اس کو حد جواز میں لے لیں۔ کیوں حرام کی طرف جارہے ہیں؟ کہ قوم کی روح کو بھی گندہ کریں اور خود بھی گندے بنیں اور آخرت کا مواخذہ الگ کوئی بینک قائم کر دیں یا کوئی ایسی صورت قائم کر دیں کہ اپنی تجارت میں لگا لیں، یا کوئی کمپنی تجارت کی بنا دیں اور اس میں شرکاء ہوں نفع نقصان کے شریک رہیں اور پھر وہ رفاہِ عام کے لئے خرچ کریں تو اس سے راس المال بھی محفوظ رہے گا۔ اور بڑھتا بھی رہے گا۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں اور کس قسم کا وہ اسلام ہے جو اس پر آمادہ کر رہا ہے؟

---

① المعجم الكبير للطبراني، ج:٢٣ ص:٣٢٦ رقم:٧٤٩ .

مطالعہ کا علم لائقِ اعتماد نہیں...... سوال: حضرت کہا جاتا ہے کہ اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ربوا ہے صرف ربوا حرام نہیں ہے۔ اس پر حضرت نے دریافت کیا کہ یہ علماء کہتے ہیں۔ یا تاجر کہتے ہیں۔ سائل نے کہا کہ حضرت! یہ بات ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کہی تھی۔ رسالوں میں لوگوں نے دیکھ لی ہے اس کا بہانہ بنایا جا رہا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ رسالوں میں تو بہت سے مضامین آتے رہتے ہیں۔ اہل حق کے بھی اور اہل باطل کے بھی مُئَوِّلِیْن کے بھی اور مُکَذِّبِیْن کے بھی، کہیں ان میں سے چھان بین کر کے حق اور صواب کو نکالنا یہ تو متدین علماء کا کام ہے۔ اور تاجر جو مجسم ہوں پیسہ کمانے کی خاطر ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں وہ تو ایسی چیزوں میں حیلہ تلاش کریں گے کہ ان کا نفع ہاتھ سے نہ جائے وہ جائز ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے۔ یا تو فتویٰ لیا جائے ایسے علماء سے جو متدین ہوں۔ ملک وقوم کو جن کے دین ودیانت پر اعتماد ہو اور ان کا علم مستند ہو۔ قوت مطالعہ سے جو علم آتا ہے اس میں امام اپنا نفس ہوتا ہے جو چاہے کرے اور نفس ہے ناتہذیب یافتہ اس لئے یہ معتبر نہیں کہ فلاں وکیل صاحب نے یہ کہہ دیا اور فلاں ڈاکٹر مفسر صاحب نے یہ کہہ دیا۔

تو جس کے آخر میں "ڑ" ہو ہم اس کی بات نہیں مانیں گے۔ (برسبیلِ لطیفہ فرمایا) کوئی عالم متدین کہے یہ فتویٰ دے یا مستند اداروں سے فتویٰ حاصل کیا جائے وہ اجازت دے دیں تو آپ بے تکلف کریں۔ فلاں نے کہہ دیا اس نے کہہ دیا یہ قابل اعتبار بات نہیں۔

مسلم وحربی کے درمیان سودی معاملہ...... سوال: ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا حدیث لَا رِبٰوا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ کے تحت مسلم اور حربی کے درمیان سود کا معاملہ ہو سکتا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ یہ حدیث لَا رِبٰوا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ کہاں ہے؟ اور اس حدیث کے ساتھ جو دوسری حدیث ہے وہ آپ کے سامنے نہیں۔ یہ ائمہ میں تو مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ قطعی بات یہ ہے کہ سود کسی حالت میں جائز نہیں، اب جو کہتے ہیں لا ربو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ربو جائز ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ربوا ہوتا ہی نہیں۔

مسلم اور کافر کے درمیان دارالحرب میں معاملہ اور ہوتا ہے اور پھر دارالحرب میں یہ بھی قید ہے کہ جنگ جاری ہو، حالت امن نہ ہو۔ اس وقت کا یہ مسئلہ ہے، ایک دارالحرب کا یہ معنی ہیں کہ شعائر اسلام وہاں بلند نہ ہوں۔ اس کے مسائل دوسرے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر دارالحرب مان لیا جائے تو دارالحرب کے دوسرے احکام سامنے نہیں؟

دارالحرب کی آڑ میں پیسہ بٹورنا...... دارالحرب جب ہو تو ہجرت کرنی واجب ہے۔ ملک چھوڑ کر دارالسلام کی طرف جائے۔ اس کی تو جرات نہیں کرتے کہ یہ دارالحرب ہے، اسے چھوڑ کر دارالامن اور دارالاسلام میں جانا چاہئے اس کا دھیان کسی کو نہیں آتا، جب دھیان جائے تو پیسہ کی طرف جائے۔ تو دارالحرب کا حیلہ مل گیا ہے، پیسہ بٹورنے کو۔ یہ حیلہ جوئی اور پیسہ بٹورنا ہے۔

اگر دارالحرب مانتے ہیں تو دوسرے مسائل پر کیوں نہیں عمل کرتے۔ مثلاً تجارت ضروری ہے وہ قوت پیدا

کرنی ضروری ہے جس سے دارالحرب دارالاسلام بنے، کفار سے جنگ کرو اس کی تیاری کرو اور پیسہ اس میں لگاؤ جہاد کے لئے ہتھیار فراہم کرو، اس کے لئے کوئی صاحب تیار نہیں، کوئی صاحب آمادہ نہیں۔ وہ دارالحرب صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ سودی لین دین جائز ہو جائے اور اب تک کا سود جائز ہو جائے۔ اس وقت دارالحرب کے متعلق یہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ ہجرت بھی ہے۔ جہاد بھی ہے، قومی معاملات بھی ہیں۔ کتنے ہی مسائل دارالحرب کے متعلق ہیں تو پھر آخر پیسہ ہی کیوں سامنے آتا ہے۔ معلوم ہوتا کہ ہے کہ جذبہ پیسے کا ہے اور دارالحرب حیلہ ہے اور جذبات دوسرے ہیں، دارالحرب کی آڑ لے کر پیسہ بٹورنا چاہتے ہیں سودی لین دین کر کے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی کا فتویٰ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں ہے، پھر ان کا کیا جواب ہوگا، اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہمارے اکابر کا بھی فتویٰ ہے، تو کیا ان کا یہ بھی فتویٰ ہے کہ سودی لین دین کرو، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فتویٰ دیا تھا اس زمانے میں جبکہ انگریز کا کامل تسلط تھا۔ لیکن کیا انہوں نے یہ بھی فتویٰ دیا تھا کہ سودی لین دین بھی شروع کردو۔

سود پر دلچسپ مباحثہ...... حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوریؒ لاہور تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت مولانا طفیل احمد صاحبؒ زندہ تھے اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے اور صحیح دین دار لوگوں میں سے تھے۔ بی اے بھی تھے، ان کی رائے یہ تھی کہ سودی لین دین جائز ہونا چاہئے۔ بغیر اس کے قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا "سود مفید" نام کا۔ سود کے جواز کے جتنے حیلے مل سکتے تھے اس میں وہ سب موجود تھے اور باقاعدہ اس کی اشاعت وطباعت کی گئی۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ حضرت تھانویؒ سے کسی نے ان کا ذکر کیا کہ حضرت! وہ سود کے جواز کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ لونڈے کی بات کا کیا اعتبار، ذکر کرنے والے نے کہا کہ حضرت! لونڈا ہے؟ وہ تو مولانا طفیل صاحب بوڑھے آدمی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جس کا نام طفیل ہے (طفیل کے معنی ہیں چھوٹا سا بچہ) تو وہ لونڈا نہیں تو اور کیا ہے؟ تو خیر اس زمانے میں یہ قصہ چل رہا تھا اور یہ سب حضرات لاہور پہنچے۔ مولانا ظفر علی خان صاحب مرحوم (ایڈیٹر زمیندار) اور ڈاکٹر اقبال صاحب مرحوم اور دوسرے بڑے بڑے لوگ ملنے کی خاطر حاضر ہوئے۔ اتفاق سے مولانا ظفر علی خان صاحبؒ بھی کچھ اسی خیال کے تھے جو خیال مولانا طفیل احمد صاحبؒ کا تھا۔ انہوں نے سود کے جواز پر آدھ گھنٹہ بڑی مدلل تقریر کی اور اقتصادی دلائل وغیرہ سے ثابت کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ حضرات ذرا کچھ مائل ہوں گے، ڈھیلے پڑیں گے سود کے سلسلے میں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے جو جواب دیا وہ تو صرف دو لفظوں کا تھا، ان کی بات تو لمبی تھی۔ فرمایا کہ: "بھائی ہم پل نہیں بننا چاہتے۔ جسے جہنم میں جانا ہو خود جائے۔ ہماری گردن پر پیر رکھ کر نہ جائے"

یہ جواب سن کر سب چپ بیٹھے رہے۔ علامہ اقبال بھی مولانا ظفر علی خان صاحب بھی، کسی کو بولنے کی ہمت تک نہ ہوئی۔ پھر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے آدھ گھنٹہ بڑی مفصل تقریر کی جس میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ سود ہر حالت میں حرام ہے کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

حکمِ شرعی کے تحت قومی ہمدردی ہونی چاہئے ...... یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا ہے اور قومی ہمدردی کے نام پر چل رہا ہے۔ اور ایسے ہمدرد پیدا بھی ہوئے اور گزر بھی گئے۔ اور دوسرے بھی پیدا ہوئے اور بھی گزر گئے۔ اور بھی پیدا ہوں گے اور وہ بھی گزر جائیں گے۔ مگر مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا ہے اور رہے گا۔ اس مسئلہ میں اگر خلجان ہے تو سیدھی سی بات ہے کہ جو معتمد اور مستند ادارے ہیں ان سے استفتاء کریں۔ اس میں منشاء ظاہر کر دیں کہ ہم نے اتنی رقم جمع کی ہے اور ہمارا منشاء یہ ہے کہ قوم کی خدمت اور رقم محفوظ رہے۔ اس کے منافع سے قوم کو فائدہ پہنچے۔ اس کی جائز صورتیں کیا ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ سود لیا جائے ایک صورت یہ ہے کہ تجارت میں لگا دیا جائے۔ تو اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ جو وہاں سے مستند فتویٰ آجائے اس پر عمل کیا جائے۔ اجر بھی ملے گا اور قوم کا فائدہ بھی ہوگا۔

مدارِ دین حجت ہے ...... ایک صاحب نے پوچھا اگر جماعت کی اکثریت نے فیصلہ کر دیا کہ سود کا روپیہ لے لیا جائے۔ اس میں کچھ حرج نہیں تو اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ دین کا مدار حجت پر ہے یا سروں کی گنتی پر نہیں۔ یہ کوئی کونسل یا اسمبلی کے فیصلے تھوڑا ہی ہیں۔ اسمبلی میں سر گنے جاتے ہیں۔ سروں کی تعداد پر فیصلہ ہوتا ہے۔ سروں کے اندر کی چیز نہیں دیکھی جاتی یعنی عقل بھی ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا بلکہ تعداد کی زیادتی پر فیصلے ہوتے ہیں اور دین کا مدار حجت پر ہے۔ اس کے بارے میں تو علامہ اقبال صاحبؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں ؂

گریز از طرزِ جمہوری اسیرِ پیرِ دانا شو ‌ ‌ ‌ ‌ کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

کہ اس جمہوری طرز کو چھوڑ دو اور کسی پیرِ دانا کے قیدی بن جاؤ اگر دو سو گدھے جمع ہو جائیں تو انسانی فکر تھوڑا ہی ان کے دماغ سے نکلے گی۔ دو سو گدھے جمع ہو جائیں تو گدھے کا خیال ہی نکلے گا، انسانی فکر کہاں سے نکلے گا؟ انسانیت ہو تو جب ہی انسانیت کی بات ذہن سے نکل سکتی ہے اور انسانیت وہاں مفقود ہے۔ تو بے وقوفی کا خیال ذہن سے برآمد ہوگا۔

اسی کو قرآن کریم نے کہا ہے: ﴿وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ① زمین میں بے وقوفوں کی جو اکثریت ہے اس کا اتباع مت کرو وہ تم کو گمراہ کر رہے ہیں، حق کے راستے سے ہٹا کر چھوڑیں گے۔ اس لئے اگر اکثریت فیصلہ کرے تو وہ دینی حجت کے مقابلے میں کوئی کارگر نہ ہو سکے گا۔ خواہ پوری

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۱۶۔

دنیا کے انسان فیصلے کو مل کر پاس کر دیں اور دینی حجت اس کے خلاف ہو۔ لہٰذا سود حرام ہی رہے گا، جیسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ کسی کے حلال یا جائز کرنے سے جائز نہیں ہوگا۔ پاخانے کو کتنا ہی دھولو۔ صاف کرلو وہ پاخانہ ہی رہے گا۔ پاک تو ہونے سے رہا۔ ناپاک ہی رہے گا۔ اور اس پانی کو بھی ناپاک کر دے گا۔ جس پانی سے اس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تو ایسے ہی ایک حرام قطعی چیز خود تو حلال نہیں ہوگی۔ اوپر سے ان اذہان کو بھی اپنی رو میں بہا کر گندہ کر دے گی جن اذہان میں اس قسم کے تصورات ذہن میں نہ جانے چاہئیں اور نہ ہی ایسے ارادے کرنے چاہیں، جب کوئی شئے حلال طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ تو اس کے حصول میں حرام طریقہ کو کیوں استعمال کریں؟ اللہ ہمیں محفوظ فرمائیں۔ اس قسم کے خیالات سے۔

مراتبِ عصمت...... سوال: ایک صاحب نے سوال کیا انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بإجماع امت معصوم ہیں۔ ان کی عصمت میں کسی کو کلام نہیں اور قبل البلوغ بچے از روئے شرع معصوم ہیں۔ کیونکہ شریعت نے قبل البلوغ ان کے کسی فعل شنیع پر دارو گیر نہیں کی۔ لہٰذا ان کی عصمت بھی متفق علیہ ہے اور اولیاء اللہ بھی گناہ سے بہت بچتے ہیں، اس اعتبار سے وہ بھی معصوم ہو گئے تو اب حضور والا وضاحت فرمادیں کہ ان کی عصمت میں کچھ تفاوت ہے یا سب کی عصمت ایک ہی قسم کی ہے؟

جواب: اس پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہاں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ بچوں کے اندر جو قوت ہے گناہ کی وہ اس وقت بیدار نہیں وہ ابھار جس کا تعلق فعل سے ہے وہ ابھری ہوئی نہیں ہے صرف مادہ موجود ہے۔ اور انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام میں مادہ بھی موجود ہے اور نفس بھی موجود ہے اور پھر نفس کا مقابلہ کر کے گناہ سے بچتے ہیں۔ اور یہ کمال ہے۔

منشاءِ گناہ...... فرمایا کہ انسان میں گناہ کا منشاء صرف دو چیزیں ہیں: حب جاہ اور حب باہ۔ اسی لئے بعض گناہ تو سرزد ہوتے ہیں جاہ طلبی سے مثلاً آدمی اقتدار چاہتا ہے اس کے لئے دوسروں کی توہین کرتا ہے۔ تذلیل کرتا ہے، زبردستی دباتا ہے۔ جس کو اس زمانہ کی اصطلاح میں استحصال عوام کہتے ہیں۔ یعنی عوام کو حاصل کر کے ایک شخص لیڈر بنتا ہے۔ پھر چاہے دوسروں کا خون ہو مگر اسے کرسی مل۔ اسے عزت ملی۔ ہزاروں مخلوق برباد ہوتی، کٹ جاتی ہے مگر اس کی لیڈری چمک جاتی ہے۔ اس کا منشاء ہوتا ہے حب جاہ اور حب اقتدار۔ ایک شخص اپنے کو بڑا جانتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ کسی کو سلام کرنے میں اپنے کو عار محسوس کرے گا، وہ چاہے گا کہ دوسرے مجھے سلام کریں۔ میں بڑا آدمی ہوں۔ یہ چھوٹے ہیں، ان کا فرض ہے کہ یہ میرے آگے جھکیں۔ تو کبر کے معنی فقط بڑا بننے کے نہیں ہیں بلکہ تحقیر ناس یعنی لوگوں کو حقیر سمجھنا اور ذلیل جاننا اور اپنے کو ان سے بالاتر اور بڑا جاننا۔ یہ حقیقت ہے کبر کی۔ اور یہ جذبہ انسان میں موجود ہے، اس سے سینکڑوں گناہ متعلق ہیں۔ لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ، مار پیٹ، قتل و غارت گری اور دنیا بھر کے سینکڑوں گناہ محض جاہ کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں، آدمی اپنے کو چھوٹا سمجھے تو اس قسم کے گناہ کا انسداد ہو سکتا ہے۔

ایک جذبہ انسان میں باہ کا ہے یعنی شہوانی قوت ہے، ہزاروں گناہ اس سے متعلق ہیں۔ یہ شہوتیں دو ہیں۔

ایک شہوت بطن کو پورا کرنے کے لئے کھانے پینے کی چیزیں جمع کرتا ہے۔ اور شہوتِ فرج سے اس کو نکالنے کی کوشش رہتا ہے۔ تو ہزاروں گناہوں کا سرچشمہ یہ بھی ہے اس قسم کی شہوت کو پورا کرنے کے لئے جائز وناجائز کی پرواہ نہ کرے گا۔ چوری ہو، رشوت ہو، سود ہو، بہر حال کسی طرح سے پیسہ جمع ہوں اس سے نفس کے اندر وہ قوت بڑھے جس سے شہوانی جذبات پورے ہوسکیں تو شہوت بطن کا حاصل ہے۔ مرغوباتِ نفس کو بٹورنا اور جمع کرنا۔ مال ہو، لباس ہو، سامان ہو۔ آدمی اسے حاصل کرے جس طرح سے بھی ہو سکے۔ جب اس وقت میں آدمی غرق ہو جاتا ہے اس کے حرام وحلال کی کوئی پرواہ نہیں رہتی۔ جیب کترے جیب کترتے ہیں۔ چوری کرنے والے چوری کرتے ہیں۔ ڈکیتی ڈالنے والے ڈکیتی ڈالتے ہیں۔

ایک خاص قسم کی ڈکیتی ہے قانونی جس میں قانون کی آڑ لے کر مال بٹورا جاتا ہے۔ خواہ ٹیکس لگا کر خواہ کسی کو ڈرا دھمکا کر جیسے پولیس والے کیا کرتے ہیں۔ کہ جرم ہونہ ہوا سے ڈرایا دھمکایا اس نے کچھ رشوت دی اسے چھوڑ دیا۔ تو مال کی تحصیل میں آدمی حرام حلال کی پرواہ نہیں کرتا اور ہزاروں گناہ اس سے سرزد ہوتے ہیں ایک شہوت فرج یعنی شرم گاہ کی شہوت ہے۔ اس سے آدمی بدکاری، زناکاری، فحش، عریانی وغیرہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ جیسے شہوت بطن سے ہزاروں گناہ متعلق ہیں اسی طرح شہوت فرج سے بھی ہزاروں گناہ متعلق ہیں۔

شیطان کا گناہ اور حضرت آدمؑ کی لغزش...... عالم ازل میں ایک گناہ شیطان نے کیا اور ایک لغزش حضرت آدم سے سرزد ہوئی۔ شیطان کے گناہ کا منشاء تھا جاہ طلبی جب اس کو حکم دیا گیا کہ آدمی کو سجدہ کرو۔ تو اس نے کہا کہ میں آدم کے سامنے سجدہ کیوں کروں؟ یہ حکم عدولی کی۔ اور یہ ہی نہیں کہ صرف اتنا ہی کہہ کر بس کر دی ہو۔ بلکہ حق تعالیٰ کے حکم میں "مین میخ" بھی نکالی اور کہا کہ (معاذ اللہ) آپ کا یہ حکم خلافِ فطرت ہے۔ ﴿خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ﴾ ① آپ نے مجھے آگ سے بنایا اور آدم کو مٹی سے۔

اور آگ کی فطرت ہے سر اونچا کرنا۔ اور مٹی کی خاصیت ہے پست ہونا۔ تو آپ نے سر بلند ہونے والے کو پست کے سامنے ذلیل ہونے کا کیوں حکم دیا میں اونچا ہونے والا اس پست کے آگے کیسے جھک جاؤں؟ یہ گناہ حکم عدولی کا سرزد ہوا ابلیس لعین سے جس کا منشاء تھا جاہ طلبی، عزت، حسد، کبر، رعونت فرعونیت۔ اور ایک لغزش سرزد ہوئی حضرت آدم علیہ السلام سے۔ وہ حقیقتاً گناہ تو نہیں تھی بلکہ غلط فہمی تھی اور وہ یہ کہ شجرۂ ممنوعہ کے کھانے سے روکا گیا تھا اور باقی جنت کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا حکم تھا اور اس درخت کے پاس جانے تک ممنوع تھا۔ کھانا تو درکنار، وہ درخت حضرت آدم نے کھالیا لیکن حکم عدولی کا کوئی واہمہ بھی نہ تھا۔

تلبیس ابلیس...... حضرت آدمؑ کے ذہن میں شیطان نے اولاً وسوسہ ڈالا اور تدبیر سمجھائی اور تلبیس کرکے تاویل سمجھائی کہ اس کی ممانعت ابدی نہیں ہے۔ بلکہ خاص وقت تک تھی وہ وقت نکل گیا۔ اب تمہارا معدہ اس نعمت

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۷۶۔

کو ہضم کرنے کا متحمل ہے۔ اور اسکی خاصیت یہ ہے کہ جو اس درخت کو کھانے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔ اس نعمت سے نہیں نکل سکے گا۔ جھوٹ بھی بولا اور دھوکہ بھی دیا اور قسم بھی کھائی۔ ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ﴾ ① قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تم کھالو گے تو ابدی طور پر جنت میں رہو گے۔ اور اگر اس کو نہ کھایا تو ممکن ہے کہ جنت سے نکال دیئے جاؤ اور ان کو سمجھایا کہ ابدی حکم نہیں، بلکہ ایک وقت تک کے لئے تھا۔ اب جنت کی آب و ہوا آپ میں اثر کر گئی۔ پوری طرح رچ گئی ہے۔ اب آپ کھائیں گے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ابتدائی حالت میں کھانے میں مضرت تھی۔ حالانکہ آدم علیہ السلام کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ میں کیسے کھاؤں اور حکم خداوندی کے خلاف کیسے کروں؟

مگر ادھر تو اس کمبخت نے قسم کھائی اور آدم علیہ السلام پاک قلب ہیں۔ سچے قلب والے ہیں۔ نہ دھوکے سے واقف نہ فریب۔ اور اللہ کا نام لے کر ایک شخص فریب کرے یہ تو گویا ان کے وہم میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی آدمی خدا کا نام لے کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہی بات ہو اور یہ واقعہ ہے کہ جو شخص سچا ہوتا ہے اسے دھوکہ ہی یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟ وہ تو جھوٹ کو بہت بری چیز سمجھتا ہے۔ اس لئے سچا آدمی دوسروں کو بھی سچا سمجھتا ہے۔ اس کا وہم بھی نہیں جاتا کہ یہ جھوٹ بول کر دھوکہ دے رہا ہے۔

اسی واسطے محدثین لکھتے ہیں۔ اِنَّ اَكْذَبَ الْحَدِيْثِ حَدِيْثُ الصّٰلِحِيْنَ کہ صوفیاء کی حدیثیں جھوٹی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ (معاذ اللہ) وہ تو اتنے سچے ہوتے ہیں کہ اللہ کے رسول کا نام لے کر کوئی روایت کرے کہ اللہ کے رسولؐ نے یہ فرمایا ہے۔ تو ان کو وہم بھی نہیں گزرتا کہ کوئی آدمی اللہ اور رسول کا نام لے کر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ تو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ تو سچے آدمی بعض دفعہ دوسروں کے قسم کھانے کی وجہ سے اور یقین دلانے کی وجہ سے مبتلا ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ان کا قلب دھوکہ سے، فریب سے پاک ہے تو ابلیس نے فقط تاویل ہی نہیں سمجھائی بلکہ قسم بھی کھائی۔ ادھر آدم پاک قلب ہیں۔ دھوکے سے فریب سے واقف نہیں۔ اور پھر جنت میں رہ کر کوئی قسم کھائے کہ اللہ کی قسم میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ تو حضرت آدم کا وہم بھی نہیں جھوٹ بولنے پر۔

ادھر تو ابلیس نے دھوکہ دیا۔ ادھر حضرت حوا نے کہا کہ اجی کھالو ایک دانہ میں کیا حرج ہے۔ بیوی کی آدمی سنتا ہے اور جلدی سے اس کے خلاف بھی نہیں کرتا اتنا کہنے سننے سے حضرت آدم کے قلب میں یہ بات بھی بیٹھ چکی تھی کہ ممکن ہے یہ ہی بات ہو کہ اس کی ممانعت ابدی نہ ہو۔ ابتداء میں ہو اب جب کہ یہاں کی آب و ہوا اثر کر گئی تو ایک آدھ دانہ کھا لینے میں کیا حرج ہے۔ اوپر سے شیطان لعین نے قسمیں کھائیں اور بیوی نے دیا سہارا تو کھا لیا درخت۔

خطاء اجتہادی اور عصمت...... اس لئے حقیقتاً یہ گناہ نہیں تھا۔ گناہ کہتے ہیں جان بوجھ کر کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا۔ حضرت آدم جان بوجھ کر خلاف ورزی کرنے سے پاک تھے۔ یہ سمجھے کہ ہو سکتا ہو کہ حکم خداوندی کے

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۱۔

معنی اور مطلب یہی ہوں جو یہ شخص قسم کھا کر بیان کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ میں غلط فہمی میں ہوں۔ اس قسم کے فریب میں آ کر مبتلا ہو کر وہ کھالیا۔ یہ لغزش ہوئی صورۃً اور حقیقتاً گناہ نہیں بلکہ غلط فہمی ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ خطا فکری ہے یا خطاء اجتہادی ہے۔ یہ سرزد ہوگئی ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے خطاء اجتہادی ہو سکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کو غلطی پر باقی نہیں رکھ جاتا ہے فوراً حق تعالیٰ مطلع کر دیتے ہیں۔ دوسرا کوئی مجتہد خطاء اجتہادی کرے تو ہو سکتا ہے کہ عمر بھر اسے صواب سمجھتا رہے اور ہو وہ حقیقت میں خطا، تو غرض ان چیزوں میں مبتلا ہو کر حضرت آدمؑ نے وہ درخت کھالیا۔

لغزش اور گناہ کا فرق ..... مگر اس کا منشاء کبر اور جاہ نہیں تھا۔ خود ہی کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے کروں لیکن معنی حکم کے قسم کھا کر بیان کرنے والے نے غلط بیان کر دیئے اور چیز تھی کھانے پینے کی اور کھانے پینے کی چیزوں میں قوت باہ اور شہوانی قوت آگے بڑھتی ہے۔ کبر ونخوت اس میں نہیں ہوتا۔ شیطان کے گناہ کا منشاء کبر تھا اور تکبر تھا۔ اور آدم کی لغزش کا منشاء حرص تھا اور حرص آدمی کی چیز ہے اور کبر درحقیقت شیطان کی چیز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں کبر کا گناہ بہت سخت ہے وہ معاف نہیں ہو سکتا جب تک متکبر پوری توبہ نہ کرے۔ اس نے توبہ نہ کی ابد الآباد کے لئے ملعون قرار دے دیا گیا اور ابدی جہنمی بنا دیا گیا اور آدم سے جو لغزش سرزد ہوئی اس میں کبر اور نخوت کا (معاذ اللہ) کوئی شائبہ ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ حرص تھی اور اوپر سے غلط فہمی اس لئے جو گناہ شہوت سے یا باہ سے سرزد ہو وہ شدید نہیں ہوتا ہے تو آدم کی خصوصیت ہے اور کبر سے سرزد ہوا تو وہ تکبر ہے اور وہ حق تعالیٰ کی شان ہے اس میں گویا اپنے کو اللہ کا شریک بنا رہا ہے اور یہ کھلا ہوا شرک ہے۔ لازمی بات ہے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ اس لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ "لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْكِبْرِ" ① وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہو، (جب تک کہ اس سے توبہ نہ کرے)۔

ایک گناہ وہ ہے جس کا منشاء کبر ونخوت ہے اور ایک لغزش وہ ہے جس کا منشاء حرص ہے۔ حرص سے سرزد ہونا یہ تو آدمی کی جبلت ہے اور کبر سے سرزد ہونا یہ شیطان کا کام ہے، کبر میں ٹھیک مقابلہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا کہ آپ بڑے ہیں، میں بھی بڑا ہوں۔ اور باہ سے جو گناہ ہوتا ہے اس میں آدمی خود اپنے کو ہیچ سمجھتا ہے کہ میں حرص میں مبتلا ہوں۔ اس سے اللہ کی بڑائی میں دل کے اندر کوئی کمی نہیں آتی۔ اب نتیجہ نکالئے کہ آدم علیہ السلام سے جو لغزش ہوئی وہ جاہ سے ہوئی یا باہ سے؟ ہمیں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آدمؑ کے قلب میں عظمت خداوندی بدستور موجود تھی اور دوسرے کی عظمت جب ہی ہو سکتی ہے جب اپنے آپ کو کم سمجھے لہٰذا حضرت آدمؑ کی لغزش میں کبر کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ ادھر اس کم بخت کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت تھی ہی نہیں اس لئے وہ ابد الآباد کے لئے ملعون ہوگیا اور ادھر ان کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا جبکہ توبہ کی اور چالیس برس تک برابر روتے رہے اور بے

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان باب تحریم الکبر وبیانہ، ج: ۱، ص: ۲۳۷، رقم: ۱۳۱.

حد توبہ واستغفار کیا۔ حالانکہ وہ گناہ نہ تھا بلکہ وہ ایک فکری لغزش تھی۔ بہر حال میں نے عرض کیا کہ دو ہی قوتیں ہیں ایک جاہ طلبی کی ایک باہ طلبی کی۔

عصمت اطفال..... بچوں میں جاہ طلبی اور باہ طلبی کی دونوں قوتیں بیدار نہیں ہوتی ، نہ ان میں تکبر ہوتا ہے کہ وہ لیڈر بنیں صرف کھیل کود کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے شہوانی مادہ تو ہوتا ہے مگر ابھرا ہوا بیدار نہیں ہوتا۔ بلوغ سے قبل اس میں ابھار نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے کہ ان میں وہ قوت ہی ابھی ابھری ہوئی نہیں ہے جو گناہ کا منشاء ہے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام...... انبیاء علیہم السلام کی تمام قوتیں کامل ہوتی ہیں۔ پھر وہ بچتے ہیں نفس کی مخالفت کر کے اپنے صبر سے جبر سے، کمال نیت سے، ور کمال استقلال سے اور کمال عظمت خداوندی سے۔ یہ بات نہیں کہ انبیاء علیہم السلام مجبور ہیں گناہ کرنے سے وہ گناہ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر مجبور ہوتے تو گناہ سے بچنا ان کے حق میں کوئی کمال نہ ہوتا کمال یہی ہے کہ ہر قسم کی قوت ہے اور پھر بچتے ہیں حکم خداوندی کی عظمت میں اور نفس کا مقابلہ کرنے کی ان میں اتنی قوت ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا اور بالکل عصمت ہی رہتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے معنی مجبور کے نہیں بلکہ ان میں سارے مادے بدرجہ اتم موجود رہتے ہیں۔ مگر سارے مادوں کو وہ کلیتہً تابع کر لیتے ہیں حق تعالیٰ کے کہ جہاں آپ فرمائیں گے وہاں ہم ان مادوں کو استعمال کریں گے اور جہاں سے آپ روک دیں گے وہاں سے ہم رک جائیں گے۔ تو انبیاء میں قوتیں اور مادے سب موجود رہتے ہیں پھر ان کا گناہ سے بچنا ارادی اور اختیاری ہے اس لئے ان کے حق میں کمال ہے اگر ان کا گناہ سے بچنا مجبوراً ہوتا تو یہ ان کے حق میں کوئی کمال نہ تھا۔

کیونکہ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک نامرد ہو اور وہ یوں کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا۔ دوسرا کہے گا کہ کمبخت تیرے اندر جانے کی طاقت کیا ہے۔ تو مجبوری میں بچا ہوا ہے۔ تیرے اندر وہ مادہ ہے ہی نہیں۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ شہوانی مادہ پورا موجود ہو۔ اور پھر آدمی خوف خداوندی کی وجہ سے بچے۔ ایک لنگڑا لولا آدمی جو چارپائی سے ہل بھی نہیں سکتا وہ یوں کہے کہ میں چوری نہیں کرتا۔ اس سے پاک ہوں۔ لوگ کہیں گے تو پاک کیا ہے تو تو مجبور ہے۔ تجھے آج قوت مل جائے تو ڈکیتیاں ڈالے گا۔ اب تیرے اندر طاقت ہی نہیں۔ تو تو کرے گا کیا۔ محض چارپائی پر بیٹھا رہے گا۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ طاقت موجود ہو اور کرتب پورا جانتا ہو اور پھر بچتا ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے اور تو ارادے اور اختیار سے سوچ سمجھ کر علم وعقل کی روشنی میں بچے اسے تو بچنا کہتے ہیں اور جہاں روشنی ہی نہ موجود ہو اور بچے اسے بچنا نہیں کہتے۔

عصمت انبیاء اور عصمت اطفال کا فرق..... بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے ہے کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت بیدار نہیں ہوتی صرف مادہ موجود ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں وہ ساری قوتیں موجود ہیں۔ پھر

وہ معصوم ہیں ارادے سے، اختیار سے تو عصمت دونوں میں موجود ہے مگر فرق اتنا ہے کہ انبیاء اختیاری معصوم ہیں اور بچوں میں غیر اختیاری عصمت ہے۔

یہ علم کے ساتھ معصوم اور بچے لاعلمی کے ساتھ معصوم وہ ناطاقتی سے معصوم اور انبیاء کمال طاقت اور قوت کے ساتھ معصوم۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل ہے۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل نہیں۔ اگر دو برس کا بچہ گناہ نہ کرے تو اسے کامل نہیں کہتے اس لئے کہ نہ اس میں ارادہ ہے اور نہ وہ قوت ہے۔ لہٰذا اس کے معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے مجبوراً گناہ کرنے سے روک دیا ہے۔ وہ طاقت اس میں خدا نے ابھاری نہیں۔ اس لئے وہ بیچارہ اپنے ارادے سے کچھ نہیں کر سکتا اور انبیاء میں ساری قوتیں موجود ہیں اور پھر بچتے ہیں۔ یہ ہے کمال۔

باعث تعجب ایمان ...... اور اصول بھی یہی ہے کہ رکاوٹیں اور موانع بہت ہوں اور پھر نیکی کرے تو وہ زیادہ قابل قدر ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ کوئی رکاوٹ موجود نہیں اور نیکی کرنے کے لئے دواعی موجود ہیں۔ تو ہے تو وہ بھی نیکی ہی مگر زیادہ عجیب وغریب نہیں، زیادہ قابل قدر نہیں۔ اس قسم کی ایک حدیث ہے۔ ایک حدیث میں آپؐ نے صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بتلاؤ "وَاَيُّهُمْ اَعْجَبُ اِيْمَانًا" ① سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! سب سے زیادہ عجیب ایمان ملائکہ کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ملائکہ کو کیا ہو گیا جو وہ ایمان نہ لائیں؟ عرش ان کے سامنے کرسی ان کے سامنے، جنت ان کے سامنے وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون ایمان لانے والا ہوگا؟ یعنی ان کا مان لینا کوئی زیادہ کمال نہیں کیونکہ وہ اس چیز کو مان رہے ہیں جس کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے نہ ماننے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

پھر عرض کیا یارسول اللہ انبیاء کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ انبیاء کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں گے؟ وحی ان کے اوپر آ رہی ہے۔ فرشتے انہیں نظر آ رہے ہیں۔ مشاہدہ حق میں وہ مشغول ہیں۔ جلال و جمال کا دروازہ ان پر کھلا ہوا ہے۔ تجلی حق ان کے سامنے ہے وہ بھی انکار کریں گے تو کون اقرار کرے گا اس لئے ان کا ایمان کیا عجیب؟ پھر عرض کیا گیا کہ ہمارا ایمان عجیب ہے فرمایا کہ تمہیں کیا ہوا کہ تم ایمان نہ لاؤ؟ پیغمبر تمہارے سامنے موجود۔ وحی تمہارے سامنے اتر رہی ہے۔ معجزات تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون ایمان لائے گا؟ اس لئے تمہارا ایمان بھی عجیب نہیں ہے۔ پھر عرض کیا کہ اللہ اور رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ عجیب ایمان ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد میں آئیں گے نہ رسول ان کے سامنے، نہ معجزے ان کے سامنے، نہ ان کے سامنے وحی اتر رہی ہوگی بلکہ رکاوٹ اور موانع اتنے ہوں گے کہ کوئی ایمان میں شک ڈال رہا ہے۔ کوئی دل میں تردد پیدا کر رہا ہے۔ کہیں کفار، کہیں

① المعجم الكبير للطبراني، ج: ١٠ ص: ٢٣٢، دلائل النبوة للبيهقي، جماع ابواب اخبار النبي ﷺ بالكوائن بعده، ج: ٨، ص: ٢، حدیث صحیح ہے۔ السلسلة الصحيحة (مختصرة) اول الكتاب ج: ٨ ص: ٣٣٠.

منافقین، کہیں نفس کے جذبات ہزاروں رکاوٹیں موجود اور دواعی جو تھے ایمان کے کہ وحی اور رسول کا سامنے ہونا وہ ہے نہیں پھر بھی ایمان پر جمے ہوئے ہیں۔ تو ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔

جبری عصمت...... اس سے معلوم ہوا کہ کثرت موانع اور رکاوٹوں کے اندر جو خیر کا کام کرے وہ زیادہ قابل قدر ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی رکاوٹ ہی نہیں بلکہ دواعی اور محرکات ہی موجود ہوں اور پھر خیر اور نیکی کرے تو رہے گی تو وہ خیر ہی اور نیکی ہی مگر زیادہ عجیب وغریب نہیں ہوں گی۔ تو بچے اگر گناہ سے بچتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ سمجھتے بوجھتے ہیں اور نفس کا مقابلہ کر کے بچتے ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ نفس میں تو ان کے جذبہ ہی نہیں ہے گناہ کا۔ نہ شہوت کا جذبہ ہے۔ نہ کبر و نخوت کا جذبہ ہے۔ لہٰذا اب جو وہ گناہ سے بچ رہے ہیں اسے بچنا نہیں کہتے ہیں وہ تو گناہ سے الگ تھلگ ہیں۔ بچنا اس کو کہتے ہیں کہ قوت ہو۔ ارادہ بھی ہو۔ قوی کی اس پر قدرت بھی ہو کہ اس کام کو کر گزرے اور پھر بچے۔ تو بچوں میں عصمت ہے مگر مجبوری کی ہے اور وہاں انبیاء کے اندر عصمت ہے ارادی اور اختیاری۔ تو معصوم دونوں ہیں مگر فرق رہے گا علم کا اور لاعلمی کا ارادے کا اور غیر ارادے کا خبر کا اور بے خبری کا۔

حفاظت اولیاء کرام...... رہے اولیاء اللہ، صلحاء متقین جو گناہ سے بچتے ہیں۔ ابھی عرض کیا گیا ہے کہ گناہ سے انبیاء بھی بچتے ہیں اور بچے بھی اور اولیاء اللہ بھی فرق اتنا ہے کہ انبیاء میں تو عصمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس معنی میں وہ معصوم ہیں۔ اور بچوں میں مادہ موجود ہے مگر بیدار نہیں اس معنی پر کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت نہیں۔ لہٰذا وہ بھی معصوم ہیں۔ اب رہے اولیاء اللہ ان سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ حتی الامکان وہ بچتے ہیں اس لئے ان کو معصوم تو نہیں کہیں گے بلکہ محفوظ کہیں گے۔ منجانب اللہ ان کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور بناء حفاظت کی کثرت ذکر ہے۔ رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں اور مشاہدہ رہتا ہے ان کو جلال و جمال کا قلب کا رابطہ اور نسبت اتنی قوی ہے کہ کسی وقت بھی حق تعالیٰ کا تصور اور دھیان ان سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اس واسطے وہ بچتے ہیں۔ لیکن اگر ذرا اوجھل ہو جائے تو امکان ہے کہ لغزش کریں اور ایسا ہوا بھی ہے کہ بعض اولیاء کبار میں بعض دفعہ غلبہ نفس ہوا اور معصیت سرزد ہوگئی۔ خواہ حکمت اس کی کچھ ہی ہو مگر اس کا امکان ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا عبرتناک واقعہ...... حضرت شبلیؒ اکابر اولیاء میں سے ہیں اور یوں کہنا چاہئے کہ سرداران اولیاء میں سے ہیں اور ہزاروں خانقاہیں حضرت شبلی کی خانقاہ سے آباد تھیں اور تقویٰ وطہارت کا ایک کارخانہ پھیلا ہوا تھا۔ وقت کے تمام اولیاء ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ایک روز وہ مریدین کے ساتھ سیر وتفریح کو نکلے جب ایک بستی پر گزر ہوا جو نصاریٰ و مجوسیوں کی بستی تھی۔ دیکھا کہ وہ لوگ خنزیر چرا رہے ہیں۔ دل میں خیال آیا کہ "یہ کیا انسان ہیں۔ نہ ان میں ایمان ہے نہ انہیں گندگی اور پاکی کی تمیز۔ سور چرا رہے ہیں۔ شراب پی رہے ہیں۔ اصل میں مومن ہم لوگ ہیں کہ ہر برائی سے اللہ نے ہمیں بچالیا ہے اور ہم گناہ سے بچے ہوئے ہیں اور دین کے اندر ہم غرق ہیں"۔ دل میں یہ خیال پیدا ہوا ایک وسوسے کے درجہ میں تھا۔ ع

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

کے اصول سے جو جتنا مقرب ہوتا ہے اسکے دل میں اگر خطرہ بھی آتا ہے تو اس پر بھی گرفت ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ عمل پراتنی گرفت نہیں ہوتی جتنی کہ مقربین کے خطرات پر ہوتی ہے اور عتاب ہوسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بستی میں جب یہ پہنچے تو دیکھا کہ کنویں پر چند لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں۔ ان میں عیسائی کی ایک لڑکی بہت ہی حسین وجمیل تھی۔ شیخ کی طبیعت اس پر مائل ہوگئی اور اتنی مائل ہوگئی کہ ضبط نہ کر سکے جا کر اسے نکاح کا پیغام بھی دے دیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نکاح جب کروں گی جب میرا باپ اجازت دے دے۔ شیخ نے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ گھر میں ہے۔ تو اس کے گھر پہنچے اس سے جا کر درخواست کی۔ اس نے کہا کہ میں ایک شرط پر نکاح کرسکتا ہوں وہ یہ کہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنی ہوگی۔

شیخ نے کہا منظور ہے اور اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی اور مرتد ہو گئے۔ معتقدین اور مریدین نے آ کر شیخ سے منت لجاجت کی لیکن شیخ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور شیخ مبہوت سے رہ گئے۔ خدام نے پوچھا کہ فلاں آیت آپ کے ذہن میں ہے۔ شیخ نے کہا کہ میرے ذہن میں کوئی آیت نہیں گویا پورا قرآن ذہن سے نکل گیا کوئی آیت ہی یاد نہیں آتی۔ پھر مریدین نے احادیث کے حوالے دے کر سمجھانا چاہا۔ شیخ نے اس پر بھی یہی کہا کہ مجھے کوئی حدیث بھی معلوم نہیں۔ گویا حدیث بھی ذہن سے نکل گئی اور اس کے عشق میں مستغرق ہیں۔ حتیٰ کہ کل جس لکڑی سے سہارا دے کر جمعہ کا خطبہ پڑھتے تھے۔ آج دیکھا گیا کہ اسی لکڑی سے خنزیر چرا رہے ہیں۔ شیخ کی ایسی حالت دیکھ کر لوگ رو دیئے۔ چیخیں نکل گئیں اور پورے ملک میں خانقاہیں غیر آباد ہوگئیں اور جہاں جس مرید کو پتہ چلتا رہا وہیں وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے بہت سے لوگ برداشت نہ کر سکے۔ خبر سنتے ہی اچانک انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ کچھ معمولی صدمہ نہ تھا کہ ایک شیخ وقت مرتد ہو گئے۔ فکر تھی کہ دوسروں کے ایمان کے کیا ہوگا۔ اس لئے سب لوگ دعا کر رہے ہیں۔ کہیں انفراداً کہیں اجتماعاً اور ایک خاص تعداد تو ہر وقت شیخ کے پاس ہی خدا ئے مالک الملک کے دربار میں دعاؤں میں مشغول رہتی تھی۔

کچھ دن گزرے کے بعد شیخ کو تنبہ ہونا شروع ہوا کہ میں کس حالت میں ہوں اور مریدین سے دریافت فرمایا کہ میں کس حالت میں ہوں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ آپ عیسائیت میں ہیں۔ شیخ نے کہا معاذ اللہ، استغفر اللہ، توبہ واستغفار کی اور اسی وقت کہا کہ مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان بناؤ۔ کلمہ تو تھا ہی ذہن میں بس ایک چیز غالب آ گئی۔ اب جو دھیان دیا تو پورا قرآن شریف ذہن میں موجود ہے۔ پوری احادیث محفوظ۔ کہا کہ میں یہاں آ کر کیسے پھنس گیا ہوں؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ واقعہ ہے فوراً توجہ کر کے وہاں سے واپس ہوئے اور استغفار میں مصروف رہے۔ تمام خانقاہوں میں خوشیاں منائی جانے لگی اور پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اللہ نے شیخ کو پھر اسلام میں لوٹا دیا۔

ادھر تو یہ واقعہ ہوا اور ادھر یہ ہوا کہ اس عیسائی گھرانے پر یہ اثر ہوا کہ وہ خود اپنی لڑکی کو لے کر حاضر خدمت ہوا کہ حضرت اس کو مسلمان کرلیں اور اپنے نکاح میں قبول فرمالیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے تو نکاح کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس تو بیوی موجود ہے نہ وہ عشق، نہ وہ محبت۔ بعد میں جب سوچا تو معلوم ہوا کہ قلب میں جو خطرہ آیا تھا ایک زعم کا کہ ''اصل میں ہم ہیں انسان۔ یہ عیسائی کیا کرتے ہیں'' اس کا جواب دیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑے ولی سے گناہ سرزد ہوسکتا ہے۔

حفاظت اولیاء کا طریق...... چونکہ اولیاء اللہ میں تقویٰ کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس غلبہ کی ہی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ بہت جلد رجوع نصیب فرماتے ہیں اور قرآن کریم میں اسی لئے فرمایا گیا ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ ① جن لوگوں کی عادت تقویٰ اور طہارت کی ہے اور وہ تقویٰ دل میں جما ہوا ہے اور پھر شیطان کی کوئی جماعت ان کو ورغلا لیتی ہے تو تھوڑی دیر تو وہ مبتلا ہوتے ہیں اس کے بعد اچانک وہ تقویٰ ابھرتا ہے اور فوراً وہ قوت ایمانی سامنے آتی ہے تو لاحول پڑھتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں۔

یہاں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ایک گناہ تو وہ ہے کہ قلب میں اس کا مادہ جمع ہے اور مسلسل گناہ کرتا جارہا ہے۔ جیسے (معوذ اللہ) زناکاری کا مادہ ہے اور وہ شخص مبتلا بھی ہے اس میں۔ اور ایک وہ ہے کہ قلب بالکل پاک ہے مادہ ہی نہیں گناہ کرنے کا۔ البتہ ماحول سے متاثر ہوکر گھبرا کر اتفاق سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو وہ ہزار توبہ کرے گا اور وہ اتنی بڑی توبہ ہوگی کہ اگر وہ یہ گناہ نہ بھی کرتا اور ہزاروں نیکیاں کرتا تو شاید اتنے درجات بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ واستغفار سے بلند ہوئے۔ اولیاء کرام میں گناہ کا مادہ بھی موجود ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ گناہ میں مبتلا ہوجائیں اور کھلی معصیت سرزد ہو لیکن جب تک وہ توبہ نہ کرلیں چین نہیں آتا اور بہت بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے۔

وجوہ عصمت...... مگر انبیاء علیہم السلام میں یہ نہیں کہ کھلی معصیت سرزد ہوجائے۔ ہاں خطاء فکری ہوسکتی ہے لیکن اس کے تقاضوں پر کوئی عمل ہو۔ اس سے وہ بری ہیں اور اس کی وجوہات بھی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا جو بدن تیار کیا گیا ہے اس میں غالب حصہ جنت کی مٹی کا ہے۔ تو مٹی جب پاک شامل ہے تو خمیر بھی پاک۔ پہلی چیز تو پاکی کی یہی ہے کہ بدنوں کے مادے جب ان کے پاک پیدا کئے گئے ہیں اس سے جو طبیعت بنے گی قدرتی طور پر اس طبیعت میں پاکی ہوگی اور ظاہر بات ہے کہ جب طبیعت ایسی ہے تو بالطبع خیر ہی کی طرف جائیں گے۔ شر کی طرف کبھی نہ جائیں گے۔ لامحالہ اس میں خیر ہی خیر ہوگا اور کوئی گناہ سرزد تو کیا ہو کسی گناہ کا خطرہ تک بھی ان کے قلب پر نہ گزرے گا۔ تو مادہ پاک ہے۔ بدن بھی پاک ہے۔ لازمی بات ہے کہ ان بدنوں سے جو اعمال اور افعال صادر ہوں گے وہ بھی پاک ہی ہوں گے۔

جب ابدان ظاہرہ پاک مادے سے بنے ہیں تو ظاہر بات ہے ارواح بھی ان میں اتنی ہی مقدس ترین ہیں

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۰۱.

اوران روحوں کے اندر مشاہدہ ہے کمالات حق کا ہر وقت حق تعالیٰ کے سامنے حضوری ہے کوئی آدمی گھر میں بیٹھ کر گناہ کا تصور کرے یہ تو ممکن ہے لیکن بادشاہ کے دربار میں ہو۔ اس کی عظمت، اس کا جلال دیکھ رہا ہو، وہاں ممکن نہیں کہ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ انبیاء علیہم السلام تو ہر وقت مشاہدہ کی حالت میں ہیں۔ ملائکہ ان کے سامنے وحی ان پر آ رہی ہے۔ تو وہ بیچارہ نفس کرے گا کیا۔ گو مادے سارے موجود ہوں۔ نفس مغلوب ہی رہے گا تو مادہ بھی پاک، روح بھی پاک اور اوپر سے احوال بھی پاک کہ مشاہدہ ہے عالم غیب کا اور وحی کا نزول اور علم الٰہی براہ راست اتر رہا ہے اوپر سے پھر حفاظت خداوندی بھی شامل ہے۔ چونکہ ان سے دنیا کی ہدایت کا کام لینا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو معصوم رکھا گیا ہے کہ اگر ان سے ایک گناہ بھی سرزد ہوا تو مخلوق ان کی بات نہیں مان سکتی کہ جب آپ ہی ان چیزوں میں مبتلا ہیں پھر ہمیں کیوں نصیحت کرتے ہیں۔ اس لئے ان حضرات کو بری رکھا گیا ہے، ان کے مادے پاک، روحیں پاک، احوال پاک، ماحول پاک اور اوپر سے مشاہدات اور ہر وقت حضوری شاہی دربار میں اس لئے وہاں عادتاً ممکن نہیں کہ کوئی گناہ سرزد ہو۔ زیادہ سے زیادہ عقلی امکان رہ جاتا ہے۔

اولیاء اللہ سے صدور گناہ خلاف تقویٰ نہیں...... اولیاء اللہ سے عقلاً بھی گناہ کا امکان ہے اور عادتاً بھی اس لئے کہ جو رکاوٹیں انبیاء کو دی جاتی ہیں۔ من جانب اللہ وہ نہ ان کے مادے میں ہیں نہ ان کی ارواح میں وہ چیزیں ہیں۔ نہ ملائکہ ان کے سامنے حاضر ہیں۔ اور نہ وحی ان پر اتر رہی ہے۔ اس لئے گناہ کرنے کا امکان ہے اور بہتوں سے گناہ ہوا بھی ہے۔ بعض ائمہ صحابہؓ سے گناہ سرزد ہوا۔ جیسے ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں ان سے گناہ سرزد ہوا۔ اوران کو رجم کیا گیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قلب تو پاک ہے اور گناہ جڑ پکڑے ہوئے بھی نہیں۔ ماحول سے متاثر ہو کر ایک حرکت سرزد ہوگئی۔

لیکن پھر اتنی توبہ کی اتنی توبہ کی کہ حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ماعز بن مالکؓ نے اتنی بڑی توبہ کی ہے کہ اگر وہ توبہ عالم کے اندر پھیلا دی جائے تو سب کے گناہ معاف ہو جائیں ① اس ایک توبہ کے اثر سے۔ تو اولیاء کے اندر فقط امکان عقلی ہی نہیں بلکہ ایک درجہ میں امکان عادی بھی ہے، کہ گناہ سرزد ہو جائے مگر حفاظت خداوندی شامل ہوتی ہے تو گناہ ہوتا نہیں۔ اور اگر ہو جائے تو اتنی بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے کہ سو برس کی عبادت سے شاید وہ درجات بلند نہ ہوں جو اس توبہ سے ان کے بلند ہوتے ہیں۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ رات کو لیٹے اور شیطان نے کچھ اثرات پھیلا کر قلب اور دماغ میں پہنچائے۔ تہجد کے لئے آنکھ نہ کھل سکی اور تہجد چھوٹ گیا۔ حالانکہ ترک تہجد کوئی معصیت نہیں۔ اس لئے کہ امتی کے اوپر نہ فرض ہے نہ واجب۔ مگر جو اہل اللہ تہجد کے عادی ہوتے ہیں ان کا اگر ایک تہجد بھی قضا ہو جائے تو سمجھتے ہیں کہ ساری عمر اکارت ہوگئی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ سر پر آ پڑا۔ تو حضرت امیر معاویہؓ اس تہجد کے قضا

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه الزنى، ج: ۹ ص: ۲۸ برقم: ۳۲۰۷۔

ہونے پر تمام دن روئے۔ استغفار کیا دعائیں مانگی اور کہا کہ یہ پہلی بار قضا ہوا ہے۔

غرض اگلے دن جب سوئے ہیں تو عین تہجد کے وقت ایک شخص نے انگوٹھا ہلایا کہ "حضرت امیر! تہجد کا وقت ہوگیا ہے اٹھئے تہجد پڑھ لیجئے"۔ حضرت امیرؓ نے اجنبی آواز محسوس کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ میری مجلس درائے میں تو کون اجنبی ہے جو مجھے میرے زنان خانے میں تہجد کے لئے اٹھانے آیا ہے؟ اس نے کہا کہ "میں شیطان ہوں "تہجد کیلئے اٹھانے آیا ہوں" فرمایا کہ کم بخت تو اور تہجد کیلئے اٹھائے۔ اس نے کہا جی ہاں خیر خواہی کا جذبہ ابھرا اور مجھے گوارا نہ ہوا کہ آپ کا تہجد قضا ہو۔

فرمایا کہ تو اور خیر خواہی کرے۔ اللہ نے فرمایا ﴿إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ① شیطان تمہارا دشمن ہے تم اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ کبھی دوست نہیں بن سکتا ہے اس لئے تو اور دوستی کرے۔ یہ ناممکن ہے۔ سچ سچ بتا تو کیوں آیا ہے؟ ورنہ میں بھی صحابی ہوں اور اتنی قوت رکھتا ہوں کہ تیری گردن مروڑ دوں گا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تب وہ اصلیت کھلی۔ اس نے کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ میں نے ہی کل ایسی حرکت کی تھی کہ آپ کا تہجد قضا ہوگیا۔ میں نے کچھ ایسے وساوس اور آثار دماغ اور قلب پر ڈالے کہ آپ کو گہری نیند آگئی اور وقت پر آنکھ نہ کھلی۔ آپ نے سارے دن استغفار کیا تو تہجد سے اتنے درجے بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ سے بلند ہوئے۔ اسی لئے میں نے آپ کو اٹھایا کہ اگر آج قضا ہوگیا پھر توبہ کریں گے پھر درجے بلند ہوں گے۔ تو سو درجوں کے بجائے ایک ہی درجہ بلند ہو یہی اچھا ہے کچھ تو درجات میں کمی ہوگی۔ جب اتنی بات اس نے سچ کہہ دی تب حضرت امیرؓ نے اس کو چھوڑا۔ فرمایا کہ صحیح ہے یہ خباثت تیرے دل میں چھپی ہوئی تھی۔ بہرحال اولیاء کاملین سے گناہ کے سرزد ہونے کا امکان بھی ہے اور عادتاً بھی ممکن ہے اور وہ تقویٰ کے منافی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ تقویٰ جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ گناہ جڑ پکڑے ہوئے نہیں۔ وہ کچھ بیرونی اثرات سے گھر گھرا کر شاذ ونادر واقع ہوسکتا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام سے یہ چیز ممکن نہیں ہے۔

مقام عصمت اور شیطان...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر قلب کے دائیں جانب فرشتے کا مقام ہے اور بائیں جانب شیطان کا مقام ہے۔ یہ خیر کے وعدے دیتا ہے۔ اور شیطان شر سکھاتا ہے۔ دونوں کی جنگ ہوتی ہے۔ صدیقہ عائشہؓ نے عرض کیا یا رسولؐ! کیا آپ کے قلب کے بائیں جانب بھی شیطان کا مقام ہے؟ فرمایا کہ ہاں لیکن وہ شیطان خود مسلمان ہوگیا۔

اس کا اثر مجھ پر کیا پڑتا میرا اثر اس پر یہ پڑا کہ اس کی ماہیت بدل گئی اور بعض روایتوں کے الفاظ ہیں کہ ہے وہ شیطان ہی مگر میں اس سے بچا لیا جاتا ہوں۔ اس کا کید و مکر مجھ پر اثر نہیں کرتا۔ شیطان انبیاء علیہم السلام پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اور ان کی صورت بھی اختیار نہیں کرسکتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ [illegible]

---

① پارہ: ۲۲، سورة الفاطر، الآية: ٦۔

تو اس نے مجھے ہی دیکھا۔ شیطان کو قدرت نہیں کہ میری صورت میں آئے اور میرا نام لے کر کہے کہ میں ہوں۔ ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ صورت بھی نہیں بنا سکتا۔ چہ جائیکہ ان کے حقائق میں اثر انداز ہوسکے۔

حفاظت اولیاء اور شیطان...... شیطان اولیاء اللہ کے قلوب میں اثر ڈال سکتا ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ کسی وقت بہک جائیں۔ اور امکان ہے کہ کوئی معصیت بھی ان سے کسی وقت سرزد ہو جائے، لیکن چونکہ تقویٰ غالب ہے اس واسطے وہ غالب آ گیا تو اس گناہ سے بچا رہتا ہے اور اگر سرزد ہو جائے تو عظیم الشان توبہ نصیب ہوتی ہے کہ وہ سو عبادتوں سے بڑھ کر عبادت ہوتی ہے۔

حاصل کلام اور درجات عصمت...... مطلب یہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ عصمت اختیاری کے ساتھ۔ اولیاء اللہ محفوظ ہیں، حفاظت خداوندی کے ساتھ۔ اور حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ گناہ عادتاً ممکن ہے اور انبیاء علیہم السلام میں عادتاً ممکن نہیں۔ صرف عقلی امکان ہے مگر ان سے گناہ ہوگا نہیں اگر ہو تو وہ گناہ نہیں بلکہ خطاء فکری ہے۔ جس پر ان کو بہت جلد متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ ان کو اس پر باقی نہیں رکھا جاتا ہے اور بچے معصوم ہیں۔ عصمت اضطراری کے ساتھ کیونکہ ان میں مادہ ہی ابھرا ہوا نہیں ہے جو سرچشمہ ہے گناہ کا، نہ شہوانی قوتیں ابھری ہوئی ہیں کہ شیطانی حرکت کریں۔ صرف ایک طبیعت کی شوخی ہوتی ہے۔ کھیل کود کرتے ہیں لیکن کوئی ارادی چیز نہیں ہوتی کہ ارادے سے کچھ مکروفریب کرکے دنیا کو دھوکہ دیں۔ بچوں کی طبیعتیں بالکل سادہ ہوتی ہیں۔ تو عصمت دونوں میں ہے ایک میں خلقی عصمت ہے ایک میں ارادی عصمت ہے، ایک میں علم کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں ناواقفی کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں قوت وتمام وکمال کے ساتھ عصمت ہے اور ایک میں قوتوں کی ناتمامی اور خامی کے ساتھ عصمت ہے۔ تو عصمت دونوں میں ہے بچوں میں بھی اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں بھی مگر یہ فرق ہے اور اولیاء اللہ معصوم نہیں بلکہ محفوظ ہیں۔

بندۂ حکم پر انکشاف اسرار ہوتا ہے...... ایک صاحب نے اسی مجلس میں ایک پرچہ پر ایک سوال لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اس پرچہ کو پڑھا۔ سوال یہ تھا کہ کفار ومشرکین کی نابالغ اولاد جو انتقال کر جائے ان کا کیا حشر ہوگا۔ آخر وہ بھی تو معصوم ہیں۔ اس میں شریعت کا کوئی فیصلہ ہو تو مع اسرار وحکم بیان کیجئے۔

سوال کا آخری جز "مع اسرار وحکم بیان کیجئے"۔ حضرت کو ناگوار معلوم ہوا۔ اس لئے تلخ مزاجی کے ساتھ جواب ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیا لفظ ہے "مع اسرار وحکم بیان کیجئے"۔ اسرار وحکم ہم پر کب ضروری ہیں ہم تو ناقل ہیں احکام کے، حکم بیان کر دیں گے۔ یہ اسرار وحکم کا مطالبہ ہی غلط ہے۔ طالب اسرار کو اسرار کبھی نہیں مل سکتے۔ خادم اور مطیع پر اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

اگر بادشاہ کے سامنے کوئی جا کر یوں کہے کہ حضور اپنی سلطنت کے سارے راز مجھے بتلا دیجئے۔ اور بیگمات

شاہی کا پردہ بھی اٹھا دیجئے۔ اور یہ بھی بتلا دیجئے کہ آپ کے خزانے میں کتنے جواہرات ہیں؟ تو حکم یہ ہوگا کہ اس نامعقول کو کان پکڑ کر نکال دو۔ یہ کون ہے ہمارے اسرار پوچھنے والا؟ اور ایک شخص بادشاہ کا مطیع وفرماں بردار ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کہے کہ بہت اچھا۔ حکم دیا کہ بیٹھ جاؤ وہ کہتے بہت اچھا۔ حکم دیا کہ گھر چلے جاؤ وہ کہتے بہت اچھا حکم ہوا کہ فلاں وقت حاضر ہو جاؤ۔ وہ کہے بہت اچھا۔ ہر کام اور ہر بات کو ہر وقت ماننے کو تیار ہے۔ بس حکم کا بندہ ہے۔ سال بھر اطاعت کرتے کرتے جب بادشاہ کو اعتماد قائم ہوگا تو کہے گا کہ بڑا مخلص ہے۔ بڑا مطیع ہے۔ تو حکم دیا جائے گا کہ آج سے تم شاہی محل سرائے میں ہر وقت آ سکتے ہو۔ تم معتمد علیہ ہو کوئی روک ٹوک نہیں۔ تو لیجئے بیگمات کا پردہ اٹھ گیا۔

اگر وہ گھروں میں آرہا ہے اور اس کی اطاعت اسی طرح کی جاری ہے اور بالکل حکم کا بندہ ہے۔ اسی طرح دو برس گزر گئے تو بادشاہ کو پورا اطمینان ہو گیا کہ بڑا مخلص اور مطیع ہے۔ اس پر بادشاہ خوش ہو کر کہے گا کہ آؤ آج ہم تمہیں اپنے خزانے دکھلائیں گے، خزانہ کھول کر اس کو اندر لے جائے گا اور دکھلائے گا کہ یہ جواہرات ہیں یہ سونا ہے، یہ چاندی ہے۔ لیکن اس کی اطاعت پھر اسی طرح جاری وساری ہے، چار پانچ برس بعد بادشاہ کہے گا کہ آؤ ہم تمہیں اپنی حکومت کی پالیسیاں سمجھائے دیتے ہیں۔ ایک پالیسی حکومت کی یہ ہے اور ایک یہ ہے اور یہ بھی ہے، اور یہ حکمت عملی ہے تو خادم اور مطیع پر ساری چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں اور جو طلب کرے کہ جناب پردہ اٹھا دیجئے بیگمات کا تو بادشاہ کہے گا کہ اس کو کان پکڑ کر باہر نکال دو، اس کو پھانسی دے دو یہ کون ہے اسرار طلب کرنے والا؟

تو اسرار کی طلب نہیں کی جاتی اسرار تو آثار ہیں جو اطاعت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ حکم معلوم کرے یہ کیا سوال ہے کہ اس کی حکمت بھی بتاؤ! اس کا راز بھی بتاؤ؟ آپ کون ہیں راز پوچھنے والے؟ جب اللہ کا حکم آ گیا تو اس سے بڑھ کر راز اور کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ حکم نہ مانیں گے جب تک راز معلوم نہ ہو۔ تو آپ اللہ کے مطیع نہیں بلکہ اپنی عقل کے مطیع ہو گئے کہ عقل سے راز سمجھ میں آ گیا تو مان لیا نہ سمجھ میں آیا تو رہ گئے۔ یہ نہایت لغو سوال ہے کہ اسرار بتائیے۔ سوال یہ ہونا چاہئے کہ حکم کیا ہے اور بس۔ اسرار معلوم کرتے ہیں تو پہلے اطاعت کیجئے۔ دین پر مضبوطی سے قائم رہئے۔ فرائض وواجبات ادا کر کے ثابت کر دیجئے کہ ہماری طبیعت بھی خادم، عقل بھی خادم اور ارادہ بھی اللہ کا غلام، مشیت بھی غلام، پھر اسرار منکشف ہوں گے۔ اسرار تو آثار ہیں اور آثار کی طلب نہیں کی جاتی ہے۔ احکام کی طلب کی جاتی ہے۔ تو حکم پوچھئے کہ مشرکین کی نابالغ اولاد کا حکم کیا ہے؟

مشرکین کی نابالغ اولاد جنتی ہے یا جہنمی؟...... اولادِ مشرکین کا شرعاً جو حکم ہے اور جس میں محدثین ذراری مشرکین کے الفاظ سے باب باندھتے ہیں کہ مشرکین کی نابالغ اولاد آیا جنتی ہے یا جہنمی؟ اس میں علماء کے آٹھ مذہب ہیں۔ ایک مذہب یہ ہے کہ ان کی فطرت پر حکم لگا دیا جائے گا۔ چونکہ یہ بڑے نہیں ہوئے۔ فطرتوں میں سادگی تھی اور عمل واقع نہیں ہوا اور جنت ونار عمل کے اوپر ہے اور وہاں عمل ہے نہیں اس لئے فطرت پر حکم لگا کر داخل

جنت کریں گے مگر وہ داخلہ سزا یا جزا کے طور پر نہ ہوگا بلکہ محض انعام وتکریم کے طور پر ہوگا اور انہیں خدمہ بنا دیا جائے گا اہل جنت کا۔ وہ داخل تو رہیں گے جنت میں مگر اصل باشندوں کے خادم بن کر بطور خادم کے رہیں گے اور یہ ہی ان کے حق میں بڑے اعزاز کی بات ہوگی کہ انہیں جنت میں خدمہ بنا کر داخل کر لیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس میں توقف کیا جائے یعنی حکم مت لگاؤ اس لئے کہ روایات مختلف ہیں اور قطعی حکم لگا دینا کہ وہ جنتی ہیں یا جہنمی ہیں۔ ٹھیک نہیں، اس لئے سکوت اختیار کیا جائے معاملہ کو تفویض کیا جائے حق تعالیٰ کے اور کہا جائے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ انجام کیا ہوگا بلکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ ان کو تابع کیا جائے گا۔ ان کے آباؤ اجداد کے یعنی ملحق کر دیا جائے گا۔ اگر آباؤ اجداد جہنمی ہیں تو وہ بھی جہنمی ہیں۔ اور اگر آباؤ اجداد جنتی ہیں تو وہ بھی جنتی ہیں۔ تو وہ بھی جنت میں جائیں گے۔ اس دنیا میں جب مردم شماری ہوتی ہے تو نابالغ بچوں کو بھی گنتے ہیں۔ مسلمانوں کے بچوں کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ انہیں اسلام کی خبر ہے نہ دوسری چیزوں کی خبر ہے مگر ماں باپ کے تابع بنا کر مسلمان سمجھے جاتے ہیں۔ تو گویا وہ اہل مذہب قیاس کرتے ہیں قرآن کی اس آیت پر ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ ① جو لوگ ایمان لائے مگر عمل ان کے زیادہ صحیح نہیں تھے تو ان کے آباؤ اجداد کی کرامت کی وجہ سے درجہ ان کا بھی بلند کر دیا جائے۔ گو عمل ان کے ٹھیک نہیں۔ تو جب مومن کی کرامتوں کی وجہ سے ان کے بچوں کے درجات بلند ہو سکتے ہیں تو ان کے آباؤ اجداد کی خباثتوں کی وجہ سے وہ بھی ان کے تابع ہو جاویں گے لہذا وہ بھی جہنمی۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بچہ جب تک نابالغ رہے اور بالخصوص شیر خوار۔ وہ حقیقت میں نفس کا جز ہوتا ہے ماں باپ کے۔ ماں دودھ پلا رہی ہے اس لئے ماں کے نفس کے تابع ہے۔ اس کا نفس مستقل نہیں اور باپ کما کے کھلاتا ہے۔ اس لئے وہ باپ کے نفس کے تابع ہے۔ جب وہ عاقل بالغ ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو تب کہا جائے گا کہ اب اس میں استقلال پیدا ہوا ہے اور جب تک عقل میں بلوغ نہ ہو تو وہ ماں باپ کے تابع ہی سمجھا جائے گا وہ مسلم ہیں تو یہ بھی مسلم وہ کافر ہیں تو یہ بھی کافر۔ اس کا کفر واسلام جب ہی معتبر ہوگا جب وہ عقل وارادے اور اختیار سے قبول کرے گا۔ تو نابالغ اولاد ماں باپ کے توابع ہیں لہذا جو ان کا حکم ہے وہ ہی ان کے نابالغ بچوں کا حکم ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ نہ وہ جنتی ہیں نہ وہ دوزخی بلکہ وہ بیچ میں اعراف کے اندر رکھ دیئے جائیں گے کہ وہ جنت ہے نہ دوزخ۔ ایک مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن ان کی آزمائش کی جائے گی اور ایک آگ روشن کی جائے گی اور حق تعالیٰ کی جانب سے ان بچوں کو کہا جائے گا کہ آگ میں کود پڑو تو جن کے مزاج میں سلامتی ہوگی فطرتوں کی وہ کود پڑیں گے۔ وہ آگ حکم خداوندی سے باغ وبہار بن جائے گی۔ اور بعضے تامل کریں گے کہ ہم آگ میں کیسے چلے جاویں۔ ڈریں گے جھجھکیں گے ادھر سے حکم ہے کہ آگ میں کودو اور وہ کودتے نہیں۔ معلوم

---

① پارہ: ۲۷، سورة الطور، الآية: ۲۱.

ہوگا کہ اگر یہ جوان ہوتے تو یہی سرکشی ان کے اندر ہوتی۔ ان کی فطرت ہی کے اندر سرکشی داخل ہے۔ ان کی فطرت میں سلامتی نہیں۔ ایک مذہب یہ ہے اور بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ وہاں امتحان لیا جائے گا عمل سرزد نہیں ہوا۔ صرف جانچ کر لی جائے گی کہ فطرتوں کا رخ کیا ہے؟ اسی اعتبار سے وہ جنتی یا جہنمی ہوں گے۔

اسلم ترین مذہب ...... بہر حال اس میں آٹھ مذہب ہیں لیکن جو اسلم ترین مذہب ہے وہ صرف توقف کا ہے کہ ہم حکم نہیں لگاتے۔ حق تعالیٰ جانتے ہیں چاہے وہ فطرت پر حکم لگا دیں۔ چاہے وہ عمل پر حکم لگا دیں ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ شریعت ظواہر پر حکم لگاتی ہے اور وہاں ظاہر کچھ ہے نہیں تو کاہے پر حکم لگا دیں۔ رہی فطرت تو وہ باطنی چیز ہے اور باطن کی ہمیں خبر نہیں کہ ہے کیا۔ اور ہم حکم لگانے والے۔ تو اسلم طریق یہ ہی ہے کہ توقف کیا جائے۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہو جو اکثر علماء کہتے ہیں کہ وہ اہل جنت کے خدمہ بن کر جنت میں داخل ہوں گے۔

نس بندی ..... سوال: آج کل مسلمانوں میں ضبط ولادت اور نس بندی کا رجحان پایا جارہا ہے۔ شرع میں اس کی کیا گنجائش ہے؟ نس بندی شرعی اصول کے تحت ممنوع ہے اس لئے کہ شریعت کا منشاء تکثیر اولاد ہے۔ اسی بناء پر آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ "تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ" ① یعنی ایسی عورتوں سے نکاح کرو جن سے اولاد زیادہ پیدا ہوتا کہ قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں۔ اس لئے قانون عام تکثیر نسل ہے اور اسلام چونکہ جامع اور معتدل مذہب ہے اسی لئے اس نے دوسری جانب کی بھی رعایت رکھی وہ یہ کہ اگر خاوند اور بیوی اتنے کمزور ہو جائیں کہ اولاد ہوگی تو جان کا خطرہ ہے اور وہ آپس میں طے کر لیں اور اولاد نہ ہونے کی دوا کھالیں تو وہ کر سکتے ہیں۔

استثنائی حکم ..... استثنا کو کوئی قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے نس بندی کو جائز قرار دیا ہے تو یہ خیانت ہوگی۔ اور یہ ایسے ہوگا، جیسے کہ شراب ہے اور نجس العین ہے اور نص قطعی سے اس کی حرمت ثابت ہے لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اس کی جان بچ نہیں سکتی جب تک یہ شراب نہ پی لے۔ تو شراب پلانے کی اجازت ہے اس لئے کہ جان بچانا فرض ہے۔ یہ ایک استثنائی حکم ہے لیکن اگر کوئی اس کو قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے شراب جائز قرار دی ہے۔ یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہوگی۔ اسی وجہ سے قانون عام اپنی جگہ ہوتا ہے اور استثنائی حکم اور ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں موجود ہے کہ اپنی زبان سے کلمہ کفر مت نکالو اس قسم کا کلمہ اپنی زبان سے نکالنا شرعاً ممنوع ہے۔ لیکن آگے فرماتے ہیں۔ کہ اکراہ کے وقت کلمہ کفر کہنے کی اجازت ہے۔ مثلاً دل میں اطمینان کے ساتھ ایمان موجود ہو اور کسی نے گلے پر تلوار رکھ دی اور کہنے لگا یا تو کفر کا کلمہ زبان سے کہہ دو ورنہ ابھی ذبح کر دوں گا تو قرآن اجازت دیتا ہے کہ کفر کا کلمہ کہہ دو اور دل میں ایمان رکھو اور مطمئن رہو تمہاری کوئی گرفت نہ ہوگی۔

اب کوئی کہے کہ اسلام میں کفر کا کلمہ کہنا جائز ہے اور قانون عام بنا کر پیش کرے تو سراسر خیانت ہے یہ

① السنن لابی داؤد، کتاب النکاح، باب النهی عن تزویج من لم يلد من النساء، ج:۵، ص: ۱۰۳، رقم: ۱۷۵۴.

صرف ایک استثنائی حکم ہے۔ خاص حالت میں اس کی اجازت ہوگی اسی بناء پر حکم عام اور قانون عام اور ہوتا ہے اور استثنائی احکام الگ ہو جاتے ہیں۔ استثناء کو استثناء رکھا جائے گا اور قانون کو قانون عام رکھا جائے گا۔ اسلام میں فرض ہے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھو۔ اگر بیماری غالب ہے اور کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھو۔ اب اگر اس کو کوئی قانون کے طور پر یوں کہہ دے کہ اسلام کا قانون ہے کہ نماز بیٹھ کر پڑھ لیا کرو۔ تو یہ خیانت ہوگی۔ حکم عام وہی رہے گا کہ کھڑے ہو کر پڑھو اور اگر کوئی خاص حال پیش آ جائے تو اس کی وجہ سے اجازت ہے مگر وہ شخصی بات ہوگی عام حکم نہ ہوگا۔ یہی صورت یہاں بھی ہے کہ ایک تو تکثیر نسل ہے یہ تو قانون عام ہے۔ اور ایک ہے استثناء وہ شخصی حالت کے تحت ہوتا ہے۔ اس کے لئے بھی فتویٰ ہوتا ہے اور اگر مفتی اجازت دے دے تو وہ حکم عام سے نکل کر اجازت شخصیہ کے اندر آ جاتا ہے۔ قانون عام اپنی جگہ پر برقرار رہے گا۔ یہ بھی واقعہ کی قانونی بحث!

منظم فساد سے روٹی کی بچت...... میرے پاس سہارنپور کے ووڈپٹی کلکٹر آئے اور نس بندی کے سلسلے میں گفتگو کرنی شروع کی۔ اس بارے میں انہوں نے سوال کیا جس کا ایک جواب میں نے ہنسی کا دیا اس سے وہ بے حد شرمندہ ہوئے۔ وہ یہ تھا کہ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو جو یہ فکر لاحق ہے کہ اولاد اور آبادی بڑھتی جارہی ہے اور روٹی گھٹتی جارہی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط بہرحال آپ کو فکر آبادی کے بڑھنے اور روٹی گھٹنے کی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو یہ مصیبت جو پیش آرہی ہے۔ موجودہ نسل ہی سے پیش آرہی ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ آنے والوں کا راستہ تو بعد میں روکنا۔ ان کی پہلے (موجودہ) میں کمی شروع کر دو۔ اس کی عمدہ صورت یہ ہے کہ جو ملک میں فسادات پیش آرہے ہیں ان کو منظم اور باقاعدہ کر دیجئے۔ ہر ایک شہر میں روزانہ ایک دو فساد ہوتے رہیں اور معتدبہ افراد قتل ہوتے رہے تو دس برس میں انشاء اللہ کافی کمی ہو جائے گی اور آپ کی روٹی بچ جائے گی اس جواب سے وہ جھینپ گئے۔

تقسیم دولت میں عدم توازن...... اس کے بعد میں نے کہا کہ جو کام آپ کے کرنے کا ہے وہ تو اصل میں آپ لوگ کرتے نہیں۔ اور نہ کرنے کے کاموں میں آپ لوگ چل رہے ہیں۔ روٹی کی کمی اس لئے نہیں کہ آبادی بڑھ رہی ہے۔ آج تو زمینوں میں اتنی کاشت ہو رہی ہے جتنے افراد بڑھ رہے ہیں رزق بھی بڑھ رہا ہے۔

پھر بھی جو کمی ہے اس کی بناء یہ ہے کہ آپ کے ملک میں دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ جو غریب ہے وہ بے حد غریب ہے۔ اور جو امیر ہے وہ بے حد امیر ہے۔ ملک کے وہ خاندان جواربوں کھربوں کے مالک ہیں قانون پر ان کا قبضہ ہے۔ پارلیمنٹ کے ممبران ان کے ممنون ہیں وہ قانون ایسا بنواتے ہیں کہ ان کا سرمایہ بڑھتا رہے۔ اور غریب فٹ پاتھ پر پڑنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ اگر آپ دولت کی تقسیم صحیح کر دیں کہ امیر اور سرمایہ دار کو ذرا نیچے اتار دیں۔ اور غریب کو ذرا اونچا اٹھائیں۔ اس سے توازن

پیدا ہو جائے گا اور یہ شکایت رفع ہو جائے گی۔ یہاں ہزاروں بورے غلے سمندر میں ڈالے جاتے ہیں۔ جب وہ غلہ پرانا ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ غلہ اور رزق کی کمی نہیں بلکہ نیتوں کی خرابی ہے۔ یا طرز عمل کی خرابی ہے۔ آپ ان دولت مندوں پر، اور سرمایہ داروں پر پابندی عائد کر دیں اور ان کی دولت میں ایسے راستے نکالیں کہ غرباء چلیں اور ملک میں ایک بھی فٹ پاتھ پر پڑنے والا نہ رہے۔

آج بمبئی کے فٹ پاتھ پر آٹھ لاکھ آدمی سوتے ہیں جن کا نہ گھر ہے نہ در ہے وہیں ان کے بچے روتے رہتے ہیں بارش ہوتی ہے تو ایک طرف کو سکڑ جاتے ہیں کوئی کملی اوساتھ لیتا ہے کوئی کسی کا سہارا لیتا ہے تو ایک ایک شہر میں آٹھ آٹھ لاکھ آدمی فٹ پاتھ پر پڑنے والے ہیں۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک میں غرباء کتنے ہیں ان کی کیا حالت ہے؟ نہ ان کے پاس روٹی نہ کپڑا نہ گھر نہ در۔ اور دوسری طرف دیکھو، برلا، ٹاٹا، باٹا وغیرہ کو کہ یہ بھی یاد نہیں کہ دولت کتنی ہے۔ وہ بڑھ رہے ہیں دولت میں۔ اور یہ بڑھ رہے ہیں غربت میں۔ یہ نظم کی خرابی ہے آپ اس خرابی کو ڈالنا چاہتے ہیں ماؤں کے پیٹوں پر کہ آنے والوں کو روک دو، اس کا ان سے کیا تعلق اپنا نظم صحیح کیجئے۔ اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں وہ چاہتے تھے کہ مجھ سے کچھ بیان حاصل کریں۔ میں ان کو بیان تو کیا دیتا، مگر وہ وہاں سے چپ ہی ہو کر اٹھے، میں نے ان سے کہا کہ بس دو ہی صورتیں ہیں یا فسادات کو منظم کرو۔ اچھے خاصے افراد ہر روز قتل ہوتے رہیں دس بارہ سال میں کمی آجائے گی۔ اور یہ نہیں کرتے تو نظام صحیح کرو، دولت کی تقسیم صحیح کرو۔

سرمایہ دار کا طریق واردات...... اور میں نے یہ بھی کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ ان سرمایہ داروں نے اپنی بدکاریوں پر پردہ ڈالنے کیلئے یہ شوشے چھوڑ رکھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نس بند کرو یہ کرواور وہ کرو تا کہ ان کی دولت پر زد نہ آئے اور ان کے پیسے میں کمی نہ آئے۔ یہ اس کو چھپانے کے لئے چارہ کیا کرتے رہتے ہیں تا کہ پبلک دھوکہ میں مبتلا رہے۔ ہم دھوکہ میں آنے والے نہیں۔ اپنا نظم درست کیجئے آپ کا نظام صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایسا ہی کیا تو بیس برس کے بعد سر پکڑ کر روئیں گے جب اولاد کی کمی ہوگی نہ فوج میں آدمی ڈھنگ کا ملے گا اور نہ پولیس میں پھر بعد از خرابی بسیار اضافۂ نسل پر سوچیں گے۔

کثرت اولاد پر انعام...... میں نے کہا کہ آپ یہاں رزق کی کمی کی وجہ سے آنے والوں پر پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں اور بعض ملکوں میں یہ قانون ہے کہ جتنی اولاد زیادہ ہوگی اتنا ہی والدین مستحق انعام سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی اگر کسی کے یہاں دس بچے ہیں تو اتنے فی صد انعام دیا جائے گا۔ اور بارہ ہیں تو اتنا۔ یہ رزق کی کمی وہاں کیوں نہیں؟ وہاں لوگ کیوں فاقے نہیں بھرتے۔ اس لئے کہ دولت کی تقسیم میں نابرابری نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اس مصیبت سے دوچار نہیں ہوتے ہیں۔

استثنائی اجازت...... سوال: استثنائی شکل میں نس بندی کرا سکتے ہیں یا نہیں؟ جواب: استثنائی شکل دوسری بات

ہے اس میں نس بندی ہی کیا بعض دوائیں ایسی ہیں جن کے کھانے سے اولاد نہیں ہوتی جب آدمی اس حال پر پہنچ جائے کہ بیوی اس قابل نہ ہو اور اس کی جان کا خطرہ ہو اور وہ کہے کہ مجھے تحمل نہیں اور آئندہ بچہ پیدا ہونے کی تکلیف سے جان جانے کا اندیشہ ہے تو اسے شریعت کی جانب سے اجازت ہے کہ کوئی ایسی دوائی کھالے جس سے بچہ پیدا نہ ہو مگر استثنائی حکم استثنائی رہے گا اور اس کو قانون عام کی شکل نہیں دی جا سکتی ہے۔

انٹرویو

ضبط وتحریر ..... حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہٗ

علامہ قاری محمد طیب صاحب قاسمی قدس اللہ سرہٗ سے ایک ملاقات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام

دعوت وتجدید، علمی، سیاسی، معاشرتی اور تجدیدی کارنامے

① پچھلے دنوں جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے سفر پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بناء پر دارالعلوم حقانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا اور دارالعلوم کی فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پرنور مجالس اور محافل سے مزید نور بن گئیں۔ تو اچانک دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہنامہ ''الحق'' کے لئے مرکز اسلام کے مدیر شہیر اور حضرت حکیم الاسلام مولانا نانوتوی کے علوم واسرار کے امین سے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا جائے۔ ادھر یہ خواہش ادھر حضرت کی مصروفیات ، زائرین و پروانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تکان سفر کے ساتھ ساتھ نزلہ زکام اور بخار اس پر مستزاد، مگر خدا کی خاص دستگیری تھی کہ رات کے گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لئے کچھ یکسوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

دارالعلوم کا مستقبل..... حضرت والا سے پہلا سوال دارالعلوم دیوبند کے مستقبل کے بارے میں تھا۔ بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت ، پرسنل لاء اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں وہ اگرچہ مبالغہ آمیز ہی سہی۔ لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں۔ اور پھر مرکز علمی دارالعلوم دیوبند کا خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں۔ کہ:

عشق است و ہزار بدگمانی

جس شجرہ طوبیٰ کے بیج حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ اسلام مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے سراپا اخلاص وعمل بزرگوں نے رکھی پھر جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام

① حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہم نے یہ انٹرویو حاصل کیا۔ عنوانات کا اضافہ مرتب کی طرف سے ہے۔ ماہنامہ ''الحق'' کے شکریہ کے ساتھ اسے جزو کتاب بنایا جارہا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین جیسے اساطین امت نے اپنی زندگی تج دی۔ آج انوار و معارف کے امین اور بانی دار العلوم کے خلید رشید مولانا محمد طیب قاسمی سے پہلا سوال اسی دار العلوم دیوبند کے بارے میں تھا۔ جسکی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے۔ حضرت نے پورے اعتماد، مضبوط ایمان اور توکل سے بھرپور انداز میں جواب دیا۔

"جی ہاں، اللہ بہتر کرے، بنیاد تو اس کی ایسی ہی ہے کہ مستقبل روشن ہے ان شاء اللہ۔ اور یہ اس لئے کہ بڑی بڑی گھاٹیاں آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا۔ بڑے بڑے مخالف پیدا ہوئے مگر اللہ کا فضل ہے وہ بڑھتا ہی رہا"۔

اطمینان اور تسلی کے لئے یہی کچھ کافی تھا مگر یکا یک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر اول دار العلوم دیوبند کے ایک مکاشفہ یا پیشین گوئی کی طرف گیا جسے کہیں پڑھا یا سنا تھا، اور پھر جب یہ بھی خیال آیا کہ دار العلوم اپنی زندگی کے سو سال پورے کر چکا ہے، تو گویا دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوندی اور سائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارہ میں پوچھا کہ "حضرت! کسی بزرگ غالباً مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ سننے میں آیا ہے ... سو سال تک تو اس دار العلوم کا خدا محافظ ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ شانہ، کی شان بے نیازی کا جو فیصلہ ہو"۔

حضرت نے اس کا جواب دیا اور یکا یک فکر و اضطراب کی گھٹائیں اطمینان اور امید کی قندیلوں سے روشن ہوگئیں۔ حضرت ... فرمایا: "نہیں اتنا میں نے سنا ہے کہ یہ مدرسہ چلتا رہے گا، چلتا رہے گا یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب ہو اور یہ مدرسہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اس پیشین گوئی سے ہم تو بڑی امید باندھے ہوئے ہیں"۔ پھر حضرت نے فرمایا "یہ ایک عجیب بات ہے اور اب تک پوری ہوتی چلی آ رہی ہے"۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ وضاحت فرما رہے تھے اور چشم تصور نے دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم لہراتا دیکھا۔ کانوں نے اس کی سرسراہٹ محسوس کی اور مسلمانوں کی عظمتوں کی امین سرزمین پر شوکت اسلام کے تصور ہی سے جھوم اٹھا مگر کیا خبر کہ یہ سنہرا خواب بھی زندگی کی اور حسرتوں کی طرح شرمندہ تعبیر ہوتا ہے یا نہیں۔ اس امید و بیم میں راقم الحروف نے اپنی بات دوسری پیرائے میں دہرائی۔

تجدید دین کا مظہر اتم ..... حضرت! تجدید دین کا زمانہ تو اشخاص و افراد کے لحاظ سے سو سال کا ہوتا ہے۔ تو یہ تو دین اور علوم دین کا ایک مجدد ادارہ ہے تو اس کی عمر تو ہزاروں سال ہونی چاہئے۔ ابھی میں نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ کہ حضرت نے ایسا امید افزا اور ایمان پرور جواب دیا کہ دل و دماغ میں فکر و اضطراب کے بجائے خدا کی رحمت اور وعدہ حفاظت دین کے یقین کی شمع فروزاں ہوئی۔ حضرت نے فرمایا: "میں نے اپنے بزرگوں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات سے کئی بار سنا ہے کہ مجدد کے لئے شخص واحد کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ جماعت بھی ہو سکتی ہے اور ان حضرات نے فرمایا کہ یہ جو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نانوتوی

رحمۃ اللہ علیہ اور ان اکابر کی جماعت ہے یہ سب مجدد ہیں۔ جنہوں نے سنت بدعت میں معروف اور منکر میں تمیز پیدا کی، اور اس کے بعد فرمایا کہ ان حضرات کی تجدید کا مظہر اتم یہ دار العلوم ہے۔ اسی کو مجدد کہا جائے اور مولانا حبیب الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جو عمل ہے تجدید دین کا اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے دار العلوم، اور ہندوستان میں یہ دار العلوم قطب الرحیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کلی ہوتی ہے۔ تو اس کے اردگرد چکی کے پاٹ گھومتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے نہ صرف دینی معاملات بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے اندر کچھ قوت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے اور تیسری بات جس سے ڈھارس بندھتی ہے، وہی مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ کہ یہ دار العلوم چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب آ جائے اور یہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے''۔

ظرافت آمیز شکوہ...... حضرت ابھی اپنی بات سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب ① رحمہ اللہ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہو کر انٹرویو نگاروں کی ستم کاری کا شکوہ اس ظرافت آمیز انداز میں فرمایا کہ ''ان لوگوں کا منشاء یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگو گے دن کو بھی نہیں سونا چاہئے آج بھی جاگنا چاہئے اور کل کو آٹھ گھنٹے کا سفر ہے جاگ کر چلے جانا تاکہ مجاہدہ مکمل ہو جائے''۔ بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آ گئی ہے، اس کی بناء پر عرض کیا گیا کہ حضرت پورے سفر میں ہماری ''قدر شناس میزبان حکومت'' نے آپکے تقریر و بیان پر پابندی لگا کر آپ کو بڑی راحت پہنچائی ہے۔ اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دار العلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ و شکایت کی بجائے صبر و تمکنت اور تحمل کی نعمت سے بڑی فروانی سے نوازا ہے۔ ہماری اسلامی حکومت کے اس سراسر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کے بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ ''جی ہاں یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے یا پھر میرے ضعف، بڑھاپے، اور علالت پر خداوند کریم کا غیبی کرم، ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور ہر جگہ دوستوں کے تقاضا پر مجھے بولنا پڑتا تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہو سکتی۔ گو میں تو وہاں سے یہ ارادہ کر کے آ رہا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلوتہی کروں گا''۔ عالم اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین سے اور مسلمانوں کے قابل فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس ''پذیرائی'' کا ذکر چھیڑ کر مجھے خود ندامت اور خفت محسوس ہونے لگی مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر اپنے اکابر کی شرافت نفس اور علوم اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آ ہی گیا۔

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا ایک ایک پرزہ جس پر جلت میں چند سوالات لکھے گئے تھے حضرت کی طرف بڑھایا۔ حضرت نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگیٔ دامن کو دیکھ کر مسکرانے

① شیخ الحدیث حضرت محترم مولانا عبدالحق صاحب نور اللہ مرقدہ بانی دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور)

لگے۔ ''ارے بھائی! یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں اس میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشہ پر گفتگو کے لئے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے'' مگر ایک سدابہار گلشن سے گزرنے والے کسی سراپا شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامنی سے زیادہ انواع واقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے۔ اس کے دامان نگاہ میں تو پورا چمن سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے تو یہی اور سرسبز وشاداب گوشہ ہے تو بس یہی۔

امام دعوت وعزیمت...... سب سے پہلا سوال حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں تھا جن کے سر پر خدا تعالیٰ نے ظلمت کدہ ہند میں حفاظت دین کا سہرا باندھا۔ اور جن کی مومنانہ بصیرت، مجاہدانہ جدوجہد، حکیمانہ علوم اور جدید علم کلام کی وجہ سے خداوند کریم نے دور غلامی میں اسلام اور اسلامیان ہند کے علوم وتہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امام کبیر کی نظیر قرون اولی ہی میں مل سکتی ہے۔ علم میں، عمل میں، جہاد اور ریاضت میں، تدبر اور سیاست میں، تصوف اور سلوک میں حضرت حجۃ الاسلام یکتائے روزگار تھے۔

ایک نقاد عالم نے بالکل صحیح کہا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی ذات ستودہ صفات انیسویں صدی کے نصف آخر میں بے شبہ آیت من آیات اللہ تھی۔ آپ کے علمی، اخلاقی، اور روحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازی کا فلسفہ، شعرانی کا علم الکلام غزالی کا سوز وگداز، ابن تیمیہ کا صولت بیان، ولی اللہ کی حکمت ودانش، احمد سرہندی کی غیرت وحمیت اسلامی اور ٹیپو کی شجاعت یہ سب چیزیں کس فیاضی سے ایک شخص میں جمع کردی تھیں۔ اور بقول حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔ ''ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر ان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرادیا جائے اور بتلایا نہ جائے تو دیکھنے والے رازی اور غزالی ہی سمجھیں گے''۔ اور آج حضرت قاری صاحب سے اسی امام دعوت وعزیمت، سرخیل ارباب صدق وصفا علمبردار جہاد حریت اور نابغہ روزگار شخصیت کے مقام دعوت وعزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اور حجۃ الاسلام کے پوتے فرمارہے تھے کہ۔

تین بڑے کام...... حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی میں جو کام انجام دیئے وہ بہت زیادہ ہیں لیکن بنیادی طور پر تین بڑے کام انجام دیئے۔ سب سے پہلا کام دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے۔ یہ اتنا عظیم کام ہے کہ پوری دنیا پر اس نے اثر ڈالا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ خلافت اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے۔ سلطان عبدالحمید خان خلیفہ تھے۔ گو وہ خلافت نام کی رہ گئی تھی مگر حضرت چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے۔ اس سے تمام ممالک اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی اس لئے حضرت نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے۔ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ سارے بزرگ رطب اللسان رہے۔ اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ ہوئی یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہوئے، کہیں چندہ جمع کررہے ہیں، کہیں رائے عامہ پیدا کررہے ہیں۔ غرض ہمہ وقت مصروف رہتے۔

تو مقصد یہی تھا کہ خلافت کا نام قائم رہے۔ اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواح دیوبند میں نکاح

بیوگان کو انتہا درجہ کا عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی، اگر کسی نے نام بھی لیا تو تلواریں نکل آتی تھیں۔ حضرت نے لطیف پیرایہ میں اس کی تحریک شروع کی جب اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہم خیال بنایا تو اس کے بعد جلسہ عام کیا۔

ہمارے یہاں دیوان کا دروازہ جو ہے وہ نواب لطف اللہ خان مرحوم کا محل ہے۔ جو اورنگ زیب کے وزیر خارجہ تھے اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ اس میں حضرت نے وعظ فرمایا بہت بڑا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک شخص اٹھا اور کہا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فراست سے سمجھ گئے تھے کہ کیا کہتا ہے؟۔ جواب میں فرمایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ ایک ضرورت پیش آئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ استنجاء وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔

حضرت گھر میں گئے۔ حضرت کی بڑی بہن بیوہ تھی، ۹۵ برس کی عمر میں نہ نکاح کے قابل نہ کچھ، مگر اعتراض کرنے والے کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ آپ دنیا کو نصیحت کرتے ہیں مگر آپ کی بہن تو بیٹھی ہے۔ گھر میں گئے تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے گھبرا کر کہا کہ بھئی تم عالم ہو یہ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا میں بہر حال آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ آج ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے۔ فرمایا کہ میں ناکارہ اور سنت رسول کی احیاء میری وجہ ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ آپ نکاح کر لیجئے۔ فرمایا کہ بھئی تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ منہ میں دانت نہیں کمر جھک گئی۔ ۹۵ برس میری عمر ہے۔ کہا یہ سب میں جانتا ہوں۔ مگر اعتراض کرنے والے اس چیز کو نہیں دیکھتے تو فرمایا کہ اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری وجہ سے زندہ ہو سکے تو میں جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔

تو ان کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور انکے خاوند کا وہاں پر جو چودہ پندرہ آدمی تھے خاندان کے انہی کے سامنے نکاح پڑھایا گیا۔ گواہ بنا دیئے گئے اس میں کچھ دیر لگ گئی۔ پھر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی، وہی سائل پھر کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا کہیے اس نے کہا آپ دنیا کو نصیحت کر رہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے تو ہم پر کیا اثر ہوگا؟

فرمایا: کون کہتا ہے؟ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ دو تین آدمی درمیان میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔ اصلاح معاشرت اور رسومات مٹانے کے لئے حضرت نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ستر اسی نکاح پڑھے گئے اور پھر یہ سنت ایسی کھلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہو گیا۔

روح دار العلوم...... تو پہلی چیز تو دار العلوم کے قیام پر زور دیا۔ اس کی روح فی الحقیقت یہ تھی کہ علوم نبوت اگر عام ہوئے اور ایمان سنبھل گئے تو پھر مسلمان سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اور اگر ایمان ہی نہ رہا تو پھر کچھ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ جب شوکت اور حکومت جا چکی تو کم از کم دین تو محفوظ رہ جائے وہ رہ گیا تو آگے سب کچھ ہو جائے گا۔

اس نئے سفر میں جہاں بھی گئے تو مدارس قائم کرتے چلے گئے، مرادآباد میں مدرسہ شاہی، امروہہ میں مدرسہ عربیہ، بریلی میں مدرسہ اشاعت العلوم، انبیٹھ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسے اور انگلاوٹی میں مدرسہ قاسمیہ قائم کیا۔ اور جتنے متوسل تھے خطوط لکھتے رہے کہ جہاں ہو مدرسہ قائم کرو۔ اور یہ حضرت کی ایک بڑی سیاست تھی اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علم کے راستے سے تیار رکھنا کہ وہ مضبوطی سے قائم رہے اور جب دین ہوگا تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوت بھی آجائے۔

اصلاحِ معاشرہ اور خلافتِ اسلامیہ...... ادھر معاشرت کو درست کیا۔ معاشرت کی سب سے بڑی خرابی نکاح بیوگان کی طرف توجہ دی۔ تیسری چیز یہ تھی کہ خلافت اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ ہر وقت اس کا دھیان جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرت چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود و نبود قائم رہے۔ اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی امیدوں کا مرکز بہت دنوں تک افغانستان رہا۔

افغانستان سے رابطہ...... اور برطانیہ کو یہ شکایت رہتی کہ یہ جماعت شورش کر رہی ہے اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے مگر ان حضرات کو اس کی کیا پرواہ تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہوئی کہ ''جب امیر نادر خان کا انتقال ہوا اور ظاہر شاہ تخت سلطنت پر بیٹھ گئے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ امیر مرحوم کی تعزیت اور امیر موجود کی تہنیت کروں۔ میں افغانستان حاضر ہوا اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ اور چندہ لینا نہیں۔ بلکہ ان روابط کو زندہ کرنا ہے جو ہمارے اکابر رحمۃ اللہ علیہ کے تھے جس پر صدر اعظم نے مجھے بلایا۔ امیر بڑی عنایت و شفقت سے پیش آئے جب میں قصر صدارت میں پہنچا تو ہم لوگ بیٹھ گئے اور یہ خیال تھا کہ شائد ملاقات کے کمرہ میں بلایا جائے گا۔ لیکن یکایک دیکھا کہ خود صدر اعظم وہیں آرہے ہیں۔ ہم سب لوگ کھڑے ہوئے آگے بڑھے تو وہی افغانی طریقہ پر معانقہ دایاں بایاں مونڈھا چومنا، پوری محبت کا اظہار انہوں نے کیا۔ اس کے بعد فرمایا 'بفرمائید' آپ آگے چلیں۔ میں نے کہا ''ایں خلاف ادب است'' فرمایا نہیں نہیں آپ کو آگے چلنا ہوگا اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے میرے پیچھے صدر اعظم صاحب ان کے پیچھے سردار نعیم خان اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب (منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ) اور ان کے پیچھے غازی صاحب۔ اس ترتیب سے ہم آگے بڑھے تو وہ جو کرسی تھی، اس پر مجھے بٹھلایا اور خود دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اب میں وجہ بیان کرتا ہوں، اور وجہ مختصر یہ ہے کہ۔ کابل کی یہ حکومت ہمیں آپ بزرگوں کی دعاؤں سے ملی ہے اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خان صاحب کے چچا تایا سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان یہ دونوں بیعت تھے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے، اور برطانیہ نے انہیں ڈیرہ دون میں نظر بند کر رکھا تھا۔ تو یہ حضرات شکار کے حیلے

سے تشنوہ آ کر حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور حضرت کوئی نصیحت فرما دیتے۔ آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو حضرت نے فرمایا ''جاؤ کابل کی حکومت تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا''۔ انہیں حیرت ہوئی کہ کابل کی حکومت سے ہمارا کیا تعلق؟

امان اللہ کی حکومت تھی یہ لوگ بنی اعیام میں سے تھے، تو انہیں عہدے وزارتیں وغیرہ تو ملتی تھی۔ مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ حضرت نے حوصلہ افزائی کے طور پر ایک کلمہ کہہ دیا ہے۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی۔ امان اللہ خان معزول ہوئے۔ کیونکہ اس نے مظالم ڈھائے تو قوم متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خان کو فرانس سے بلایا جائے۔ وہ آئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہو گئے۔ تو صدرِ اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا۔ پھر صدرِ اعظم نے فرمایا کہ

''ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ٹوپی تھی جو میری والدہ کے پاس تھی اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اوڑھاتی تھی اور ہمیں شفاء ہو جاتی۔ آج ڈاکٹر رفیق بے (جو ترک ہے) کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں ہوتی جو ان تبرکات کی وجہ سے ہوتی اور فرمانے لگے۔ کہ بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لوٹا گیا، لاکھوں روپیہ کا سامان چوری ہو گیا، لیکن ہمیں صدمہ ہوا تو تبرکات کا جس کا آج تک ہمارے اوپر اثر ہے۔ پھر صدرِ اعظم افغانستان نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں''۔

ترکوں سے روابط...... یہ تو افغانستان سے روابط تھے اور سلطان عبدالحمید خان ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا جس سے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے، مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی تحریک تھی وہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام متحد ہو کر ترک اور افغانستان سب مل کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحریک تھی اور وہ ہوئے بھی حملہ آور۔ مگر کچھ تو یہ ملک تیار نہ تھا، کچھ مجاہدین ناتربیت یافتہ تھے، نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا اور یہ خواہش انہیں ورثہ میں اپنے استاذ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں تو گویا حضرت جوشِ جہاد میں غرق تھے اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دوں، شاملی میں تلواروں سے مقابلہ بھی کیا۔ الغرض حضرت کی زندگی کے کارناموں میں ایک عملی کارنامہ تو دارالعلوم ہے، جس کا فیض اطراف عالم میں پہنچا، دوسرا معاشرتی کارنامہ ہے، اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب و تعلیم ہی کے سلسلہ میں سبھی مگر ممالک اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی ربط قائم رہے۔

انگریزی دور میں محکمہ قضاء کا قیام...... اس سلسلہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں محکمہ قضاء قائم کیا اور مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کو قاضی بنایا تو ہزاروں مقدمات جو برس ہا برس سے الجھے ہوئے تھے، منٹوں میں طے ہوئے۔ لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا، یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر انگریز نے آخر میں توڑ دیا۔ دیوبند میں ایک

تھانیدار کو بھیجا جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا چنانچہ وہ آیا۔ رمضان شریف کا آخری عشرہ تھا۔ اس نے آ کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے مصافحہ کیا اور بہت جرات کے ساتھ کہا کہ کیا آپ ہندوستان میں شرع محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمہ قضاء قائم کیا؟

حضرت نے بڑی نرمی سے کہا کہ "یہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں جو لاکھوں روپے خرچ کر کے مقدمات فیصل کرتی ہے۔ ہم نے منٹوں میں فیصل کر دیئے" مگر اس نے کہا نہیں آپ پورا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں رپورٹ کروں گا اس پر حضرت کو غصہ آیا اور کہا کہ "کان پکڑ کر اسے نکال دو"۔ طالب علموں نے دھکے دے کر اسے نکالا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ "جا ہم تیری رپورٹ کریں گے، نکال دو اس شیطان کو یہاں سے"۔

بہر حال عید کا دن آیا، تھانیدار کے ہاں دودھ کے بالٹے بھرے تھے، کپڑے تیار خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہا ہوگئی ہے۔ اس کو فوری برخاست کیا جائے۔ اور بازار میں دکان دکان پر جہاں سے اس نے رشوت لی۔ پیروں میں رسی ڈال کر اسے پھرایا جائے۔ تو اس حالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ روتے ہوئے کہتا جا رہا تھا کہ "افسوس میں نے تو رپورٹ نہیں کی مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کر دی"۔

تو اس کا خمیازہ جلد اس نے بھگت لیا۔ اس کی جگہ دوسرا آیا۔ اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہوگئی اور وہ محکمہ نہیں چلا۔ تو حضرت کا چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لاء اور مخصوص قانون شریعت کے مطابق طے ہو۔

اسی کے تحت دارالعلوم کے اکابر رحمۃ اللہ علیہ نے جب لندن سے مسٹر مانٹیگو وزیر ہند آیا اور جارج کا زمانہ تھا تو میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ) علماء کا ایک وفد لیکر ان سے ملنے کے لئے گئے اور درخواست یہ کی کہ "ہندوستان میں محکمہ قضاء قائم کر دیا جائے۔ جس میں شریعت اسلام سے مخصوص چیزیں نکاح، طلاق، عدت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں"۔ خیر اس نے ظاہر میں تو کہا اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اور پارلیمنٹ میں بھی۔ لیکن یہ وقتی بات تھی نہ اس نے پیش کیا نہ ایسا ہوا۔

تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ..... مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے درجہ میں سہی، قائم ہو جائے۔ تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ کے سلسلہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لئے مائل کرتے تھے اور فرمایا کہ اول تو عبادت ہے اور عبادت بھی اجتماعی وہاں جا کر مکہ والوں سے بھی سابقہ پڑے گا۔ وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے تو ان کے قلوب پر اثر پڑے گا تو شوکت اسلامی کے جذبات لے کر آئیں گے، تو علم و معاشرت، سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں جو حضرت کی تمام خدمات کی محور ہیں۔

رات آدھی گزر چکی تھی شرکاء مجلس ذکر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ میں ایسے محو کہ گویا ایک حسین خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکا یک حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بساط لپیٹنی چاہی، سننے والے چونک

بڑے اور حضرت کے ضعف نقاہت کے باوجود ان کی توجہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مخصوص شان ''علمی کمالات'' کی طرف مبذول کرنا چاہی کہ ابھی ذکر محبوب کچھ دیر اور چلتا رہے کہ اصحاب غرض کو تو اپنی مطلب برآری سے ہی کام ہوتا ہے ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو مزید تکلیف دینے سے روک رہے تھے مگر دل بضد تھا کہ

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شان تجدید..... حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شان تجدید کا ذکر آیا تو حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ گویا یکدم تازہ دم ہوئے اور فرط نشاط میں محو ہو کر فرمانے لگے کہ علوم و معارف میں بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بالکل مجددانہ انداز ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جو تصانیف ہیں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ ''سو برس تک فلسفہ کتنے روپ بدل کر آئے لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت قلبی کھولنے کے لئے کافی ہوگی۔ سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ جحت سے نہیں کر سکتا۔ اتنی حجتیں جمع فرما دیں، تو گویا ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال دی، جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے ہیں''۔ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں اپنی نظر کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ سلف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے جنہوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو۔ یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کا حصہ ہے''۔ ''حضرت کی ہر چیز بیچ کی نہ تھی بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی تھی''۔

علم کے بارہ میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے، اور انکے ہاں اخفاء تھا نہیں، جو واردات ہوتی صبح طالب علموں کے سامنے پیش کر دیتے کہ یہ رات کو کشف ہوا، یہ الہام ہوا، یہ عادت تھی۔ تو ایک دن فرمایا کہ ''بھئی آج صبح کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو بال بال بچ گیا۔ میرے مرنے میں کسر نہیں تھی''۔ طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت! کیا بات پیش آئی؟ فرمایا کہ قرآن کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اوپر سے گزرا اور غنیمت یہ ہے کہ وہ گزرتے ہی نکل گیا، ورنہ میں تحمل نہیں کر سکتا تھا''۔ اس کے بعد خود فرمایا کہ ''میں مراقب ہوا کہ یہ کیا چیز تھی تو منکشف یہ ہوا کہ میرے بھائی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میرٹھ میں میری طرف متوجہ ہوئے، ان کی توجہ کا یہ اثر کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب پر گزرا''۔ اور اس کے بعد خود فرمایا کہ ''جس شخص کی توجہ کا یہ اثر کہ اتنا بڑا علم گزر جائے کہ برداشت نہ ہو سکے، تو وہ شخص خود اتنا بڑا علم کس طرح اٹھائے پھر رہا ہے''۔

اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور تمام اساتذہ دارالعلوم نے جن میں اساتذہ بھی ائمہ فنون تھے۔ مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام معقولات سمجھے جاتے تھے۔ ان سب نے مل کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھا دیں تا کہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں۔ حالانکہ یہ سب ائمہ علوم تھے۔ مولانا یعقوب تو صدر مدرس تھے۔

علوم کا عروج...... تو حضرت نے منظور فرمایا۔ چھتہ کی مسجد میں حضرت نے درس شروع کردیا۔ الٓمّٓ سے شروع فرمایا تو حروفِ مقطعات پر کوئی دو اڑھائی گھنٹہ تقریر فرمائی اور عجیب وغریب علوم ومعارف ارشاد فرمائے۔ اور یہ عجیب بے نفسی کا دور تھا کہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے کہ بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے۔ لہٰذا تکرار کیا جائے۔ نودرہ میں بیٹھ کر تکرار شروع ہوگیا، مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر شروع کی۔ بیچ میں ایک جگہ رکے، بات یاد نہیں رہی کسی اور کو بھی یاد نہ آئی۔ تو کہا میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا۔ تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرت جب اپنے حجرے میں آرہے تھے تو مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا۔ تو کھڑے کھڑے حضرت نے تقریر شروع کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ نہ لفظ اس عالم کے تھے نہ معنی اس عالم کے ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا کہ مولانا کیا فرما رہے ہیں۔ تو عرض کیا حضرت ذرا نازل ہوکر فرمایئے کہ کچھ سمجھ جاؤں۔ اب دوبارہ تقریر شروع کی تو الفاظ سب سمجھ میں آئے مگر معانی نہیں۔ تو پھر عرض کیا کہ حضرت کچھ اور نازل فرمایئے ہم وہاں تو نہیں پہنچے۔ تو فرمایا کہ مولانا دوسرے وقت آئیے گا۔ تو اس وقت کہوں گا۔ تو علوم میں اس وقت کتنا عروج ہوگا کہ ادھر کہہ رہے ہیں اور ادھر سمجھ میں نہیں آرہا تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو ظاہر ہے۔

راقم نے عرض کیا کہ حضرت! ایسے علوم ومعارف کی تسہیل اگر ہوجائے تو اس میں بہت سے فتنوں کا علاج ہے۔ فرمایا۔ ہاں! ہم نے مجلس معارف القرآن سے اسے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ چھاپا بھی تسہیل بھی کی، لیکن یہ سلسلہ چلا نہیں۔ اس لئے کہ علماء کی توجہ نہیں وہ کہتے کہ یہ مغلق مضامین ہیں۔ میں نے کہا بھئی حمداللہ اور ملا حسن، اور قاضی تو سمجھ لو تو ان علوم میں کیا دقت ہے، تو ارادہ نہیں سمجھنے کا۔ عرض کیا گیا کہ کاش مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں علوم قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا، اس کے مطابق کام کرنے کی صورت نکل آئے، حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی مگر اصل سوانح تو حضرت کے علوم ہیں۔ آپ اس پر تبصرہ کریں۔ مگر افسوس کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانی کی وفات ہوگئی، پانچ ہی صفحات مقدمہ کی شکل میں لکھ پائے تھے۔ الغرض بڑے عجیب وغریب علوم وحقائق ہیں۔

کچھ اپنی زندگی کے بارے میں...... حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے سراپا نور زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب اگلا سوال خود حضرت حکیم الاسلام کی زندگی کے بارے میں تھا، اور ڈرتے ڈرتے حضرت سے کچھ اپنی زندگی کے بارے میں ارشاد فرمانے کی جرات کی گئی۔

پیدائش کا پس منظر...... حضرت مسکرا کر فرمانے لگے۔ میری زندگی کیا جو میں بیان کروں۔ ہاں ایک تو پیدائش کا قصہ ہے جو مجھے یاد آیا اور جسے اپنے بڑوں سے میں نے سنا۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد مرحوم) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، جو شادی خود حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے کرائی تھی۔ تو سارے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تمنا تھی کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسل چلے، تو دوسری

شادی دیوبند میں کرائی۔ اس سے میرے تین بھائی مجھ سے پہلے پیدا ہوئے لیکن وہ کمسنی میں پیدا ہوتے ہی مر گئے۔ تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی تڑپ تھی کہ کوئی زندگی کی اولاد ہو۔

تو گنج پورہ سو میں ایک بزرگ تھے جو اولاد کے بارے میں مستجاب الدعوات مشہور تھے۔ تو حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھیجا کہ وہاں جا کر دعا کراؤ کہ مولانا حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب اولاد ہوں۔ وہ سفر کر کے گئے۔ جا کر عرض کیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا بھیجا ہوا ہوں اور یہ درخواست ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''رات بیچ میں ہے کل صبح اس کا جواب دوں گا''۔

مولانا ان کے مکان میں ٹھہر گئے، صبح آئے اور خوش ہوئے۔ فرمایا کہ میں نے دعا کی اور جب تک منظور نہ کرائی سجدہ سے سر نہیں اٹھایا۔ اور مجھے وعدہ دیا گیا کہ حافظ صاحب کا لڑکا ہوگا۔ جو حافظ اور قاری بھی ہوگا، مولوی بھی ہوگا اور حاجی بھی ہوگا۔ مجھے یہ واقعہ اس وقت معلوم ہوا جب پہلا حج ہوا اور میں جا رہا تھا تو طلبہ اساتذہ سب اسٹیشن گئے۔ اس تانگے میں مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور میں تھا۔ مولانا نے کہا کہ بھئی! میں تجھے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ اور یہ واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ ''جب تو حافظ قرآن ہو گیا تو میں نے کہا ایک جز تو الحمد للہ قبول ہو گیا۔ پھر تو نے قرات کی تکمیل کی تو میں نے کہا دوسرا جز پورا ہوا۔ پھر تو نے فراغت تحصیل کی تکمیل کی تو میں نے کہا، الحمد للہ اس بزرگ کے کشف کا تیسرا جز بھی مکمل ہوا۔ آج تو حج کو جا رہا ہے۔ تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے چوتھا جز بھی پورا ہو رہا ہے''۔ آگے چل کر حضرت قاری صاحب نے فرمایا۔ میری پیدائش کے بعد کان میں اذان دینے کے لئے حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا گیا جو اکابر دیوبند اور مشائخ میں سے تھے اس وقت حیات تھے اور میری عمر کے آٹھ نو برس تک حیات تھے، ان کی صورت مجھے یاد ہے اور میں خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، انہوں نے کان میں اذان دی۔ حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے صاحبزادے حافظ محمد یوسف صاحب بھی اکابر بزرگوں میں سے تھے۔ وہ دیوبند تشریف لائے اس وقت میری عمر مہینہ ڈیڑھ مہینہ تھی تو میری دادی صاحبہ مرحومہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اس کے لئے دعا کریں۔ انہوں نے ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے میں لے چکا ہوں، دعا کیا کروں، قبول کر چکا ہوں۔ اب اللہ جانے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ ظاہر صورت تو یہ پیش آئی کہ میری شادی رامپور میں ان کے خاندان میں ہوئی۔ ان کی عزیزہ میرے گھر میں آئی ممکن ہے یہ مطلب ہو یا اور کوئی۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی بسم اللہ...... اس کے بعد جب مجھے الف با تا پڑھنے کے لئے بٹھلایا گیا تو بہت بڑا جلسہ دارالعلوم میں منعقد کیا گیا۔ دور دور سے مہمان آئے۔ تو مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت شیخ الہند کے والد نے بسم اللہ کرائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک قصیدہ پڑھا جو بہت بڑے شاعر تھے۔ اس قصیدہ کا مجھے ایک مطلع یاد رہا اور ایک مقطع۔ مطلع تو یہ تھا ؎

حبذا کتب طیب کے مبارک تقریب	کچھ عجب طرح کا جلسہ کچھ عجب طرح کی سیر

اور مقطع یہ تھا جو تاریخ کو بھی سمیٹے ہوئے تھا۔

رب۔یمز جو کہا اس نے تو بے روئے رہا　　　　فصل تاریخ میں بول اٹھا کہ تم بالخیر

ناز برداری...... بہرحال ان اکابر کی توجہات تھیں، میں نے اپنی زندگی ایسی گزاری جیسے شہزادے گزارتے ہیں۔ ہر طرف حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام لیوا بڑے بڑے اکابر، حضرت شیخ الہند وغیرہ حضرات بس اس طرح ناز برداری کرتے تھے جیسے کوئی بادشاہ زادہ ہو، اب بھی جو یہ حضرات کچھ لحاظ پاس کرتے ہیں، غلط فہمی میں نہیں کہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے۔ اصل میں نسبت ہے ان بزرگوں کی جس کی وجہ سے یہ سارا اکرام ہے۔

مسلمانوں کے تنزل کے اسباب...... یہاں تک حضرت کہہ گئے تھے کہ رفیق مجلس قاری سعید الرحمٰن صاحب (راولپنڈی) نے ایک تلخ موضوع چھیڑ دیا۔ "مسلمانوں کے تنزل کے اسباب" ایک ایسا موضوع جس پر بحث وفکر تو مدتوں سے ہو رہی ہے مگر مرض کا علاج صرف نایاب اور بیش قیمت نسخوں کے معلوم کرنے سے کب ہو سکا ہے جب تک مرض کے ازالہ کے لئے عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ آج مسلمانوں کے تنزل کے اسباب ومحرکات پر بلا مبالغہ ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی اہم دینی یا سماجی تقریب ان اسباب پر زوردار بیان صرف کرنے سے خالی نہیں جاتی، منبر ومحراب کو لیجئے یا میدان صحافت وانشاء وہ کون سا انداز ہے جو مسلمانوں کے جگانے اور مرض کی تلافی کرنے کے لئے اختیار نہیں ہو رہا۔ مگر جمود اور تعطل کی تہیں جمتی ہی جا رہی ہیں اور جب سقوط بیت المقدس کے واقعہ ہائلہ اور قیامت صغریٰ نے بھی ہماری خواب غفلت کو نہ جھنجھوڑا تو شاید صور اسرافیل ہی ہم غفلت شعاروں کو بیدار کر سکے۔ مگر۔ ہائے وہ بیداری جو سوائے افسوس اور کف ندامت ملنے کے کسی کام کی ثابت نہ ہو سکے۔ یہی تصور حضرت قاری صاحب مرحوم کے سامنے آ چکا ہوگا کہ جب انہوں نے سوال سنا تو ایک دلگداز سانس بھر کر خود ہی سوال دہرایا۔

"مسلمانوں کے تنزل کے اسباب؟" اور پھر اہل سیاست پر ایک بھرپور نشتر چبھوتے ہوئے فرمایا اس میں تو سیاسی لوگوں کی رائے معتبر ہے، ایک ملا کی رائے کیا معتبر ہوگی۔ وہ سیاست جو مسلمانوں کے عروج وزوال کے خدائی قوانین سے بے خبر ہو کر بھی صرف مادیت کے گھمنڈ میں تاریخ کے ہر واقعہ پر رائے زنی اپنا حق سمجھتی ہے۔ حضرت قدری صاحب کے اس مختصر سے جملہ میں واقعی اس سیاست پر یہ ایک بھرپور وار تھا۔ تنزل کے اسباب کا ذکر شروع کرتے ہوئے قاری صاحب نے اصول اور کلیات پر گفتگو کے بجائے اپنے معاشرہ کی چند جزئیات سے اس پر روشنی ڈالنا چاہی۔ ایک صاحب بصیرت شخصیت اور صاحب نظر کا ہی کام ہے کہ علمی اور نظری چیزوں کی بجائے وہ جزئیات اور عملی مثالیں سامنے رکھ دے جن سے نظریات اور کلیات تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔ مگر انسانی فہم ہمیشہ عملی مثال اور نمونوں ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔

تنزل کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے حضرت نے نہ تو فلسفیانہ موشگافیوں کی آڑ میں پناہ لینی چاہی، اور

نہ پیچیدہ عقلی اور نظری طول طویل محرکات کی فہرست مرتب فرمائی۔ بلکہ موجودہ معاشرہ کی ایک ایسی دھندلی سی تصویر نگاہوں میں رکھ دی، جس کے ساتھ ہم سب اپنا موازنہ کرسکیں اور پھر خود ہی سوچیں کہ اس سارے تنزل اور بربادی کے ذمہ دار اگر ہم خود نہیں تو اور کون ہے؟

افسوس ان لوگوں کی بے بصیرتی پر جن کی نظر اسباب تنزل سے بحث کرتے ہوئے موجودہ مسلم معاشرہ کی بے اعتدالیوں پر تو نہیں جاتی، مگر رہ رہ کر ان کی ساری غور وفکر یورپی تہذیب اور مغرب کے سسکتے ہوئے فلسفہ حیات کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے تنزل کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ ابھی دو تین برس کا واقعہ ہے، میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے سانوال۔ دارالعلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے۔ یہ جنگ ستمبر شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا! ملک کے حالات بہت نازک اور خراب ہیں۔ میں نے کہا: جی ہاں! اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔ کہا کوئی سبب بھی ہے اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا: ہاں! سبب ہے۔ کہا: کیا سبب ہے؟ میں نے کہا: بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطہ نگاہ سے سوچتا ہوں۔ آپ ہیں سیاسی اور برسر اقتدار انسان۔ آپ ہر چیز کو سیاسی نقطہ نظر سے سوچتے ہیں۔ میرا نقطہ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہئے گا اور میرا منشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں۔

مذہبی نقطۂ نظر سے اسباب تنزل...... تو میں نے کہا سن لیجئے۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے۔ اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کرسکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں۔ اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کرسکتی ہے۔ دنیا کی اقوام کردار اور اخلاق سے ترقی کرتی ہیں تو اس وقت ہمارے ملک کی اخلاقی گراوٹ انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اس لئے حالات نازک نہ ہوں گے تو کیا ہوگا؟ کہنے لگے بالکل صحیح بات ہے۔ لیکن یہ تو ایک اصول بیان کیا آپ نے، اس کی مثال بھی ہے؟ میں نے کہا مثال کے طور پر پہلی بات یہ ہے کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے جب ایک ہندو عورت باہر پھرتی تھی تو گز بھر کا گھونگھٹ اس کے منہ پر ہوتا اور حیاء کی وجہ سے پکی ہوئی چلتی اس وقت عورت نہ صرف گھونگھٹ سے باہر ہے بلکہ لباس سے بھی۔ اور اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر آپے سے باہر ہوگئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ ایسی عورتوں کی کوکھ سے جو اولاد پیدا ہوگی کیا اس میں شرم وحیاء اور غیرت ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ریلوں میں ہمیں سفر کرنے کی نوبت آتی ہے تو اسکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے کسی ڈبہ میں اگر آجاتے ہیں تو ہمیں یہ فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ آدمی ہیں جانور۔ اس قدر بے ہودہ اور رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ کوئی بھلا آدمی نہ کر سکے۔ اگر ان لوگوں کے کندھے پر ملک کا بار آ گیا تو سوائے بد اخلاقی کے یہ اور کیا پھیلائیں گے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ریلوں میں سفر کرتے دیکھا کہ جہاں کہیں شوگر ملز آیا، گاڑیاں گنوں سے بھری کھڑی ہیں۔ سو پچاس اترے کسی نے سو گنے، کسی نے دوسو گنے کسی نے پچاس، کسی نے گٹھڑی باندھ لی، اور قطعاً انہیں یہ احساس نہیں کہ یہ ہماری چیز ہے یا غیر کی۔ تو اگر ملک کا بار ان کندھوں پر آیا تو سوائے لوٹ کھسوٹ کے یہ کیا کریں گے؟

چوتھی بات یہ ہے کہ تاجروں کا طبقہ ہے اور تجارت پر ملک کا دارومدار ہے۔ اس طبقہ میں بلیک الگ ہے، نفع خوری الگ ہے۔ ذخیرہ اندوزی الگ ہے۔ تو جب تاجروں میں خیانت آ جائے تو ملک کی برقراری کیسے ہو سکتی ہے؟

پانچویں بات یہ ہے کہ جب حکام کو دیکھا جائے تو رشوت ستانی، جانب داری، اقرباء پروری، یہ ایک عام چیز بن گئی ہے اور رشوت تو ایسا ہے جیسا حق ہو گیا۔ تو جب حکام میں خیانت آ جائے تو بھلا وہ ملک کیسے برقرار رہے گا؟ میں نے کہا یہ حالات ہیں۔ کہنے لگا بالکل بجا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی اخلاقی حالت درست کرے۔ آپ دولت اور بیرونی کرنسی جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں لیکن اس کی فکر کسی کو نہیں۔ کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے کہ اخلاقی حالت درست ہو سکے۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا حکومت یہ نہیں چاہے گی کیونکہ اخلاق درست ہوتے ہیں مذہبی تعلیم سے اور حکومت سیکولر یعنی لامذہب ہے۔ وہ آ نہیں سکتی بیچ میں۔

نقطۂ نظر کا اختلاف...... تو میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں یہاں سے فرق ہو گیا۔ آپ کے نزدیک سیکولر کا معنی لامذہبیت ہے اور میرے نزدیک سیکولر کا معنی ہمہ مذہبی حکومت ہے کہ ہر مذہب حکمران ہو۔ اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر طبقے کو مجبور کرے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم پائے۔ تاکہ اس کا اخلاق صحیح ہو۔ کہنے لگے یہ ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا کہ آپ خود چاہتے ہیں کہ اس ملک میں چور اور ڈاکو پیدا ہوں۔ کہنے لگا آپ جو چاہیں مطلب نکال دیں، باقی یہ ہوگا نہیں، میں نے کہا ایک تدبیر میں بتلا دوں، کہا کیا؟ میں نے کہا ملک ہمارے سپرد کر دیجئے، سب حالات درست کر دیں گے۔ اس پر وہ بہت ہنسا۔ تو بہر حال ملک اور قوم کی ترقی ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار سے، جب یہ ختم ہو جائے تو سب سے بڑا تنزل کا سبب یہی ہے۔

راقم السطور نے کہا حضرت! ہمارے تنزل میں مغربیت کا بھی حصہ ہے؟ فرمایا اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ مغربی اخلاق اختیار کئے جائیں۔ اسلامی اخلاق چھوڑ دیں، تعلیم مغربی غالب ہو اور دینی تعلیم مغلوب، دینی افراد مغلوب ہوں اور بے دین افراد غالب ہوں۔ بنیاد سب کی ایک ہی ہے کہ مذہب سے رشتہ توڑ دو۔

برسرِ اقتدار طبقہ کی اصلاح کا طریق...... اب اس کے بعد اصلاح کی کیا صورت ہو؟ تو حضرت نے اپنے تجربہ اور بصیرت کی بناء پر فرمایا کہ آپ حضرات بحمداللہ مذہب کی خدمت کر رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اس لپیٹ میں آ گئے ان کا دین درست ہو رہا ہے۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ بالکل دوسرے رنگ میں ہے مگر اس میں بھی میری ایک رائے ہے کہ کسی سے تقابل کی ٹھان کر کسی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ آپ چاہیں تو ایجی ٹیشن کریں یا مقابل بن کر اصلاح کرنا چاہیں، یہ ہو نہیں سکتا۔ اس کی صورت تو یہ ہے کہ مستغنیانہ طریق سے ان

لوگوں کے دلوں میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اپنا غرض مطلب کچھ نہ رکھا جائے، نہ عہدہ نہ دولت، بلکہ انہیں آپ یقین دلادیں کہ اقتدار تمہارا رہے گا اور ہم بھی اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم اقتدار نہیں چاہتے۔ مگر اتنی بات کرو اور ایسا کرنا ملک اور قوم دونوں کے لئے نافع، ورنہ اس سے ملک قوم اور تمہارے اقتدار سب کو خطرہ ہے۔ اس انداز سے کام کرنا چاہئے۔ سیاسی رنگ کے لوگ سیاسی انداز سے اور دینی رنگ کے لوگ دینی انداز سے جب تک خواص کو متوجہ نہیں کریں گے۔ کام نہیں چلے گا۔ اب عوام کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور ایجی ٹیشن کی صورت اختیار ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ اشتعال میں آجائے حکومت، تو وہ پھر چڑ آتی ہے، تو نہ صرف یہ کہ وہ آپ کی نہیں مانے گی بلکہ گرانے کی کوشش کرے گی۔ تو اصلاحی رنگ میں چند افراد اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دیں اور جو اوپر کا طبقہ ہے ان میں رسوخ حاصل کر کے اس کے کانوں میں باتیں ڈال دی جائیں اور اس انداز سے کہ فلاں بات تیرے مفاد کے خلاف ہے۔

حکومت سے کام لینے کا طریق!..... حضرت! پاکستان کے علماء کے لئے کوئی مخصوص پیغام؟

"پیغام کا مجھے حق بھی نہیں۔ غیر ملک کا آدمی پیغام کیا دے؟ مگر یہ میں نے صبح کی مجلس میں بھی تفصیل سے کہا تھا کہ جو مطلق قسم کے لوگ چند علماء ہیں اور بااثر بھی ہیں وہ ایک یادداشت کے طور پر کچھ بنیادی چیزیں حکومت کو پیش کریں اور اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہم آپ کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں۔ ہمارا پورا تعاون رہے گا۔ تقویت اور نصرت کریں گے۔ مگر اتنی چیز ہے کہ دین کے لئے اور ملک کی بقاء کے لئے فلاں فلاں کام کرو۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو ملک و قوم میں خرابی ہوگی اور آپ کی بنیاد بھی اس سے قائم ہے"۔

اس یادداشت اور ملاقاتوں میں جزئیات کو پہلے نہ چھیڑا جائے۔ بلکہ اصولی اور کلی رنگ میں یہ لوگ کچھ مانوس ہو جائیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ جزئیات سود وغیرہ جیسے مسائل کان میں ڈال دیے جائیں۔ مگر پہلے ارباب اقتدار کے ذہن کو اصول میں لے آیا جائے۔ میں تو واقعی اگر یہاں کا باشندہ ہوتا اور بازیابی کا موقع مل جاتا تو صدر ایوب سے کہتا مجھے آپ اپنا خادم اور خیر خواہ سمجھیں مگر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ تعلیم قرآن اور دینی علوم کو عام قرار دیں اور یہ کام مستند علماء سے کرائیے۔ ہر اس عالم کو عالم نہ سمجھیں جو علم کا لبادہ پہن کر آئے اور علم اس کا محض مطالعہ یا اخبار بینی کا ہو، نہ اس کے پاس سند ہو نہ استناد ہو، نہ بزرگوں کے پاس رہ کر اس نے علم حاصل کیا ہو، ایسے علماء کو اختیار کر کے ان سے ہر کام میں مشورہ نہ کریں۔ ہر مدعی علم کو عالم نہ سمجھیں بلکہ اس کی تلاش کر کے کام کریں۔

کوئی طبیب بھی اگر ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ مریض ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جا کر ہاتھ دے دے گا۔ اور نبض دکھلا دے گا بلکہ وہ پہلے ڈھونڈتا ہے کہ طبیب طبیہ کالج کا فارغ ہے یا کہاں کا؟ اس کا بورڈ یا سند دیکھتے ہیں۔ اس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں کہ شفایاب ہو کر جاتے ہیں یا نہیں۔ تو جان بچانے کے لئے آپ انتخاب کریں تو ایمان بچانے کے لئے کیا ضروری نہیں کہ صالحین روحانی اطباء یعنی علماء کا انتخاب کیا جائے؟

اور دوسری بات ان سے یہ عرض کرتا کہ آپ معروفات کو یکدم جاری نہیں کرتے تو نہ سہی مگر کم از کم منکرات کا راستہ تو بند کر دیں۔ اس سے اخلاق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو مقدم چیز ہے دفع مضرت اور جلب منفعت موخر ہے۔ اور دفع مضرت میں یہ ہے کہ کم از کم پہلے وہ منکرات تو ختم کر دیں جو عقلی منکرات ہیں اور دنیا کی ہر قوم اسے برا سمجھتی ہے۔ اس کے بعد منکرات شرعیہ کو لیں۔ جب اس سے فارغ ہوں تو معروفات شرعیہ کو لیں، مگر کم از کم منکرات تو ختم کر دیں اور یہ بھی تدریجاً سہی رفتہ رفتہ اس لئے کہ آپ کی مجبوریاں ہیں۔ آپ کے روابط اور مراسم سیاسی ان اقوام سے ہیں کہ ان کے ہاں یہ منکرات جز بتمدن ہیں تو اگر یکدم آپ کامیاب نہ ہوں تو راستہ تو منکرات مٹانے کا ڈال دیں۔ دوسری چیز یہ عرض کرتا کہ خلفاء راشدین یا سلاطین عادل جو گئے چنے ہیں، ان کے علاوہ عامتہ وہی سلاطین ہیں جنہیں اپنی اقتدار کی فکر ہے لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے جس بادشاہ کے ساتھ کوئی عالم ربانی لگ گیا۔ اس کی حکومت نہایت اعلیٰ گزری حالانکہ وہ عالم عہدہ دار نہیں تھا۔ ہارون الرشید کے ساتھ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ لگے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر علماء سے مشورہ لیتا رہا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم کسی مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ تو جب آپ اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں اور ملک اسلام کا ہے تو اسلام کے حاملین سے کب صرف نظر کیا جا سکتا ہے، تو جو قدم اٹھائیں تو کم از کم دو چار علماء کی بات تو سن لیا کریں، آپ انہیں نہ جاگیر دیں، نہ عہدہ نہ وہ طلب کریں گے۔

حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور کرنے کے لئے تجویز.....حضرت حکیم الاسلام اصلاح احوال کی تجویز پر اپنی بصیرت اور فراست ایمانی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر عصر حاضر کی اسلامی قیادت مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر اسلام کو فرسودہ اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا عقیدہ دل و دماغ میں راسخ کر چکی ہو۔ دین کی ترجمانی کے لئے کسی صلاحیت اور استحقاق کو اجارہ داری سمجھا جا رہا ہو اور جب رعایا کی اکثریت بھی اعجاب رائی (اپنی رائے پر گھمنڈ اور غرور) میں مبتلا ہو چکی ہو۔ پھر جب خوشامدی، خود غرض اور لالچی قسم کے علماء نے حکام کے ساتھ روابط کو رعیت کی نگاہ میں دین فروشی کے ہم معنی سمجھ لیا ہو۔ اور خالص مصلحانہ کوششوں پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ گیا ہو تو حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور ہونے کے لئے اور دینی اقتدار کی خاطر اس خلا کو پاٹنے میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خیر خواہانہ تجویز کس حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے؟ اس راہ کی مشکلات کو ایک خاص رخ سے پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا "حضرت! جب حکام سمجھ بیٹھے ہوں کہ اسلام عصر حاضر کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تو انہیں حاملین اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جانا کب ممکن ہے۔؟ حضرت نے فرمایا! ان کی یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہئے کہ اسلام موجودہ دور کی ترقیات میں حارج ہے۔ بلکہ ان کے دل میں ڈال دینا چاہئے کہ زمانہ کی کوئی چیز بھی جو کسی درجہ میں واقعی صحیح اور کارآمد ہو۔

اسلام اس کا مخالف نہیں مگر وہ منکرات جو دنیا کے ہر قوم میں منکرات عقلی ہیں۔ زنا کاری، جواء، سود، شراب نوشی قسم کی چیزیں جس کی قباحت مسلمات عقلیہ میں سے ہے۔ ان چیزوں کو ترقی کا معیار بنا کر اسے اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکتا۔ البتہ جو چیزیں منکر نہیں ہیں اور اخلاق و معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اسلام بھی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ سیاسی اور ملکی تدابیر میں ہمیشہ توسیع سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو اجتہادی امور ہیں اس کی اسلام میں گنجائش ہے اور ان کی اچھائی برائی کی جانچنے کے لئے ایسے لوگوں کو مشیر بنائیں جنہیں فقہ اور شریعت پر عبور ہو"۔ پھر قاری صاحب نے فرمایا۔ مقصد اصلاح حال ہے اور یہ کہ حالات سدھر جائیں۔ اخلاص اور جذبہ خیر خواہی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جائے، ایک دوسرے کو دور کرنے کی بجائے نزدیک کر دے۔

تعمیری انداز میں اصلاح...... رات ڈھل رہی تھی۔ وقت تیزی کے ساتھ دل و دماغ پر اپنے حسین نقوش ثبت کرتے ہوئے گزر رہا تھا۔ ایسے نقوش جو مجلس میں چلنے والے ٹیپ ریکارڈر کے فیتہ پر ثبت ہونے والی ارتعاشی اور صوتی حرکات سے کہیں زیادہ پائیدار اور دیرپا تھے۔ وقت بجائے خود ایک ایسی مشین ہے، جو ایک ایسے نامہ اعمال کے اوراق میں سب کچھ محفوظ کر رہی ہے۔ جس کی پنہائیوں اور گہرائیوں پر "الساعۃ" اور زلزلۃ الساعۃ کی ہلاکت انگیزیاں بھی اثر انداز نہ ہوسکیں گی اور جب کرتا دھرتا سب کچھ مجسم بن کر سامنے آجائے گا تو پکارنے والا پکار اٹھے گا۔ ﴿مَالِهٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ ① ...... ایسی صحبتیں کب بار بار نصیب ہوتی ہیں۔ حضرت کو مزید تکلیف دینا دل و دماغ پر کتنا ہی گراں گزر رہا تھا، مگر بے اختیار جی چاہا کہ اس مجلس سعید میں کچھ ذکر الحق اور دارالعلوم حقانیہ کا بھی آجائے اور پوچھ بیٹھا کہ "الحق" کے لئے کون سا طریقہ کار پسندیدہ ہے؟ فرمایا وہی پالیسی میں نے جو عرض کر دی۔ توافق سے کام چلے گا، تقابل سے نہیں۔ تعمیری انداز میں اصلاح کی سعی تقابل کے انداز سے آپ کی باتیں کسی مخالف پر اثر انداز نہیں ہوسکیں گی۔

حضرت! جب الحاد اور بے دینی غالب ہو چکی ہے، پھر کیسی موافقت۔؟ برجستہ فرمایا۔ اسی کی اصلاح کے لئے تو توافق کی ضرورت ہے۔ اور یہ توافق الحاد اور بے دینی سے نہیں ہوگا۔ ان افراد سے توافق ہوگا تاکہ ان لوگوں کو الحاد سے ہٹا دیا جائے۔

حضرت! کچھ لوگوں پر تو مایوسی کی فضا چھا گئی ہے۔ اصلاح کی مساعی بار آور معلوم نہیں ہورہیں؟ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

کام کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ مایوس نہ ہوا جائے آپ تو ورثہ انبیاء ہیں۔ انبیاء کبھی مایوس نہ ہوئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے اس قوم کو عذاب دینا ہے۔ تب حضرت نوح نے بددعا دی کہ کسی کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑ ورنہ ساڑھے نو سو برس تک نصیحت فرماتے رہے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

① پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۴۹۔

دیگر بلاد اسلامیہ تو دہریت، مغربیت اور بے دینی کی لپیٹ میں آ ہی گئے اور ہو گئے تو ایسے حالات میں اہل دین کب تک شکستہ خاطر نہ ہوں گے؟

حضرت نے جواب دیا کہ ایسی چیزوں کو تو ملک کے سامنے بطورِ نظیر پیش کیا جانا چاہئے کہ آج بلاد اسلامیہ باوجود قوت کے تباہ ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی اخوت اور مسلمانوں کے عام اتحاد کو خیر باد کہہ دیا وطنیت کو آگے رکھا۔ اسلامیت کو پیچھے رکھا تو اتنی نظیروں کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے تو تباہی سے کیسے بچ سکو گے؟

ورثۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم...... حضرت! قوم اور ملک کی اصلاح تو اربابِ عزیمت اور اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ہم جیسے عامیوں کے لئے بھی کچھ ارشاد ہو۔ فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ورثہ چھوڑا ہے کتاب اللہ اور سنت رسول کا۔ فرمایا تم جب تک انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے۔ ”تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِيْ أَبَدًا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا“ ①

دارالعلوم کی ترقی...... حضرت! اس مدرسہ دارالعلوم حقانیہ کے بارے میں کوئی نصیحت؟

فرمایا! آپ لوگ جو اختیار کئے ہوئے ہیں، بحمد للہ مدرسہ چل رہا ہے۔ غالب ہو رہا ہے۔ مولانا موجود ہیں۔ ہر وقت ”قَالَ اللّٰهُ“ اور ”قَالَ الرَّسُوْلُ“ ہے۔ اس سے زیادہ کیا روحانیت اور معنویت ہو گی۔ خدا نے مدرسہ کو ایسے بزرگ اور اساتذہ دیئے ہیں جو الحمد للہ دین مجسم ہیں۔

حضرت! مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی رفتار ترقی کیا ہے اور بجٹ؟...... فرمایا! انقلاب کے وقت سوا لاکھ تھا اور اب ساڑھے دس لاکھ ہے، انقلاب کے بعد کچھ فکر بھی تھا کہ کیسے چلے گا، مگر اللہ نے بڑھایا اور تمام شعبے بڑھتے ہی گئے، پہلے آٹھ شعبے تھے اب چوبیس شعبے ہیں۔ اسی طرح پہلے اساتذہ اڑتیس تھے، اب ستر کے قریب ہیں۔ اسی طرح عمارات دگنی تگنی ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے طلبہ ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔ آخری سوال تھا کہ حضرت! نئی پود سے مستقبل میں دارالعلوم دیوبند کے لئے کیسی توقعات ہیں؟ فرمایا اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس دور کی سب سے بڑی مشکل قحط الرجال کی ہے۔ مگر ہمیں توقع ہے کہ اسلاف کے نقش قدم پر چلنے والے نئی پود میں بھی ہیں، چاہے گنے چنے ہی ہوں مگر اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔

دوران گفتگو ایک دفعہ حضرت نے موجودہ زمانہ کی سیاست پر بھی اپنی رائے ظاہر کی اور کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس زمانے کی سیاست اور دین میں بیر ہے۔ اس سیاست اور ڈپلومیسی کا بنیادی پتھر ہے۔ نفاق گندم نما جو فروشی۔ اس میں دین باقی نہیں رہ سکتا وہ تو صرف اسلامی سیاست ہے جو دین کے ساتھ چلتی ہے اور وہ تو جزو ہے اسلام کا۔ اور ایک ہے عصری سیاست، یہ بالکل تقابل پر ہیں دین کے جو چیز دین میں حرام ہیں۔ اس کے ہاں

---

① الحديث اخرجه الامام مالك في "الموطأ" ولفظه: تركت فيكم امرين لن تضلوا ماتمسكتم بهما كتاب الله وسنة نبيه، كتاب القدر، باب النهي عن القول بالقدر ج: ٢ ص: ٨٩٩.

واجب ہیں۔ جو یہاں محمود ہیں وہ وہاں مذموم۔ اور صرف یہ میرا مقولہ نہیں بلکہ مولانا اصغر حسین مرحوم نے بھی یہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ ”مولوی صاحب! آج کی سیاست اور دیانت میں بیر ہے“۔

اب رات کا ایک بج چکا تھا اور بادل ناخواستہ اس پرلطف محفل کی بساط لپیٹنی ہی پڑی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ